ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی ساغرِ ادب مظفرپور

پیئر ریویوڈ اُردو جرنل

(اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)

مدیر (اعزازی)
پروفیسر سید آلِ ظفر

ساغرِ ادب Vol. : 03, Issue : 9 April to June 2021 مدیر (اعزازی) : پروفیسر (ڈاکٹر) سید آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 03, Issue : 9
April to June 2021

Quarterly
SAGHAR E ADAB
Muzaffarpur

Peer - Reviewed Urdu Journal

Editor (Honorary)
Prof. (Dr.) Syed Alay Zafar
UNIVERSITY DEPTT. OF URDU
B. R. A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001 (BIHAR)
MOB. +91 94300 84261, +91 90062 53903

NO BRANCH Ph.: 2303206
سونے اور چاندی کے گارنٹی شدہ زیورات
خزانہ جوئیلرس
مرادپور، پٹنہ ۴
Khazana
JEWELLERS
MURADPUR, PATNA - 4
پروپرائٹر: محمد صابر و محمد یٰسین

ARIF MAHBOOB
(Member)

With best Compliments from
Namaz-e-Eidain
Committee
Gandhi Maidan, Patna

MAHMOOD ALAM
(President)

ISSN : 2582 - 3612

سِہ ماہی

ساغرِ اَدبْ

مظفرپور

(پیئر ریویوڈ اُردوجرنل)

اپریل تا جون ۲۰۲۱ء

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

پروفیسر

پوسٹ گریجوئیٹ شعبۂ اُردو

بی۔آر۔اے۔بہار یونیورسیٹی، مظفرپور

بہار(انڈیا)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

Quarterly SAGHAR E ADAB Muzaffarpur

(Peer - Reviewed Urdu Journal)

جلد : ۳ شمارہ : ۹ اپریل تا جون ۲۰۲۱ء

مُدیر(اعزازی) : پروفیسر سیّد آلِ ظفر مُدیرہ : کہکشاں یاسمین

زرِتعاون

فی شمارہ : 250روپے، سالانہ 1,000روپے (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) ، تاحیات 10,000روپے، دیگر ممالک 60ڈالر

صفحات : ۲۰۸

تعداداشاعت : ۷۰۰

سرِورق : سیّد آلِ محتشم ، سیّد آلِ حاشر و فائزہ ظفر

کمپوزنگ : امام الدین امام، مظفرپور۔ 62061 43783

Bank Details

SAGHAR E ADAB, Saving A/c No. 3751050251

IFSC : CBIN 0284935

Central Bank of India, L.S. College Branch, Muzaffarpur (Bihar) India

اس شمارے کے قلم کاروں کی آراء سے ''ساغرِادبْ'' کے مُدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

کسی بھی قابل اعتراض تحریر یا دیگر متنازعہ معاملات کی قانونی چارہ جوئی صرف مظفرپور عدالت ہی میں ہوگی۔

خط وکتابت و ملنے کا پتہ

The Editor

SAGHAR E ADAB

Husaina House, Zakaria Colony, Mohalla - Sadpura

P.O. - Ramna, Muzaffarpur - 842 002 (Bihar) India

Mob. +91 94300 84261, +91 90062 53903

LIST OF EDITORIAL BOARD

1. **Prof. Abuzar Usmani**
Rtd. Head
University Deptt. of Urdu
Vinoba Bhave University, Hazaribagh

2. **Prof. Najmul Hoda**
Rtd. Head
University Deptt. of Urdu
B.R.A.Bihar University, Muzaffarpur

3. **Prof. Alimullah Hali**
Rtd. Head
Magadh University
Bodgh Gaya

4. **Prof. Farooq Ahmad Siddiqui**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
B.R.A.Bihar University, Muzaffarpur

5. **Prof. Rais Anwer**
Rtd. Head
University Deptt. of Urdu
L.N. Mithila University
Darbhanga

6. **Prof. Hameed Suharwardy**
Former Chairman
Deptt. of Urdu & Persian
Gulbarga University
Gulbarga (Karnataka)

7. **Prof. K. Habeeb Ahmed**
Head
Deptt. of Arabic, Persian & Urdu
University of Madras
Marina Campus, Chennai

8. **Prof. Quamrul Hooda Faridi**
Deptt. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh (U.P)

9. **Dr. Amir Mustafa Siddiqui**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Vinoba Bhave University, Hazaribagh

10. **Dr. Manzer Hussain**
Ex. Head
University Deptt. of Urdu
Ranchi University Ranchi

ویب سائٹ

www.saghareadab.in

ای میل

saghareadab@gmail.com

syedalayzafar@gmail.com

اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدّت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زرِ سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے ہیں۔

(ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹر **کہکشاں یاسمین** نے انڈین آرٹس آفسیٹ، بیسمنٹ آف اسٹیٹ بینک آف انڈیا، مہندرو، پٹنہ میں چھپوا کر دفتر ''ساغرِ اَدب''، حُسینا ہاؤس، زکریا کالونی، محلّہ۔ سعد پورہ پوسٹ۔ رَمنہ، مظفرپور۔ 842 002 (بہار)، انڈیا سے شائع کیا۔

مُدیر (اعزازی) : پروفیسر سیّد آلِ ظفر

ISSN : 2582 - 3612

ترتیب

نمبرشمار	رشحات قلم	ارباب قلم	صفحہ نمبر
۱	اداریہ	پروفیسر سیّد آلِ ظفر	۶
۲	حمد باری تعالیٰ	تنویر پھول (امریکہ)	۱۱
۳	نعت پاک	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۲
۴	مشتاق احمد وانی: زندگی کی صداقتوں کا ادیب	پروفیسر قدوس جاوید	۱۳
۵	نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے اردو زباں والو	پروفیسر عبدالواسع	۲۴
۶	ذوقی کے اہم ناول ''آتش رفتہ'' کا سراغ۔۔۔	پروفیسر محمد کاظم	۲۹
۷	ن۔م۔راشد کے تعلق سے چند باتیں	ڈاکٹر جمال اُویسی	۴۰
۸	پروفیسر مولا بخش: شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر سرور ساجد	۴۶
۹	ناول ''زندہ محاورے'' کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد صادق حسین	۵۲
۱۰	حقانی القاسمی نے حق دوستی ادا کیا	ڈاکٹر سیفی سرونجی	۵۶
۱۱	سیّد احمد قادری کے افسانے: حیات و کائنات کا نوحہ	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۶۱
۱۲	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں: مرنے والا تجھے روئے گا زمانہ برسوں	انوار الحسن وسطوی	۶۹
۱۳	بلند پایہ علمی و ادبی شخصیت۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	حلیم صابر	۷۷
۱۴	اردو صحافت: ایک جائزہ	ڈاکٹر گل افشاں شمیم	۸۱
۱۵	سجاد ظہیر اور اردو افسانہ نگاری	ڈاکٹر محمد تنویر اختر نور	۸۵
۱۶	عابد سہیل کے ادبی جہات	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	۸۹
۱۷	میرے نالوں کی گمشدہ آواز: ایک توضیحی مطالعہ	ڈاکٹر مستفیض احد عارفی	۹۷
۱۸	رضا نقوی واہی کی مزاح نگاری	ڈاکٹر وصی احمد شمشاد	۱۰۳
۱۹	احمد سجاد کی تنقید نگاری	محمد ضیاء الحق	۱۰۷
۲۰	انتظار حسین کے افسانے اور اساطیری جمالیات	ڈاکٹر محمد فہیم ربانی	۱۱۱
۲۱	احساس و آہنگ کا شاعر: اشرف یعقوبی	انور بارہ بنکوی	۱۱۵
۲۲	فرقہ وارانہ فسادات کا ترجمان ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے''	ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن	۱۲۳

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

۲۳	داستان مہر افروز دلبر اور دہلوی معاشرت	ڈاکٹر ایس۔ایم۔حبّان الحق	۱۲۷
۲۴	کلیم عاجزؔ کی شاعری۔ایک جائزہ	ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ	۱۳۱
۲۵	شموئل احمد کا ناول ''ندی'' فن کے آئینے میں	ڈاکٹر نسرین بانو	۱۳۴
۲۶	تنقید، اس کی ماہیئت، اہمیت اور افادیت	ڈاکٹر اعجاز کاظمی	۱۳۹
۲۷	اردو فکشن میں ہندوستانیت	ڈاکٹر امتیاز عالم	۱۴۴
۲۸	شین مظفر پوری کی ناول نگاری	ڈاکٹر تبسم جہاں	۱۴۸
	〈گوشۂ ریسرچ اسکالرس〉		
۲۹	افسانے کی صنفی خصوصیات: ایک جائزہ	محمد شمیم عالم	۱۵۴
۳۰	''ملاقاتیں'': ایک جائزہ	عرفان اللہ خان	۱۶۰
۳۱	جموں و کشمیر میں اردو شاعری۔ایک مطالعہ	زمرودہ محمد میر	۱۶۹
۳۲	اکیسویں صدی کے معتبر ناول نگار	نکہت پروین	۱۷۸
۳۳	پروفیسر علیم اللہ حالی کی صحافتی خدمات: ایک جائزہ	رابعہ خاتون	۱۸۳
۳۴	غزل کا باوقار شاعر: طارق جمیلی	گل شمع آرا	۱۹۰
۳۵	ولیؔ دکنی کی شاعرانہ عظمت	امام الدین امامؔ	۱۹۴
۳۶	''ساغرِ ادب'' کا آٹھواں شمارہ (آپ کی نظر میں)	....	۲۰۲

اِداریہ

الحمدللہ ''ساغرِ ادب'' کا نواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔آپ کے محبوب اور دل پسند سہ ماہی رسالے کی اشاعت کے اس تین ماہ کے وقفے میں اردو شعروادب کے مشاہیر کے علاوہ علمی اور دینی حیثیت کے بھی بہت سارے چاند ستارے، کوکبِ رخشاں، نیّرِ درخشاں غروب ہو گئے ع

کس کس کا ماتم کیجئے ، کس کس کو روئیے

یہ سارے حضرات چندے آفتاب چندے ماہتاب تھے۔انہوں نے شعروادب کے علاوہ دین وسیاست میں اپنے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ ہر ایک کی انفرادیت الگ، ہر ایک کا اسلوب جدا، پھر بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے تسوید ونشر واشاعت کی دنیا میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ لازوال نہیں ہیں۔ان میں ہر ایک کی اہمیت اور قدوقامت متعین کرنے میں علمی مباحث کے دروازے کھل سکتے ہیں۔اس عرصے میں اور بھی لوگ، لکھنے پڑھنے والے لوگ اور اپنی جگہ کچھ نہ کچھ شہرت رکھنے والے لوگ اس دارفانی سے کوچ کر گئے ہوں گے۔سرِ دست ہماری دسترس میں دس حضرات کے نام ہیں جن میں چار اہلِ قلم پر مفصل مضامین بھی آپ اس شمارے میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

سب سے پہلے: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے انتقال پر ہمارا ادارہ جس نقصان سے دوچار ہوا ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہماری مجلس ادارت کے معزز رکن ابتداء سے تھے۔ان کا انتقال ۱۷/اپریل ۲۰۲۱ء کو بھاگلپور کے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں ہوا۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنی عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصّہ بھاگلپور میں گزارا اور وہیں کی مٹی میں ان کی تدفین ہوئی۔وہ کثیر التصانیف تھے۔مارواڑی کالج سے تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسیٹی کے شعبۂ اُردو کی وابستگی تک ان کی تدریسی زندگی اگرچہ ایک محدود علاقے کی حد تک معروف رہی لیکن ان کی تصنیفات اور تخلیقات کا دائرہ آفاقی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔رسالہ ''کوہسار'' کے بانی مدیر کی حیثیت سے انہوں نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔اردو شاعری کی تقریباً ہر صنف میں ان کے نقوش قلم ملتے ہیں۔جدید اصناف ادب سے بھی وہ نہ صرف آشنا تھے، بلکہ ان کی ترویج ومقبولیت میں عملی حصہ بھی لیا۔ہائیکو، نثری نظم، آزاد شاعری، اردو میں سہ سطری نظمیں، ملکی وغیر ملکی اصناف سخن دوہا، ماہیہ، تنکا، رنگا اور نثر میں افسانچے، لطیفے، غرض یہ کہ شعر و نثر کی مختلف اصناف میں وہ اپنے جوہر دکھانے پر قادر تھے گویا ہر فن مولا تھے۔

معروف ادیب اور نثری ادب میں اپنی تحریر کا جادو جگانے والا ایک ایسا شخص ہم سے بچھڑ گیا جس کی تحریریں ابھی جوان تھیں۔مشرف عالم ذوقی عمر کے اعتبار سے بھی ادیبوں میں کم عمر تھے۔ان کی

وفات ۱۹/اپریل ۲۰۲۱ءکو دلّی میں ہوئی۔ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی بےخوف اور بےباک تحریریں ہیں۔ وہ صحافت اور الیکٹرانک میڈیا سے بھی جڑے ہوئے تھے۔انہوں نے صرف اردو میں نہیں دیگر زبانوں میں بھی بشمول ہندی بالخصوص اپنی تحریریں خود لکھ کر چھپوائیں یا منتقل کرائیں۔ان کے بہت سارے کارنامے اردو اخباروں کی زینت بنے۔راشٹریہ سہارا کے کچھ دنوں تک مدیرِ اعلیٰ بھی رہے۔انقلاب میں بھی وہ بڑی پابندی سے چھپتے تھے۔بہار کے شہر آرا سے تعلق رکھنے والے مشرف عالم ذوقی کا تعلق کچھ دنوں کے لئے شہر مظفرپور سے بھی تھا۔جب ان کے والد یہاں بہار کے شعبۂ تعلیم میں ایک بڑے عہدیدار کی حیثیت سے فائز تھے۔جہاں چھت سے گر جانے کا وہ سانحہ پیش آیا جس کے بعد ان کی آنکھوں کا پردہ مجروح ہو گیا یعنی وہ دونوں آنکھوں سے Retina Detachment کے شکار ہو گئے اور بغرض علاج شہر مدراس کے عالمی شہرت یافتہ امراض چشم کے اسپتال ''شنکر نیترالیہ'' میں کئی مہینوں تک مقیم رہے۔ صحتیابی کے بعد جب لکھنے پڑھنے لگے تو ناول نگار اور افسانہ نگار ہو گئے غالباً اسی سبب سے وہ سیاہ چشمہ زندگی بھر استعمال کرتے رہے۔مشرف عالم ذوقی نے بہت سارے کارنامے چھوڑے ہیں ان میں کئی لازوال اہمیت کے حامل ہیں۔مثلاً ''مرگ انبوہ'' اور ''مردہ خانے میں عورت'' وغیرہ۔ذوقی کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی اقتدار کی پرواکئے بغیر سیاسی اعتبار سے بھی بےخوف وخطر لکھتے تھے اور معاشرے کی ایسی تصویر کشی کرتے تھے جس میں ظلم وجَور اور ہر طرح کی سَفا کیوں کی بےکم وکاست روداد آجایا کرتی تھی۔اس جہت سے نثر میں ان کی وہی حیثیت ہے جو شاعری میں راحت اندوری کی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا سانحۂ ارتحال بھی کم دل سوز نہیں ہے جو ۲۳/اپریل ۲۰۲۱ءکو شہر حاجی پور میں پیش آیا۔خبروں کے مطابق بغرض علاج پٹنہ کے ایک نجی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں انہوں نے آخری سانس لی۔ضلع ویشالی کے مہنار کے رہنے والے اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ حاجی پور اور مظفرپور میں گزارنے والے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اپنی تدریسی زندگی میں صرف محنتی اور باصلاحیت طلباء کے ساتھ مربیانہ اور شفقت آمیز برتاؤ کرنے والے ہی نہیں تھے، بلکہ انہوں نے اپنی زندگی لکھنے، پڑھنے، پڑھانے اور نئی نسل کی ذہنی رہنمائی کرنے میں بسر کر دی۔ان کی زندگی کا کچھ حصہ پٹنہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی گزرا۔وہاں سے انگریزی میں ایم۔اے، اردو میں ایم۔اے اور پی ایچ۔ڈی کی اسناد حاصل کیں اور اس کے بعد پروفیسر کلیم الدین احمد کی صحبت اور رہنمائی میں انگریزی اردو ڈکشنری کی ترتیب وتدوین میں حصہ لیا۔اس کے بعد ان کا تقرر بہار یونیورسیٹی، مظفرپور کی سلیکشن کمیٹی کے ذریعہ سے شعبۂ اردو، آر۔این۔ کالج، حاجی پور کے لئے ہو گیا، جہاں اردو کی پوسٹ نہیں ہونے کے باوجود یونیورسیٹی کی انتظامی غلطی سے ان کی پوسٹنگ ہو گئی۔پھر بڑی مشکلوں سے ان کا تبادلہ بہار یونیورسیٹی، مظفرپور کے پوسٹ گریجوئیٹ شعبۂ

اردو میں ہو گیا جہاں انہوں نے اپنی لیاقت کے سکے بٹھائے۔ان کی کئی تصانیف ہیں۔آخری وقت تک وہ لکھتے اور پڑھتے رہے۔ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ان کی آخری تصنیف ''قندیلیں'' ابھی حال ہی میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ان کا انتقال بھی کچھ اچانک ہی ہوا۔

بہار ہی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر مولا بخش کا انتقال جو ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء میں علی گڑھ میں ہوا، اس اعتبار سے اور زیادہ افسوسناک ہے کہ وہ ابھی تدریسی زندگی میں برسرِ کار تھے اور ابھی سبکدوش نہیں ہوئے تھے۔وہ ضلع مشرقی چمپارن کے ایک گاؤں مجھریا کے رہنے والے تھے۔ان کی تعلیم کا ابتدائی حصہ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ تک پٹنہ میں گزرا۔رانچی یونیورسیٹی سے بی۔اے (آنرز) اور اردو میں ایم۔اے بھی کیا۔پھر جواہر لعل نہرو یونیورسیٹی، نئی دہلی چلے گئے، وہاں سے پی ایچ۔ڈی ہوئے۔تدریسی زندگی میں دہلی یونیورسیٹی کے ایک معیاری کالج دیال سنگھ کالج سے وابستگی کے ذریعے منظرِ عام پر آئے۔اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی چلے گئے جہاں وہ براہِ راست پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے۔اپنی لیاقتوں کی وجہ سے وہ بہت سارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ذمے دار عہدوں پر فائز ہوئے یا ممبر رہے۔ان کے کارنامے لسانیاتی اور ثقافتی سطح پر قابلِ قدر ہیں۔'' خواجہ حسن نظامی کی نثر (ثقافتی لائحۂ عمل)، اور خواجہ میر محمد آثر، جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ'' پر ان کی ادبی تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔مابعد جدید تنقید بھی ان کی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔اسلوبیات پر انہوں نے بہت شرح وبسط کے ساتھ کام کیا ہے اور کر رہے تھے۔خبروں کے مطابق اسلوبیات پر ان کی تحریریں کئی جلدوں میں جلد ہی آنے والی تھیں۔

بہار کے ایک اور نامور افسانہ نگار شوکت حیات کا انتقال بھی ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ءکو پٹنہ میں ہوا۔انہوں نے جدید افسانے میں اپنی انفرادی حیثیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔علامتی اور تجریدی افسانے ان کی شناخت کے اہم ستون ہیں۔کہتے ہیں کہ انہوں نے بیانیہ افسانے کم لکھے۔معاشرتی اور عصری مسائل پر ان کی تخلیقات ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں۔ان کی رحلت سے بھی بہار کو نقصان پہنچا ہے۔اگر وہ اور زندہ رہتے اور لکھتے رہتے تو ان کی شہرت بہت دور تک پہنچتی پھر بھی اہلِ علم باخبر ہیں کہ شوکت حیات ایک اچھے اور کامیاب جدید افسانہ نگار کا نام ہے۔

بہار کے ایک اور بڑے شاعر سلطان اختر کی وفات بھی ۱۳/اپریل ۲۰۲۱ءکو ہوئی۔کہتے ہیں کہ ان کا انتقال اچانک ہوا۔اس وقت ان کی عمر ۸۰/سال کے قریب تھی۔وہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے Vice Chairman بھی رہ چکے تھے۔حکومت بہار میں ۱۹۶۸ء سے ملازم تھے اور ۲۰۰۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ابتداء ہی سے ان میں شاعرانہ جوہر کے امکانات پوشیدہ تھے جن کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ان کے ادبی قد وقامت کو استحکام اس وقت حاصل ہوا جب ۱۹۶۷ء میں رسالہ ''فنون'' لاہور کے

جدید غزل نمبر میں ان کی دس غزلیں بیک وقت شامل اشاعت کی گئیں۔ان کے شعری مجموعوں میں ’’غزلستان‘‘،’’برگ خوش رنگ‘‘اور’’شاخ طلب‘‘زیادہ مشہور ہیں۔ان کی موت سے بھی اردو شاعری اور غزل کو اور ریاستِ بہار کو بھی نا قابلِ تلافی خسارہ پہنچا۔

افتخار امام صدیقی کی رحلت کا سانحہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔وہ شاعر و ادیب کی حیثیت سے ہی معروف نہیں تھے بلکہ ان کا خانوادہ اردو کا ایک بڑا تاریخی خانوادہ ہے۔سیمابؔ اکبر آبادی بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔انہوں نے مولانا روم کی فارسی مثنوی کے ایک حصّے کا ترجمہ اردو میں بصورتِ مثنوی کیا تھا۔کہتے ہیں کہ سیمابؔ کے شاگردوں کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی۔انہوں نے شہر آگرہ سے رسالہ ’’شاعر‘‘ کا اجراء کیا تھا۔جو بجائے خود شہیر روزگار رہے۔ملک کی آزادی اور تقسیم کے وقت فسادات اور ہنگاموں سے گھبرا کر یہ پورا ادبی خاندان آگرہ سے بمبئی آ پہنچا۔یہاں بھی انہوں نے رسالہ ’’شاعر‘‘ کی اشاعت جاری رکھی۔پھر ملک کی تقسیم کے بعد سیمابؔ اکبر آبادی نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔وہ چلے گئے اور ان کے بیٹے اور خاندان کے دیگر لوگوں نے ہندوستان ہی میں بے سروساماں ہوکر بھی رہنے کا فیصلہ کیا اور بڑی تکلیفوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے بھی رسالہ ’’شاعر‘‘ کی اشاعت جاری رکھی۔ افتخار امام صدیقی ، اعجاز صدیقی کے صاحبزادوں میں ایسے فرد تھے جنہوں نے رسالہ ’’شاعر‘‘ کے دفتر کو سنبھال لیا اور بحیثیت شاعر بھی انہوں نے اپنی شناخت بنالی اور مشاعروں میں ہند و پاک سطح پر بُلائے جانے لگے اور وہ ترنم سے اپنا کلام سناتے تھے۔انہوں نے اپنے عہد ادارت میں ’’شاعر‘‘ کے کئی خاص نمبر اور سال نامے جاری کئے۔ ۱۹۸۰ء میں ’’شاعر‘‘ کا خصوصی نمبر ’’سال نامہ‘‘ کے عنوان سے شائع کیا جس میں ہند و پاک کی سطح پر بہت سارے اہلِ قلم کے مضامین شریک اشاعت ہوئے۔

پروفیسر شمیم حنفی کا انتقال بھی اسی سہ ماہی مدّت میں ہوا۔ان کی تاریخ وفات ۶ رمئی ۲۰۲۱ء ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبۂ اردو کے ایک ممتاز رکن ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے شاعر اور معروف اہلِ قلم بھی تھے۔ان کی رحلت سے ایک بلند پایہ ادیب ، ناقد ، دانشور، شاعر، مصنف اور ڈراما نگار ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔ان کی علمی ، ادبی اور تصنیفی خدمات کم و بیش نصف صدی پر محیط ہیں۔ کہتے ہیں کہ شمیم حنفی کا تنقیدی شعور پروفیسر احتشام حسین کی سرپرستی میں پروان چڑھا تھا۔ان کی تصانیف میں عالمانہ حیثیت ہمیشہ نمایاں رہتی تھی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سکریٹری اور امارت شرعیہ بہار، اُڑیسہ اور جھارکھنڈ کے امیر شریعت مولانا سید ولی رحمانی کا ۳ر اپریل ۲۰۲۱ء کو دنیا سے اُٹھ جانا اُمت مسلمہ کے لئے بہت بڑا خسارہ ہے۔ وہ صرف عالم دین نہیں تھے، ایک نہایت دلیر اور بے باک ملّی رہنما بھی تھے۔ان کے بیانات، رشحات

قلم اور اقدامات سے یہ ثابت ہوا کہ انہوں نے اپنے موقف کے اظہار میں کسی اقتدار اور دباؤ کو اہمیت نہیں دی اور ہمیشہ صحیح سمت میں رہنمائی کرتے رہے۔امارت شرعیہ کے زیر اہتمام انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے جدید تعلیم کے ذیلی ادارے قائم کئے۔مقابلہ جاتی امتحانوں کے لئے Rahmani-30 کے قیام میں انہوں نے بڑے اہل اور ماہر مُتخصّصین کی مدد سے نئی نسل کے طلباء کی میڈیکل اور انجینیر نگ کے امتحانات کی خاطر کوچنگ کا ایک مضبوط سلسلہ قائم کیا اور کامیاب طلباء کی کھیپ نکالنے لگے۔وہ زندگی بھر فعال رہے اور آخری وقت تک پتہ نہیں چلا کہ ان کی آخری گھڑی آ پہنچی۔ گویا ان کی وفات ایک اچانک رونما ہونے والا عظیم سانحہ ہے۔

۶ر اپریل ۲۰۲۱ء کو حیدر آباد میں پروفیسر ڈاکٹر محمد ظفرالدین کا انتقال بھی مشاہیر کی فہرست میں ان کے لئے تعزیتی خیالات کے اظہار کا تقاضہ کرتا ہے۔وہ سینٹر فار اردو کلچر اسٹڈیز اور ڈائرکٹریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلیکیشن کے ڈائرکٹر حیدر آباد میں تھے۔وہ یونیورسیٹی کے پہلے P.R.O. بھی تھے۔ان کی نگرانی میں فاصلاتی تعلیم کے شعبے کی سینکڑوں کتابیں تیار ہوئیں۔یونیورسیٹی میں شعبۂ ترجمہ قائم ہوا تو وہ اس کے اوّلین صدر بنائے گئے بعدازاں وہ مذکورہ ڈائرکٹریٹ کے ڈائرکٹر ہوئے۔انہوں نے ۶۶ر کتابوں کی تیاری کی نگرانی کی۔وہ بھی بہار کے گوہر تابدار تھے اور گیا شہر کے رہنے والے تھے۔اعلیٰ تعلیم انہوں نے دہلی یونیورسیٹی سے حاصل کی۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور پھر ترقی کرتے گئے اور یہاں تک پہنچے۔ان کی وفات بھی کم عمری میں ہوئی یعنی وہ برسرِ کار تھے اور عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ادارہ انہیں بھی ان لوگوں میں شمار کرتا ہے جن کے لئے تعزیت کی یہ سطور قلم بند کی گئیں۔

یہ شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے یہ احساس دامن گیر ہے کہ ہم نے شعر و ادب اور ملک و ملت کے عظیم جواہر پاروں سے محرومی کے احساسات کی ترجمانی تک اپنی تحریر کو محدود کر دیا ہے اور اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔صدیوں تک جن کی کمی محسوس کی جاتی رہے گی، ایسے گراں قدر اشخاص کی بات نکل آئی ہے تو خراجِ عقیدت اور اظہار تعزیت کے لئے جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔

مظفر پور

۲۱ر جون ۲۰۲۱ء

پروفیسر سیّد آلِ ظفر

تنویر پھولؔ (امریکہ)

حمدِ باری تعالیٰ

وہی معبودِ واحد ہے ، وہ ربّ العالمیں بے شک
وہ ہے خلاّقِ دنیا ، مالکِ عرشِ بریں بے شک

ستارے جگمگائے ہیں ، گلِ رنگیں کھلائے ہیں
بنایا آسماں اُس نے ، اُسی کی ہے زمیں بے شک

وہی ہے قادر و جبّار ،وہ ہے حکم راں سب پر
اُسی کے سامنے خم ہے زمانے کی جبیں بے شک

اُسی کا شکر لازم ہے ، ہر اِک نعمت عطا اُس کی
سماعت اور گویائی ، نگاہِ دور بیں بے شک

ہمارا غیب پر ایماں ، ہمیں علم الیقیں بخشا
وہی دے گا ہمیں عین الیقیں، حق الیقیں بے شک

دیا قرآن با حکمت ، وہ ختم الانبیا ﷺ بھیجا
جنھیں کہتے رہے دشمن بھی صادق اور امیں بے شک

کرم تیرا ہے ، تُو نے اُمتِ سرکار ﷺ میں رکھّا
تُو شہ رگ سے قریں ہے اور وہ ﷺ دل میں مکیں بے شک

تری صنّاعی کے جلوے زمین اور آسمانوں میں
تری آیاتِ قدرت ہر جگہ ہم کو ملیں بے شک

از آدمؑ تا شہِ دیں ﷺ سب پیام اسلام کا لائے
ہمیشہ سے پسندیدہ ترا ہے ایک دیں بے شک

ہمیں نصرت عطا کر کافروں پر، بد نہادوں پر
منافق پیروِ شیطاں ہیں مارِ آستیں بے شک

زباں کو پھولؔ کی توفیقِ حمد و نعت دی تو نے
عطا تیری ہے تاثیرِ شفا دَر انگبیں بے شک

ISSN : 2582 - 3612

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

نعت پاک

جو مکّے کا سفر ہے اور میں ہوں
تو کعبے پہ نظر ہے اور میں ہوں

زباں پر نام ہے اپنے اُسی کا
خدا کا پہلا گھر اور میں ہوں

گئے معراج کو ، آقا یہیں سے
وہ جائے معتبر ہے اور میں ہوں

وہ جنت سے ہی جو لایا گیا تھا
وہی اَسود حجر ہے اور میں ہوں

چلو ، چلتا ہوں اب سوئے مدینہ
کہ شاہِ دیں کا در ہے اور میں ہوں

پڑھو چالیس وقتوں کی نمازیں
کہ ساعت معتبر ہے اور میں ہوں

مناظرؔ جاؤں گا کیوں خالی دامن
دعائے پُراثر ہے اور میں ہوں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر قدوس جاوید

مشتاق احمد وانی : زندگی کی صداقتوں کا ادیب

مشتاق احمد وانی، اردو کا ایک ایسا قلم کار ہے جس نے لفظ و معنی کی حرمت کا خیال رکھتے ہوئے حیات و کائنات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اُس کے تخلیقی شعور کی آنکھوں میں ہر وقت خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے۔ حیات و کائنات اور سماج و معاشرے پر اُس کی گہری نظر ہے۔ میں نے اُسے بہت قریب سے دیکھا، سوچا، سمجھا اور بار بار آزمانے کے بعد یہ پایا ہے کہ وہ اپنے قول و فعل، اخلاق و کردار، تہذیب و شرافت، رفتار و گفتار، خوف آخرت اور محنت و لگن کے اعتبار سے ایک قابل قدر اور مرنجان مرنج شخصیت کا حامل ہے۔ اُس نے زندگی کے مسائل و مشکلات، الجھنوں، پریشانیوں اور حق تلفیوں کو نہ صرف کتابوں میں پڑھا ہے بلکہ خود انھیں جھیلا بھی ہے۔

جہاں تک مشتاق احمد وانی کی ادبی زندگی کا تعلق ہے وہ بھی بڑی دلچسپ اور متنوع رہی ہے۔ اُردو ادب میں اُن کی حیثیت ایک ممتاز افسانہ نگار، محقق اور نقاد کی ہے۔ 1989ء میں اُن کی پہلی کہانی ''تڑپتے پنچھی'' کے نام سے ماہنامہ 'بھیانک جرائم' (نئی دہلی) سے شائع ہوئی۔ ابتدا میں اُن کے افسانے گلابی کرن، بھیانک جرائم اور بیسویں صدی، جیسے نیم ادبی رسائل میں چھپتے رہے لیکن بہت جلد اُنھوں نے معیاری ادبی رسائل میں اپنی تخلیقات ارسال کرنا شروع کیں۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 2001ء میں ''ہزاروں غم'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا جس میں اُن کے سولہ افسانے شامل ہیں۔ 2002ء میں اُن کا تحقیقی مقالہ ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا۔ 452 صفحات پہ مشتمل یہ مقالہ بھی نہایت معلوماتی ہے۔ 2004ء میں اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''آئینہ در آئینہ'' کے عنوان سے منظر عام آیا۔ 2008ء میں اُن کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''میٹھا زہر'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا جس میں اُن کے بارہ افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں پر اردو کے اہم ناقدین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں ایک بڑے افسانہ نگار کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ 2011ء میں مشتاق احمد وانی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اعتبار و معیار'' کے نام سے انجمن ترقی اردو نئی دہلی نے شائع کیا۔ 2013ء میں مشتاق احمد وانی کی

تاریخ ساز اور معرکتہ الآرا کتاب ''اردو ادب میں تانیثیت'' کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کیا۔ یہ کتاب 780 صفحات پر مشتمل ہے جو عالمی سطح پر اپنی اہمیت و افادیت منوا چکی ہے۔ 2014ء میں ''شعور بصیرت'' کے عنوان سے اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کیا۔ 2015ء میں اُن کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''اندر کی باتیں'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں بھی بارہ افسانے شامل ہیں جن کو اردو کے بلند پایہ ادیبوں نے پسند کیا ہے۔ 2019 میں اُن کی تین کتابیں ''قبر میں زندہ آدمی'' (افسانے) ''ترسیل و تفہیم'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) اور ''کیا حال ہے جاناں!'' (افسانے) شائع ہوئیں۔ ان میں ''قبر میں زندہ آدمی'' میزان پبلشرز سری نگر نے شائع کی جب کہ بقیہ دو کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی نے شائع کیا۔ 2020ء میں مشتاق احمد وانی کی ''نئی تنقیدی معنویت'' کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس نے شائع کی جس میں اُن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان شائع شدہ کتب کے علاوہ ''تنقیدی فکر و فن'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) ''کہکشانِ خیال'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین) اور ''زبان و بیان'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

مشتاق احمد وانی فطری طور پر افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاری کے جراثیم اُن کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے اس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتے ہیں کہ جو کوئی اُن کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے وہ اُن کے اسلوب بیان اور ماجرا نگاری کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی افسانہ نگاری پر اردو کے ممتاز ناقدین نے مضامین اور تاثرات لکھے ہیں جن میں گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی، ظہورالدّین، عتیق اللہ، قدوس جاوید، ارتضیٰ کریم، شریف احمد قریشی، مناظر عاشق ہرگانوی، علی احمد فاطمی، مجید بیدار، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، محبوب راہی، حمیداللہ خان کے علاوہ اور بہت سے اہل نقد و نظر ہیں جنھوں نے اپنے اپنے زاویۂ فکر و نظر سے مشتاق احمد وانی کے افسانوں کی افہام و تفہیم میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً چند اہم ناقدین کے تاثرات پر دھیان دیجیے :

> ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک مدّت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اُن کی کہانیاں میری نگاہ سے گزرتی رہی ہیں۔ وہ ایک دردمند دل اور ایک حسّاس طبیعت رکھتے ہیں۔ وہ کشمیری اہل زبان ہیں لیکن اُردو میں بھی اُن کی پینٹھ مادری زبان سے کم نہیں۔ اُن کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اور اُن کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں، بالخصوص اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت، انسانی رشتوں کا بکھرنا، بزرگوں اور اُن کی اولادوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، خودغرضی، لالچ اور کاروباری ذہنیت کا فروغ

نیز سماجی سطح پر لڑکیوں کی ناقدری اور اُن کے جذبات کے تئیں عزیزوں، رشتہ داروں کی بے حسی۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی سماج کے فاسد مادے کے معالج ہیں اور اُن کی کہانیاں ترسیل، تاثیر اور دردمندی کیا عتبار سے توجہ چاہتی ہیں''

(گوپی چند نارنگ)

''فی الوقت اُن کے چند افسانے میرے پیش نظر ہیں مثلاً ''دل و دماغ میں گھومتی کیل'' افراتفری میں کھڑا آدمی'' دوہری مار'' ''پنجرے میں مورنی'' ''کوفت''، ''چور''، ''میٹھا زہر''، ''بیٹی''، ''مجبوری''، ''جنم بھومی کے آنسو''، ''درد بھری راتیں'' اور ''شرافت'' اِن کے مطالعے سے ڈاکٹر مشتاق کے مزاج کا تنوع اور تجربے و مشاہدے کی سمتوں کا پتا چلتا ہے۔ وہ کسی ایک رویّے اور رُخ میں بند نہیں''

(وہاب اشرفی)

مشتاق احمد وانی، اکیسویں صدی کے ڈسکورسیز کو افسانہ کے قالب میں ڈھالنے والا افسانہ نگار ہے، لیکن مشتاق وانی کا فنی امتیاز یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پہ افسانہ لکھتے ہوئے متعلقہ حقائق و مسائل کی تہوں اور طرفوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں اور پھر ان سے متعلق اپنے مطمح نظر کو تمام تر فنی و جمالیاتی در و بست کے ساتھ افسانہ کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آخیر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو کے جن افسانہ نگاروں کو اردو کی پُرانی اور نئی بستیوں میں، یکساں طور پر اعتبار و احترام حاصل ہوا ان میں ڈاکٹر مشتاق وانی کا قد سب سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے اسباب کئی ہیں۔ اول یہ کہ مشتاق وانی اپنے ماحول اور معاشرہ کے بیچ زندگی جینے والا انسان ہے اور اس زندگی جینے کے عمل کے دوران جو تجربات و مشاہدات، مشتاق وانی کے جذبہ واحساس کے آنگن میں اترتے ہیں انھیں وہ اپنی تخلیقی قوت تخیل و تصور کی پرواز و زبان و بیان کی مہارت کی مدد سے بیانیہ (Narration) کی وہ شکل عطا کرتے ہیں جسے افسانہ کہتے ہیں۔ مشتاق وانی آج کے افسانہ نگار ہیں لیکن انھیں اردو افسانہ کی روایات و اقدار عزیز ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اردو فکشن پر مغربی فکشن کے موضوعاتی، اسلوبیاتی اور اظہاری بیانیاتی اجتہادات کے اثرات کی بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی تصنیفات ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران '' آئینہ در آئینہ' اعتبار و معیار'' شعور بصیرت'' اور ''اردو ادب میں تانیثیت'' وغیرہ کے علاوہ ان کے تازہ

ISSN : 2582 - 3612

ترین متفرق مضامین سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مشتاق وانی کے افسانوی مجموعوں ''ہزاروں غم'' ''میٹھا زہر'' اور اندر کی باتیں'' میں شامل افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر کے نئے معتبر معاصر افسانہ نگاروں، مشتاق مہدی، ریاض توحیدی، ناصر ضمیر، راجہ یوسف، طارق شبنم وغیرہ کے ساتھ ساتھ مشتاق وانی بھی اردو افسانہ کے سرمایہ میں قابل قدر اضافے کررہے ہیں، لیکن مشتاق وانی کے افسانے موضوع اور بیانیہ کے حوالے سے اپنے معاصرین سے قدر مختلف ہوتے ہیں مشتاق وانی کا ایک اہم شناختی امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں میں فنی و فکری ہر جہت سے تازہ کاری تو ہوتی ہے، لیکن مشتاق وانی نام نہاد جدید افسانہ نگاروں کی طرح اپنی مسلمہ مذہبی، سماجی اور ثقافتی قدروں کی نفی نہیں کرتے اور نہ ہی بعض مابعد جدید افسانہ نگاروں کی طرح غیر ضروری طور پر جنسی اور نظریاتی آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مشتاق وانی کے افسانوں کی قرات کا دائرہ ہر حلقہ میں وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ مشتاق وانی کے اب تک تین افسانوی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

''قبر میں زندہ آدمی'' ڈاکٹر مشتاق وانی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ مجموعہ میں شامل ۱۳ ر افسانوں کے عنوانات سے بھی مشتاق وانی کی سوچ اور فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ مجھے ایک دن گھر جانا ہے۔ ۲۔ انتظار مرگ۔ ۳۔ چار چہرے۔ ۴۔ حاضر جواب۔ ۵۔ ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی۔ ۶۔ کارِ خیر۔ ۷۔ انتقام۔ ۸۔ معاوضہ ۹۔ عورت۔ ۱۰۔ سب کی ماں گالی۔ ۱۱۔ واپسی ۱۲۔ سات نمبر کا پاپوش۔ ۱۳۔ قبر میں زندہ آدمی۔ ان افسانوں کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تخلیق کا زمانہ حالیہ چند برسوں پر ہی محیط ہے۔ عالمیت (Globlisation) اور بازاریت کے سبب ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں صارفینی سماج اور تہذیب (Consumeristic Culture & Society) کے خط و خال تو بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہی نمایاں ہوچکے تھے، لیکن اکیسویں صدی میں مادہ پرستی کچھ زیادہ ہی مضبوط اور مستحکم ہوئی۔ روز مرہ کے معاملات کو بھی گناہ اور ثواب کے بجائے نفع اور نقصان کی بنیاد پر برتا جانے لگا، لیکن اس کے بھیانک نتائج، بدعنوانی، بداعمالی، فرقہ پرستی، دہشت گردی، جنسی جرائم اور فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں سامنے آنے لگے۔ خاص طور پر فرقہ پرست افراد کی جانب سے 'گھر واپسی' لو جہاد، گائے اور اذان کے نام جو تشدد کے واقعات ہوئے اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس پہ مستزاد یہ کہ ۲۰۱۴ء میں 'ہندوتو' اور 'تہذیبی قومیت' کی حامی قوتوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد مسلم اقلیت کچھ خوف اور کچھ تشویش میں بھی مبتلا ہوئی۔ اس کا ایک ردّعمل تو یہ ہوا کہ مسلمانوں نے فراست مومن کا ثبوت دیتے ہوئے صبر و تحمل سے کام لیا۔ دوئم یہ کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنی اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا بہتر جانا۔ یوں بھی ادھر کچھ عرصہ سے ریاست اور ملک کے مسلم معاشرے میں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بھی مذہبی اور اخلاقی قدروں میں جو تشویش ناک انتشار اور زوال آیا، اغیار اس کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ معاصر اردو فکشن میں ایک طرف جہاں تہذیبی تکثیریت (Cultural Pluralism) جنسی جرائم (Sexual Offence) معاشی بحران اور دولت غم وغصہ وغیرہ 'بیانیہ' کا حصہ بن رہے ہیں، وہیں ہلکے سروں میں ہی سہی مذہبی و اخلاقی بیانیہ بھی اردو کے چند ایک فکشن نگاروں کے یہاں نمایاں ہوا ہے۔ مشتاق وانی کا نام ان میں سرفہرست ہے۔ مشتاق وانی کے اس اختصاص کا اندازہ ان کے افسانوی مجموعہ ''قبر میں زندہ آدمی'' میں شامل افسانوں کے درج ذیل اقتباسات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے :

> ''اپنے مکان کی چوتھی منزل پر جونہی محسن میاں نے قدم رکھا تو انھیں یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے مکان سے پورے شہر پر نظریں دوڑا سکتے ہیں۔ وہ ایکسائز انسپکٹر تھے، لیکن ان کے دل و دماغ میں یہ بات رچ بس چکی تھی کہ حرام کی کمائی میں آدمی کو سکون نہیں ملتا۔ جائز و ناجائز کا سبق انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں پڑھا تھا جو انھیں اچھی طرح یاد رہ گیا تھا۔ حسن اخلاق سے ہر کسی کا دل جیتنے میں خاصے ماہر ہوگئے تھے''
>
> (افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'')

لیکن آج کے دور میں حق و صداقت اور دیانتداری کے ساتھ جینا، مرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس حقیقت کو مشتاق وانی نے بڑی سادگی کے ساتھ اپنے افسانہ 'ہاتھ میں ڈنڈا منہ میں گالی'' میں یوں پیش کیا ہے :

> ''لعل محمد، محکمہ باغبانی میں تیسرے درجے کے ملازم تھے۔ دس سال سروس ابھی باقی تھی۔ آدمی شریف، دیانتدار، حق پرست، محنتی، ذہین اور بہترین حسن اخلاق و کردار کا مالک ہو تو جدید معاشرے کے منافق، حاسد، عیار، مکار اور رنگے سیار قسم کے لوگ اسے برداشت نہیں کرتے اور ایسی جملہ صفات کا حامل آدمی اکثر پریشان بھی رہتا ہے''

اگر دیکھا جائے تو تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پاسداری کے اعتبار سے مشتاق وانی کے افسانوں کا رشتہ راشد الخیری کے ''نصیر اور خدیجہ'' کثرت ازدواج'' اور سلطان حیدر جوش کے ''نابینا بیوی'' اور اتفاقات زمانہ'' جیسے افسانوں سے قائم ہوتا ہے۔

مشتاق وانی کے اکثر و بیشتر افسانوں میں ان کی ذاتی نارسائیوں اور محرومیوں کی جلوہ گری بھی نظر

آتی ہے۔ مشتاق وانی نے قدرتی مناظر سے بھرپور بلند و بالا پہاڑیوں کے دامن میں، بل کھاتی ندیوں اور گنگناتے چشموں کے کنارے آباد گاؤوں میں آنکھیں کھولیں، بچپن گزارا، ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہروں کے شب و روز بھی دیکھے۔ اردو میں ایم اے، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، نیٹ اور ڈی لٹ کیا۔ مطالعہ وسیع تھا اور ذہن زرخیز، کم عمری سے ہی افسانے اور تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے لگے تھے۔ ادب کے حوالے سے کام بھی تھا اور نام بھی، لیکن اس کے باوجود تنگ نظر پروفیسروں نے مشتاق وانی کو کسی کالج یا یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر نہیں دیا۔ جب کہ ایسے ایسے نااہلوں کو پروفیسر بنایا گیا جو صلاحیت کے حوالے سے مشتاق وانی کے پاوں کی دھول کے برابر بھی نہ تھے۔ دراصل کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسری کے لیے صلاحیت کی بجائے کچھ اور باتوں کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ نااہل اور اخلاق سے کمزور اساتذہ نہیں چاہتے کہ باصلاحیت اور باکردار افراد شعبے میں آئیں، اس سے ان کی کور دبنے کا خدشہ رہتا ہے۔ مشتاق وانی کو بھی اسی لیے ایک عرصے تک کسی یونیورسٹی میں داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ اب کہیں کافی تاخیر سے بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر) میں اردو شعبے سے وابستہ ہوئے ہیں۔ پروفیسر مشتاق وانی نے اپنے اس کرب کا اظہار اپنے افسانہ ''معاوضہ'' میں بڑے ہی پُر تاثیر انداز میں کیا ہے :

> ''پروفیسر دھرم چند کہنے لگے مجھے بہت دکھ ہے کہ تُو اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔ حیرت تو یہ ہے کہ دو یونیورسٹیاں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ کرواچکی ہیں اور تین یونیورسٹیوں میں تجھ پر ڈاکٹریٹ کا کام ہورہا ہے......آخر چکر کیا ہے؟'' ''دھرم چند ......یار......میرے پاس توحید و رسالت کی عظمت وفضیلت، پانچ وقت کی نمازوں کی ٹھنڈک، رمضان المبارک کے تیس روزوں کا تقویٰ، عشر و ذکواۃ کی اہمیت وافادیت اور حج وعمرہ کی تمنا تھی۔ چنانچہ دو متضاد طبیعتوں کے تصادم کے سبب مجھ سے میرا حق چھینا گیا''
>
> (افسانہ ''معاوضہ'')

مشتاق وانی کے اس تازہ ترین مجموعہ میں افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'' میں بھی جس پر اس مجموعے کا نام رکھا گیا ہے۔ مشتاق وانی نے مذہبی بیانیہ کو ہی برتا ہے۔ عام انسانی فطرت ہے کہ جب اس کے پاس دولت آجاتی ہے تو وہ دین سے دور ہوجاتا ہے، لیکن جب موت سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے۔ مشتاق وانی نے اسی حقیقت کو اپنے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار 'یار خاں' کو قارئین سے اس طرح متعارف کرواتے ہیں :

''یار خاں، قومی شاہراہ پر ٹنل تعمیر کرنے والی ایک آسٹریلین کمپنی کے ساتھ اے کلاس ٹھکیدار تھے۔ روپے پیسے کو وہ اپنے ہاتھ کی میل سمجھتے تھے۔ شہر میں ان کا بہت بڑا مکان دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی منسٹر کی کوٹھی ہے۔ اس قدر رنگین مزاج تھے کہ دنیا کو دارالعمل کے بجائے دارالتفریح سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ام الخبائث کو صحت کے لیے مفید خیال کرتے تھے''

(افسانہ ''قبر میں زندہ آدمی'')

لیکن ایسا نہیں ہے کہ مشتاق وانی نے اپنے افسانوں میں صرف اور محض دینی اور اخلاقی قدروں کو ہی برتا ہے۔ دینی اور اخلاقی تقاضوں کے ساتھ ساتھ مشتاق وانی نے عصر حاضر کے سنگین مسائل اور حقائق کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً طبقہ نسواں کو درپیش چیلنجوں پر ان کا افسانہ ''عورت'' 'تانیثی ڈسکورس' کو ایک نئی جہت دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور باشعور رام دُلاری کا اپنے باس سے یہ کہنا کہ :

''سر.......... میں آپ کو یہ یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ہمارے ملک میں عورتوں پر ظلم وستم، ان کی خودکشی اور اغوا کی بنیادی وجہ ان کی بے پردگی ہے۔ اگر ہمارے ملک کی تمام عورتیں، بلالحاظ مذہب وملّت پردے کو بطور تحفظ عزت وعصمت اپنائیں تو عورتوں سے جڑے ان تمام ظلم وزیادتیوں اور جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔''

(افسانہ ''عورت'')

اب لوگ مشتاق وانی کے اس نظریے کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کٹھوعہ (جموں) میں آٹھ سالہ معصوم بچّی کی اجتماعی آبروریزی اور قتل کے بعد اکثر لڑکیاں پردے میں نکلنے لگی ہیں۔ اسی طرح افسانہ ''واپسی'' اردو میں دلت کہانی کی عمدہ مثال ہے۔ آج بھی بعض گاؤں اور قصبوں میں پانی کا کنواں ہی نہیں دلتوں کو 'شمشان گھاٹ' بھی الگ تھلگ بنانا پڑتا ہے، لیکن مشتاق وانی نے اس افسانہ میں ہندو معاشرہ کی طرح مسلم معاشرہ میں بھی رائج مسلکی تفرقہ پر بجا طور پر طنز کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر مسلمان بھی فرقوں میں نہ بٹے ہوتے تو اس افسانہ ''واپسی'' کے مرکزی کردار دیا رام جیسے لاکھوں غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوچکے ہوتے۔

دور جدید کی ایک روش یہ بھی سامنے آئی ہے کہ نوجوان شادی شدہ بیٹے اور بہو اب والدین کو بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ مشتاق وانی نے اس موضوع کو افسانہ ''انتظار مرگ'' میں نہایت فنکارانہ مہارت کے

ISSN : 2582 - 3612

ساتھ پیش کیا ہے۔

افسانہ ''سب کی ماں'' مشترکہ تہذیب وکلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ بوڑھی بہاراں کے کردار کو جس فنی چابکدستی سے مشتاق وانی نے پیش کیا ہے، وہ ان کے بالیدہ تخلیقی شعور کی عمدہ مثال ہے۔ بہاراں کی موت پر ہندو، مسلمان اور سکھ فرقوں کا اظہار تاسف قومی اتحاد کی ضرورت کو آشکار کرتا ہے۔

''قبر میں زندہ آدمی'' میں شامل افسانوں کے علاوہ مشتاق احمد وانی کے دوسرے افسانوی مجموعوں سے ماخوذ چند اقتباسات سے بھی اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ اُن کے افسانوں میں حیات وکائنات کی گویائی موجود ہے۔ مثلاً :

''غلام عباس ہنس پڑے اور کہنے لگے ''خدا کرے نوری تمہارے یہ ارمان پورے ہوں لیکن یاد رکھو زندگی ایک غیر یقینی سفر ہے۔ یہ نہ تُم جانتی ہو نہ میں جانتا ہوں کہ زمین وآسمان کے صندوق میں ہم کب تک رہیں گے۔ رہی بات ارمانوں کی تو ارمان اس اس دُنیا میں کسی کے بھی پورے نہیں ہوتے ہیں۔ انسان کی ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری سر اُبھارنے لگتی ہے اور یہ رشتے ناطے سب جھوٹے ہیں۔ میری نظر میں یہاں سب اپنے مطلب کے یار ہیں'' نوری نے پوچھا ''تو کیا میرا اور آپ کا رشتہ بھی جھوٹا ہے؟''
''ہاں یہ بھی کسی حد تک جھوٹا ہے۔ اس لیے کہ جب میاں بیوی بوڑھے ہوجاتے ہیں تو ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے ہیں۔ چاہت کا یہ سلسلہ نفرت میں بدل جاتا ہے اور دونوں کو اپنے ناکارہ وجود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ قوتِ برداشت ختم ہوجانے کے سبب معمولی معمولی باتوں پر جھگڑنے لگتے ہیں۔''

(افسانہ۔ ''جسم خور کیڑا'' مشمولہ ''اندر کی باتیں'' تیسرا مجموعہ)

''دوسرے دن دوپہر کے بعد بدرالدّین اور زیب النّسا اپنے مکان کا دروازہ کھولنے کے بعد اندر داخل ہوئے تو گھر کی ہر چیز میں بے ترتیبی اور اُتھل پُتھل دیکھ کر اُن کے چہروں کا رنگ فق ہوگیا۔ مکان کی پہلی منزل سے لے کر تیسری منزل تک تمام کمروں کی الماریاں کھلی ہوئی اور اٹیچیاں یہاں وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ بدالدّین فوراً اُس الماری کی طرف دوڑے جس میں اُنھوں نے نیا مکان خریدنے کے لیے پچیس لاکھ روپے رکھے تھے اور اُن کی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

بیوی اپنے سنگھار بکس میں رکھے زیورات کی طرف لپکی۔ زیورات کا بکس نہ پاکر وہ پاگلوں کی طرح مکان کے باہر صحن میں آئی اور زور زور سے چیختی ہوئی کہنے لگی ''ہائے! میں لُٹ گئی! ہائے میرا سب کچھ مجھ سے چھن گیا۔''

(افسانہ ''ایک اہم سوال'' مشمولہ ''اندر کی باتیں'' تیسرا مجموعہ)

''پنڈت رتن شاستری کی بیوی کملیش کماری اکثر بیمار رہتی تھی۔ بدن کے جوڑوں کے درد کی وجہ سے زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی۔ کروٹ بدلتی تو ہائے مری! اُف کی آوازیں اُس کے منہ سے نکلتیں۔ تقریباً دو مہینے سے اُس نے بستر پکڑ لیا تھا۔ میناکشی ایک اچھی بہو کی حیثیت سے اپنی ساس اور سُسر کی خدمت کرتی تھی۔ چائے، پانی، کھانا اور وقت پر ساس کو دوائی کھلانا وہ اپنا اہم فریضہ سمجھتی تھی۔ میناکشی جب سے اس گھر میں آئی تھی تب سے یہ گھر بارونق ہو گیا تھا۔ اتنی اچھی بہو جو خوب صورت تو تھی ہی خوب سیرت بھی تھی۔ اپنے پتی کا خاص خیال رکھتی تھی مگر پتی کو اُس کا خیال نہیں تھا۔ اتنی سُندر ناری سے جیسے وہ اوب گیا تھا اور باہر منہ مارنا اُس نے نہ جانے کب سے سیکھ لیا تھا۔''

(افسانہ ''چھپا سانپ'' مشمولہ ''اندر کی باتیں'' تیسرا مجموعہ)

''بیٹے!......اک بار میری بات مان لے کامیاب رہے گا۔ میرے چار بیٹوں میں تُو سب سے زیادہ ضدی ہے۔ ضدی آدمی اکثر پریشان رہتا ہے۔ اب کی بار یہ تیرا تیرہواں انٹرویو ہے۔ یہ رشی، مُنیوں اور پیغمبروں کا زمانہ نہیں ہے بلکہ آج کل کے دور میں تو ہر چیز اور ہر معاملہ بازاری ہو گیا ہے۔ تُو کئی برسوں سے اپنی ذہانت، محنت، صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر اپنا مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن ہر بار رشوت اور سفارش سے نالائق قسم کے لوگ اونچے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں لہٰذا اس بار میری بات مان لے''

(افسانہ ''یہاں اور وہاں'' مشمولہ ''کیا حال ہے جاناں!'' پانچواں افسانوی مجموعہ)

''انقلاب حسین کی باتوں سے یوں لگتا ہے کہ اُن کے دل کے کسی گوشے میں اسلامی اقدار براجمان ہیں۔ ایک دن اُنھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''گلابی......! مُسلم معاشرے میں شادی نام ہے نکاح

کا۔ سینکڑوں لوگوں کو مدعو کرنا اور لاکھوں روپیہ خرچ کرنا مجھے یقین ہے یہ میرے نبی ﷺ کی سُنت نہیں رہی ہوگی۔ ہمیں فضول خرچی اور کفایت شعاری کو ذہن میں رکھ کر چلنا چاہیے۔ تُم سروس کے دوران جہاں جہاں رہی ہو اُن تمام سہیلیوں اور واقف کار لوگوں کو دعوت نامے بھیج رہی ہو۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ فیشن اور رواج کے طور پر نکاح کو غریب و نادار لوگوں کے لیے اتنا کٹھن بنایا جائے کہ وہ شادی ہی نہ کر پائیں''

(افسانہ ''غشی'' مشمولہ ''کیا حال ہے جاناں!'' پانچواں افسانوی مجموعہ)

''یارو! اس دور میں انٹرنیٹ، موبائل فون اور دوسری الیکٹرانک میڈیا کی چیزوں کے غلط استعمال نے جرائم کے کئی ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ فحاشی، فیشن بنتی جا رہی ہے اور غرور و تکبر، انانیت اور حسد، بغض و عناد جیسی تمام ذہنی خباثتیں دامن انسانیت کو تار تار کر رہی ہیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کے تشویش میں پڑ گیا ہوں۔ اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

(افسانہ ''آثارِ قیامت'' مشمولہ ''کیا حال ہے جاناں!'' پانچواں افسانوی مجموعہ)

غرضیکہ ڈاکٹر مشتاق وانی عصر حاضر کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا فن کسی بھی طرح کی فیشن پرستی سے آلودہ نہیں۔ مشتاق وانی جس ایمانداری کے ساتھ زمین پر جیتے ہیں ویسی ہی دیانتداری ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مشتاق وانی کو افسانہ میں استعارات اور علامتی اسلوب اختیار کرنے سے پرہیز نہیں لیکن وہ 'پر مجھے گفتگو عوام سے ہے' کے قائل ہیں۔ اسی لیے روزمرہ کی زندگی میں اپنے آس پاس زندگی جینے والے عام کرداروں اور ان سے وابستہ واقعات کو سیدھے سُبھاو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کا انداز قاری کو اپنی گرفت سے باہر نہیں جانے دیتا۔ مشتاق کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کوئی بھی قاری ایک بار ان کے کسی افسانے کی قرات شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی بات قاری کے دل میں کچھ محسوس اور کچھ نا محسوس طور پر اس طرح اتر جاتی ہے کہ مشتاق وانی کا افسانہ محض افسانہ نہیں رہتا زندگی جینے کا ایک مہذب اور محترم سلیقہ بن جاتا ہے اور یہ مشتاق وانی کے فن افسانہ نگاری کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔

مشتاق احمد وانی نے جہاں اردو افسانہ نگاری میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے تو وہیں اُنھوں نے تحقیق کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' ہو یا ''اردو ادب میں تانیثیت'' دونوں میں اُن کے تحقیقی و تنقیدی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ

تحقیق میں معتبر حوالے وحواشی سے اپنی تحریروں کو جاندار بناتے ہیں اور تحقیق اُن کی نظر میں سچ کا کاروبار ہے۔اسی طرح اگراُن کی تنقیدی تحریروں کی بات کریں تو وہ تاثراتی اور نفسیاتی تنقید میں خاصے ماہر نظر آتے ہیں ۔اُن کے بہت سے تحقیقی وتنقیدی مضامین میں ربط وتسلسل اور زبان وبیان کی چاشنی کے علاوہ دلائل وشواہد کا ارتکاز نظر آتا ہے۔

بہر حال مشتاق احمد وانی کی ادبی کائنات کے بارے میں یہ کہنا لازمی سمجھتا ہوں کہ اُن کے افسانے ہوں یا تحقیقی وتنقیدی مضامین، وہ ادبیت سے پُر اور بصیرت کا اک جہاں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔مشتاق احمد وانی اپنی عملی زندگی میں ایک محنتی، باذوق،شریف النّفس ،خوددار اور ایک باغ و بہار شخصیت کا نام ہے جس نے اسلامی کلچر وتہذیب کی اہمیت وافادیت کو سمجھا ہے اور انسانی اقدار وروایات کی عظمت اُس کے رگ وریشے میں رچ بس چکی ہے۔وہ ادب کے ذریعے عالمی امن و بھائی چارے کو فروغ دینے کا خواہاں ہے۔رنگ ونسل ،بھید بھاؤ،علاقائیت ،مذہب ودھرم کے جھگڑوں سے اُسے نفرت ہے۔وہ پوری دنیا کے لوگوں کو اپنے خاندان کے افراد کی طرح سمجھتا ہے۔ایسا ادیب قابل رشک نہیں تو اور کیا ہے۔معاصر اردو ادب کو مشتاق احمد وانی جیسے ذہین ومتین ادیب کی اشد ضرورت ہے۔

Prof. Quddus Jawed
Former Head
Deptt. of Urdu
Central University
Kashmir
Mob.- 94190 10472

پروفیسرعبدالواسع

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے اردو زباں والو

دنیا کی زبان کو آٹھ خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان میں پانچ خاندانوں کی کوئی نہ کوئی زبان ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اسی لئے ہندوستان کو بھانت بھانت کی زبانوں کا ملک قرار دیا جاتا ہے۔اردو زبان ہند یوروپی خاندان کی زبان ہے۔جس کو آریائی خاندان بھی کہتے ہیں۔ یہ خاندان بنیادی طور پر آریاؤں کی زبانوں کا خاندان ہے۔ یہ زبانیں ہندوستان سے لے کر یورپ کے مما لک میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں اردو کے علاوہ ہندی، آسامی، بنگالی، اڑیہ، پنجابی، گجراتی اور مراٹھی سب کا تعلق اس خاندان سے ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کے خاندان میں اس خاندان کی زبانوں کا دائرہ وسیع تر ہے۔

اردو اور ہندی زبانیں لگ بھگ ایک ساتھ عالم وجود میں آئیں اور ان کے بولنے والوں کا دائرہ بھی ایک ہی ہے۔ یہ زبانیں ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہیں۔اور ان کا حلقہ اثر بھی ایک ہی ہے۔ دونوں زبانوں کے افعال لگ بھگ ایک ہیں۔ان کے ضمائر اسم اشارہ اور حروف عطف بھی ایک ہیں۔ اردو زبان فارسی اور عربی زبانوں کے انسلاک سے زیادہ سہل سادہ، شیریں اور عام فہم ہوتی گئی جبکہ ہندی زبان سنسکرت زبان سے منسلک ہونے کے باعث اردو کی طرح عام فہم اور شیریں نہیں ہوسکی۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان عوام سے قریب ہوگئی مگر سنسکرت سے قریب رہنے کی وجہ سے ہندی عام فہم نہیں ہوسکی اور دونوں زبانوں میں دوریاں بڑھتی گئیں۔ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے مد مقابل ہوگیں۔ یہ بات ہندی زبان والوں کو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ ابتدا سے یہ ثابت کرنے میں لگے رہے کہ اردو ہندی زبان کی متعدد شیلیوں میں ایک ہے۔ یہ بات مظفر پور کے اجودھیا پرساد کھتری نے اپنے ایک رسالے میں لکھی تھی۔ تب سے اردو کے وجود کو ہندی میں ضم کرنے کی سازش چل پڑی ہے۔حالانکہ اردو والے مصالحت کی کوششوں میں لگے رہے مگر ان کی ایک بھی نہ چلی۔ یہاں تک کہ اردو کے عظیم شاعر فراق گورکھپوری کو گیان پیٹھ ایوارڈ اس وقت تک نہیں ملا جب تک انہوں نے اردو کو ہندی کی شیلی قرار نہیں دیا۔ اگر چہ اردو زبان والوں نے مصالحت کی بہت کوششیں کیں مگر سب بے سود ہوئیں۔ سر سیّد احمد خاں نے اردو اور ہندی زبانوں کو ایک

خوبصورت عورت کی دو آنکھیں کہا۔ ڈاکٹر عبدالحق اور گاندھی جی کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ ہندوستان کی رابطے کی زبان ہندوستانی ہوگی اور وہ دو رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں۔ چنانچہ انہوں نے دہلی سے ایک رسالہ بھی نکالا جس کا نام ''ہندوستانی'' تھا اور ہندوستانی اکیڈمی نام کا ایک ادارہ بھی قائم کیا۔ مگر ہندوستان کے رابطے کی زبان کا بل جب پارلیامنٹ میں پیش ہوا تو اس میں ہندی زبان کی بات کی گئی تھی اور ہندوستانی کا نام نہیں تھا۔ اس واقعے نے ڈاکٹر عبدالحق کو بہت مایوس کیا اور انہوں نے ہندوستانی اکیڈمی کو بند کیا اور پاکستان ہجرت کر گئے۔ افسوس اس وقت گاندھی جی زندہ نہیں تھے۔ جن کو ان کے معاہدے کی یاد دلاتے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہندی کو رابطے کی زبان بنانے کا بل جب پارلیامنٹ میں پیش ہوا تو اس کی حمایت اور مخالفت میں مساوی ووٹ پڑے۔ چنانچہ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنا Casting ووٹ ہندی کے حق میں دیا اور بل منظور ہوا۔ غور کرنے والی بات یہ ہے کہ تمام مسلم ممبران پارلیامنٹ نے ہندی کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ حسرت موہانی سے جب دریافت کیا گیا کہ ہندی کے حق میں ووٹ ڈالنے کے پیچھے آپ کی غرض و غایت کیا تھی۔ تو جواب ملا کہ ہندی کی ترقی میں اردو کی ترقی ہے اس لئے ہندی کے حق میں ووٹ ڈالا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ہندی بڑی مچھلی ہوگئی اور وہ اردو کو اپنے میں ضم کرنے کی کوشش میں دل و جاں سے لگ گئی۔ اردو زبان کی پیدائش کا علاقہ میرٹھ سے دلی تک کے علاقے کو قرار دیا جاتا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اتر پردیش میں اسکولوں کے نصاب سے اردو کو خارج کر دیا گیا۔ یہ کام وہاں کے پہلے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت اور دوسرے وزیر اعلیٰ سمپورنانند جی کے ذریعہ انجام دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو بولنے والوں کی دو نسلیں اردو رسم الخط سے محروم ہوگئیں۔ ایک موقع سے محرم میں میں الہ آباد میں تھا۔ پروفیسر جعفر رضا کے اصرار پر میں ایک مجلس میں شامل ہوا۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مرثیہ یا نوحہ مسلم بچیوں نے دیوناگری رسم الخط میں لکھ کر لایا تھا۔ وہ تو بھلا ہو غیر کانگریسی سرکار کا جس نے اردو زبان و ادب کو کسی قابل سمجھا اور اس کی ترویج و اشاعت کے تعلق سے نرم رویہ اختیار کیا۔ ورنہ اردو زبان کو تو اس کی جائے پیدائش میں ہی دفن کرنے کا منصوبہ تھا۔

ہندوستان میں بود و باش کرنے والوں کے بارے میں سر سیّد احمد خاں نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں تین قومیں رہتی ہیں۔ ہندو، مسلمان اور سکھ ہندو قوم کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے وہ اس کی پلاننگ پچاس سال قبل کرتے ہیں اور جب کام کو سرانجام دینے کا وقت آتا ہے تو وہ کام بحسن و خوبی انجام پذیر ہو جاتا ہے۔ مسلمان خواب غفلت میں پڑے رہتے ہیں اور جب کام سر پر آجاتا ہے تو بیدار ہوتے ہیں اور پوری طاقت سے اس کو انجام دینے میں لگ جاتے ہیں اور کچھ کر گزرتے ہیں۔ اردو زبان کو ہندی میں ضم

ISSN : 2582 - 3612

کرنے کے تعلق سے مجھے سر سیّد احمد خاں کی یہ بات سچ ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ غور فرمائے کہ آزادی سے بہت قبل اجودھیا پرساد کھتری نے اردو کو ہندی کی متعدد شیلیوں میں ایک شیلی قرار دیا تھا۔ اردو ہندی سے الگ اس لئے ہے کہ اس کا رسم الخط ہندی کے رسم الخط سے الگ ہے۔ دوسرے فرق شمار کے لائق نہیں یہی وجہ ہے کہ گیان چند جین نے لکھا ہے کہ کوئی اردو والا یہ عہد کر لے کہ وہ فارسی اور عربی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کرے گا۔ اس کو اپنے مدعا کے اظہار میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوگی جبکہ کوئی اردو والا تہیہ کرے کہ وہ ہندی کا استعمال نہیں کرے گا تو وہ ایک جملہ بھی نہیں بول سکتا ہے۔

اردو زبان و ادب کی اس صورتحال کے لئے اردو والے کم ذمہ دار نہیں ہیں۔ زبان کتابوں، رسالوں اور جریدوں سے زندہ نہیں رہتی ہے۔ بلکہ وہ عوام کے ذریعہ زندہ رہتی ہے۔ چودھری چرن سنگھ جب وزیر اعظم تھے تو ایک پرائیویٹ بل پارلیامنٹ میں پیش ہوا تھا۔ جس کی رو سے سارے ہندوستان میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ بل نامنظور ہو گیا مگر چودھری چرن سنگھ نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے جو تقریر کی وہ بہت درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اردو زبان کو عوامی زبان بنائے۔ اسے کھیت کھلیانوں میں لے جائے بازار ہاٹوں میں لے جائے وہ خود بخود ہندوستان میں رابطے کی زبان ہو جائے گی۔

آج اردو زبان و ادب کے تعلق سے ہم اردو والوں کی ذمہ داری بھی کم نہیں ہے۔ ہم نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے کیا کیا ہے؟ مجھے کہنے دیجئے کہ ہم نے اس جانب کوئی کام نہیں کیا بلکہ اردو زبان و ادب کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ آزادی سے قبل عثمانیہ یونیورسیٹی میں دارالترجمہ کا شعبہ تھا جو دوسری زبانوں کے الفاظ کو اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ کرتا تھا۔ آزادی کے بعد وہ شعبہ بھی بند ہو گیا۔ آج کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو وضع اصطلاحات کا فرض انجام دے۔ چنانچہ انگریزی کے بیشتر الفاظ اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں اردو میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندی زبان میں روز نئے نئے، الفاظ اصطلاحیں گڑھی جا رہی ہیں۔ میں صرف ایک لفظ Example پیش کرتا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ اس سے ہندی میں کتنے الفاظ وضع کئے گئے ہیں جبکہ اردو میں بمشکل ایک دو الفاظ ملیں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کا دائرہ تنگ ہو رہا ہے۔ جبکہ ہندی کا دائرہ وسیع تر ہو رہا ہے۔ آج اردو پڑھنے کے لئے بہت کم لوگ تیار ہیں اور سائنس و ٹکنالوجی کی طرف ان کا دھیان زیادہ ہے۔ اس لئے اردو زبان اردو والوں کے گھروں سے نکلتی جا رہی ہے۔ یہاں ایک ذاتی واقعہ میں عرض کرنا چاہوں گا۔ میں نے اپنے بچوں کو اردو زبان خود پڑھایا تھا اور وہ اچھی اردو لکھتے تھے مگر جیسے ہی ان کا داخلہ انجینئرنگ کالج میں ہوا۔ وہ اردو سے دور ہو گئے۔ چنانچہ مجھ سے الگ ہونے کے بعد ان کا پہلا خط انگریزی زبان میں ملا۔ میں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

نے اس کی شکایت ان کی والدہ سے کی۔ غالباً انہوں نے یہ بات ان سے کہی جواب ملا کہ والد صاحب اردو کے پروفیسر ہیں۔ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور نکال دیں گے جبکہ انگریزی زبان میں سب چلتا ہے۔ یہ بات انہوں نے بہت درست کہی کیونکہ ع

آتی ہے اردو زباں آتے آتے

قصہ مختصر یہ کہ اردو زبان و ادب کے شیدائیوں کا حلقہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی زبان و ادب کا دائرہ وسیع تر ہو رہا ہے۔ اس صورتحال میں اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے۔ یہاں میں ایک بات کا انکشاف اور کرنا چاہتا ہوں کہ ابتداء میں ایل۔ ایس۔ کالج میں عربی اور فارسی کا شعبہ تھا۔ جس میں بابو اودھ بہاری سنگھ اور عبدالماجد امجھر وہوی جیسے اساتذہ مقرر ہوئے۔ دونوں عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ پہلے عربی کا شعبہ بند ہوا پھر فارسی کا شعبہ آخری سانسیں لے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا انجام سامنے ہے۔ اس پس منظر میں اردو کا شعبہ کب تک رہے گا کہنا مشکل ہے۔ وہ تو مدرسوں کے فارغین کا داخلہ ہو جاتا ہے تو فارسی اور اردو شعبوں میں کچھ طلبا مل جاتے ہیں۔ مگر یہ کب تک؟ معلوم ہونا چاہئے کہ مدرسوں میں بھی میتھ اور سائنس کی تعلیم پر حکومت کا زور ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتحال میں جن مضامین کے پڑھنے سے روزی روٹی کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ طلبا کا جھکاؤ اس طرف کیوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ آج سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ مجھے تو خوف ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی ایک روز انسانوں کو ان کے لئے جگہ خالی کرنے کا تقاضہ نہ کرے اور عام انسان کی جگہ سائنس اور ٹکنالوجی لے لے۔

اخباروں اور رسالوں میں کبھی کبھار پڑھنے کو مل جاتا ہے کہ یو۔ کے، کناڈا، برازیل، دوبئ وغیرہ میں مشاعرے ہوئے، کوئی رسالہ نکلا، ہم بہت خوش ہوتے ہیں مگر معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کام وہی حضرات سر انجام دے رہے ہیں جو ہندوستان یا پاکستان سے گئے ہیں اور اردو کے شاعر و ادیب رہے ہیں۔ اس لئے اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے یہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔ چنانچہ یہ سرخوشی انہی کے ساتھ چلی جائے گی۔ بنگلہ دیش میں ایم۔ اے تک اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر فارسی رسم الخط کے علاوہ بنگلہ رسم الخط میں بھی امتحان کا جواب دینے کی اجازت ہے۔ نتیجتاً بنگلہ رسم الخط میں جواب دینے والوں کی تعداد ۹۴ ؍فیصد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال اردو زبان و ادب اور اس کے رسم الخط کے لئے بہت تشویشناک ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ اردو زبان کی اصل پہچان اس کا رسم الخط ہے۔ اگر رسم الخط کو چھوڑ دیجئے تو اس میں اور ہندی زبان میں بہت فرق نہیں رہے گا اور واقعتاً اردو ہندی زبان کی شیلی ہو جائے گی۔

اس صورتحال میں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہم اردو زبان و ادب کے شیدائی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں یا اس کے سدّ باب کے لئے کوئی قدم اٹھائیں۔ اس تعلق سے میرے ذہن میں چند

ISSN : 2582 - 3612

اقدام ہیں جو ہم بہ آسانی کر سکتے ہیں:

۱۔ ہم اردو زبان کے شیدائیوں کا فرض ہے کہ نئی نسل کو اردو رسم الخط میں اردو کی تعلیم دیں۔ اگر اسکولوں میں اس کا نظم نہیں ہے۔ تو گھروں میں اس کا نظم کریں۔

۲۔ مدرسوں میں بھی اردو زبان پر خاص توجہ دینی چاہئے۔ عام اسکولوں کی طرح اس کو روزی روٹی کا ذریعہ نہ بنائیں۔

۳۔ خط و کتابت اردو زبان میں کریں۔

۴۔ ان ریاستوں میں جہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ سرکاری دفتروں میں درخواست وغیرہ اردو زبان میں لکھیں۔

۵۔ اپنے گھروں میں نیم پلیٹ انگریزی کی بجائے اردو میں لکھوائیں۔

۶۔ مدرسوں، سکولوں، کالجوں اور پوسٹ گریجوئیٹ میں اردو اساتذہ مشن کے طور پر کام کریں اور کوئی دارالترجمہ اور وضع اصطلاحات کی قسم کا ادارہ قائم کریں۔ تاکہ اردو کی کشتی ہندی کے سمندر میں غرقاب ہونے سے محفوظ رہ سکے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے جو باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھی ہیں، وہ بہت تلخ ہیں۔ مگر مجھے اس تلخ نوائی کے لئے معاف فرمادیں۔ کیونکہ آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا میں میں نے آپ حضرات کی جو سمع خراشی کی ہے، وہ اسی درد کا اظہار ہے۔

Prof. Abdul Wasey
Karar Ki Bari
Chandwara
Muzaffarpur- 842 001
Mob.- 94300 51490

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

پروفیسر محمد کاظم

مشرف عالم ذوقی کے ایک اہم ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' کا ایک اہم کردار

اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اردو فکشن میں ابال سا آ گیا۔ ایک ساتھ اردو افسانے کے کئی مجموعے اور دسیوں ناول منظر عام پر آئے۔ ان افسانوں اور ناولوں نے نہ صرف اپنی موجودگی کا احساس دلایا بلکہ گرما گرم بحث کا سلسلہ بھی شروع کرنے کی دعوت دی۔ ایک سانس میں ہی دسیوں ناول کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں کئی چاند تھے سرِ آسماں (شمس الرحمٰن فاروقی)، لے سانس بھی آہستہ، آتش رفتہ کا سراغ (مشرف عالم ذوقی)، پلیتہ (پیغام افاقی)، فسوں، وشو منتھن، مم، شوراب اور مانجھی (غضنفر)، موت کی کتاب (خالد جاوید)، ایک ممنوعہ محبت کی داستان، خدا کے سائے میں آنکھ مچولی اور نخلستان کی تلاش (رحمٰن عباس)، میرے نالوں کی گمشدہ آواز (محمد علیم)، جہاد، عزازیل (یعقوب یاور)، سانسوں کا سنگیت (رتن سنگھ)، جنگ جاری ہے، دروازہ ابھی بند ہے اور ایک بوند اجالا (احمد صغیر)، آنکھ جو سوچتی ہے (کوثر مظہری)، آٹرم لائن (نیلوفر) وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان ناولوں میں مشرف عالم ذوقی کا تازہ ترین ناول دوسرے ناولوں سے مختلف ہے۔ یہاں اس ناول کے کرداروں میں سے صرف ایک کردار پر گفتگو کو مرکوز ہے۔

یکم اپریل 1962 کو بہار کے آرا میں پیدا ہونے والے مشرف عالم ذوقی 1980 کے بعد کے فکشن نگاروں میں ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے ناول اور افسانے دونوں بہت لکھے اور بہت خوب لکھے۔ ان کے فکشن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی ہے۔ انھوں نے ماضی اور حال کو نہایت فنکاری سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی تکنیکی ترقی اور اس سے پیدا ہونے والے مثبت و منفی تہذیب و ثقافت کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ کئی ناول اور افسانے تو اسی کو موضوع بنا کر لکھے گئے ہیں۔ ان کے دو درجن سے زیادہ ناول اور افسانوی مجموعے شائع کر مقبول ہو چکے ہیں جن میں ''نیلام گھر (1992)، بھوکا ایتھوپیا (1993)، بیان (1995)، شہر چپ ہے (1996)، ایک انجانے خوف کی ریہرسل، غلام بخش اور دیگر کہانیاں (1998)، صدی کو الودا کہتے ہوئے (2000)، ذبح (2000)، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے (2003)، پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی داستان وایا

ISSN : 2582 - 3612

سونامی (2005)، لے سانس بھی آہستہ (2011)، نفرت کے دنوں میں (2013)، آتش رفتہ کا سراغ (2013)، منڈی، مسلمان (2014)، سلسلۂ روز و شب (2014) اور عقاب کی آنکھیں (2014) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے افسانے کے علاوہ ڈراما، طویل نظم، فکشن پر تنقید اور مختلف ٹیلی ویژن کے لیے لاتعداد اسکرپٹ لکھے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے لکھا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ نوجوان قلم کار سامنے آئیں اور اس کی وہ عملی سطح پر کوشش بھی کرتے تھے اور تحریک بھی دیتے تھے۔ کوئی نوجوان ان کے پاس جاتا تو فکشن کی تربیت کے ساتھ ساتھ چند کتابیں لے کر ضرور واپس آتا۔ انھوں نے محفلوں میں بھی فکشن لکھنے کی ترغیب دینے کا کام کیا۔ کئی محفلوں میں میں نے خود دیکھا ہے کہ انھوں نے نوجوانوں سے چند الفاظ لیے اور پوڈیم سے ان الفاظ پر مبنی افسانہ سنانا شروع کر دیا۔ اس افسانے کے فن پر ان کی گرفت کا علم ہوتا ہے تو ان کے تخلیقی ذہن کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ انھوں نے کبھی کسی ازم یا گروہ سے خود کو وابستہ نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے کبھی اپنے قلم کا سودا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو نظر انداز کر کے ان سے کم تر اور غیر معیاری فکشن کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ ان کے فن کا ابھی ایمانداری سے محاسبہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ ابھی ان کا قلم رواں تھا کہ ۱۹/اپریل 2021 کو وہ ہم سب کے حوالے اپنے فکشن کا سرمایہ چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

اس سے پہلے کہ ناول '' آتش رفتہ کا سراغ'' کے کردار پر گفتگو کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ جان لیں کہ کردار ہوتا کیا ہے اور ایک اہم اور کامیاب کردار کی خوبی کیا ہوتی ہے۔

پلاٹ کو پیش کرنے کے لیے کردار کی ضرورت پیش آتی ہے اور ہر کردار اپنی تعلیم، ماحول، نفسیات، سماج، تہذیب، اور ثقافت کو اپنے ساتھ لیے ہوتا ہے۔ کسی فن پارے کے ایسے کردار جن کی گفتگو، افعال، حرکات و سکنات اور جذباتی حالت کے اظہار میں زندگی کی حقیقی عکاسی پائی جاتی ہو یا جن میں ایسی ہمہ گیری ہو کہ جو زمانہ اور وقت گزر جانے کے باوجود انھیں زندہ رکھ سکے، اسے نہ صرف معیاری بلکہ متحرک اور زندہ کردار کہا جا سکتا ہے۔ کردار میں انفرادیت کے باوجود ایک ایسی عمومیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سماج کے کسی طبقے کی روایات و نظریات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس کا مزاج اپنے عہد اور معاشرے سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

زمانے کے تغیر ماحول کی تبدیلی، کسی واقعے، حادثے یا انقلاب سے متاثر و متبدل ہونے والے کردار ارتقائی کردار کہلاتے ہیں۔ جو شروع سے آخر تک ایک ہی ڈھرے پر رہیں جن کے اندر کسی اثر کو قبول کرنے اور تغیر پذیر ہونے کی صلاحیت نہ ہو وہ جامد ہوتے ہیں۔ کسی بھی فن پارے کے لیے ارتقائی کردار ہی مستحسن مانے جاتے ہیں۔

کردار نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کرداروں کی زبانی ایسی گفتگو پیش کی جائے جو ان کی

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

فطرت، ماحول اور معاشرت کے مطابق ہو۔ جو کردار جس طبقے یا سماج سے تعلق رکھتا ہو زبان بھی اس کے مطابق ہو۔ مختلف طبقوں اور گروہوں کے لوگوں کی گفتگو سے ان کا طبقاتی فرق بھی ظاہر ہو۔ کردار صرف آپس میں گفتگو نہ کرے بلکہ پلاٹ کو آگے بڑھائے۔ کردار موقعہ و محل کی موزونیت و مناسبت کے ساتھ ساتھ اپنے مرتبے و ماحول کے مطابق گفتگو کرے۔

کرداروں کی نفسیات و جذبات کو نمایاں کر کے ان کی شخصیت کو موثر بنانے میں تین صورتیں معاون ہوتی ہیں :

(الف) کسی کردار کی دوسرے کردار سے گفتگو

(ب) کسی کردار کے بارے میں دو کرداروں کا اظہارِ خیال

(ج) واقعات اور تخلیق کی اندرونی فضا سے کرداروں کی شخصیت پر روشنی پڑنا۔

اس روشنی میں مشرف عالم ذوقی کے تازہ ترین ناول 'آتش رفتہ کا سراغ' پر نظر ڈالتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اس کا مرکزی کردار تو وقت ہے جو پچھلے 65 برسوں سے مسلسل ایک بڑی اقلیت کو دہشت اور خوف کی وادیوں سے گزرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے اس کہانی کا راوی ارشد پاشا واقعات و حادثات کی ستم ظریفی کا نہ صرف شکار ہوتا ہے بلکہ ایک ناقابل فراموش سفر کا گواہ بھی بن جاتا ہے۔

ہم سب واقف ہیں کہ آزادی کے بعد جو ہندستان ہمارے سامنے آیا، اس کی بنیاد کا گارا انسانوں کے لہو سے تیار کیا گیا تھا۔ اور اس عمارت کی تعمیر کے دوران کتنے فساد، کتنے ہی لہو آگیں موسم، کبھی بابری مسجد کی شہادت اور گودھرہ جیسا خوفناک حادثہ تو کبھی مذہب کے نام پر نفرت و تشدد کے مظالم اور ۶۵ برسوں میں ان واقعات کے درمیان سہا ہوا مسلمان —— فرضی انکاؤنٹرس کی کہانی اور پہلی بار بھگوا آتنک واد کا انکشاف —— اسی مناسبت سے ذوقی نے اپنے تازہ ترین ناول میں کردار و واقعات کا ایسا کولاژ تیار کیا ہے جو ہر قدم پر ایک نیا واقعہ کے پیش آنے اور اس کا انکشاف ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مطالعے کے دوران ابتدا میں جو دشمن دکھتا ہے وہ دوست نکلتا ہے اور جسے دوست سمجھ کر بھروسہ کرنے کو جی چاہتا ہے، وہ دشمن۔ اور ان کے درمیان آزاد ہندستان کا ایک ڈرا ہوا مظلوم کردار ارشد پاشا جو بنارس سے اپنی بیوی رباب اور ننھے بیٹے اسامہ پاشا کے ساتھ دلی کے ایک ایسے علاقے میں آکر قیام کرتا ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اور جسے بٹلہ ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور اسی بٹلہ ہاؤس سے ایک بے رحم کہانی کی شروعات ہو جاتی ہے۔

اس کہانی میں بہت سے کردار آتے ہیں جن میں کچھ تو Sterio Type ہیں اور کچھ نئے اور انقلابی۔ ان میں ایک کردار پہلی بار اردو ناول میں پیش کیا گیا ہے جو جیسا دکھتا ہے ویسا ہوتا نہیں۔ ایسے

ISSN : 2582 - 3612

کرداروں کی کمی اس ناول میں نہیں ہے۔ خواہ وہ پولس کی وردی میں ہو یا کسی تنظیم کے رکن کی شکل میں، وہ سماجی کارکن نظر آتے ہوں یا مذہبی پیشوا۔

ناول آتش رفتہ کا سراغ میں بہت سے کردار ہیں ان میں سے ایک اہم کردار ہے اجے سنگھ تھاپڑ کا۔ تھاپڑ ارشد پاشا کا بنارس کے دنوں کا گہرا دوست ہے جو اب دہلی ہی میں مقیم ہے۔ تھاپڑ اور ارشد بنارس کے ماحول میں گزارے حسین دنوں کی یادگار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دہلی میں ارشد کا سچا دوست کوئی ہے تو وہ صرف تھاپڑ ہے۔ ارشد تھاپڑ کی موجودگی میں اپنے مذہب والوں کو بات کرتے ہوئے کتراتے پران سے کہتا ہے کہ یہ ہمارے محسن ہیں، ان سے کیا راز۔ یہی وجہ ہے کہ بٹلہ ہاؤس کی پلیا پر ان کے بچوں کے ساتھ پولس کے ذریعے کی گئی زیادتی پر جب لوگ ان سے باتیں کرتے ہیں تو تھاپڑ موجود رہتا ہے۔ پہلے لوگ دل کی بات کہنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں لیکن بعد میں ارشد کے کہنے پر مسجد کے پیش امام تک بلا جھجک بتاتے ہیں کہ جو واقعہ ہوا اچھا نہیں ہوا۔ پولس ان بچوں کی آڑ میں کوئی نازیبا کام بھی کر سکتی ہے۔ محض ایک چھوٹا سا واقعہ یا حادثہ آنے والی تاریخ میں ایک بڑے ہنگامے کا گواہ بن سکتا ہے۔ اور تھاپڑ ان کی حمایت کرتے ہوئے نہ صرف ان کی گفتگو میں شامل ہوتا ہے بلکہ ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر ان کا ہمدرد بن جاتا ہے۔ تھاپڑ کے خیالات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

> ''تھاپڑ سوچ میں گم تھا۔۔ 'کتنی عجیب حقیقت ہے ارشد پاشا۔ محض ۱۴۔۱۵ برسوں میں اس ملک میں دو ہزار سے زیادہ انکاؤنٹر ہوتے ہیں اور ان میں ہر دوسرا انکاؤنٹر فرضی ہوتا ہے۔ پولیس انکاؤنٹر کے بعد پولیس کا پہلا کام ہوتا ہے اس انکاؤنٹر کو صحیح ثابت کرنا۔ اور پولیس اپنے ذرائع اور جبر سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانا اچھی طرح جانتی ہے۔ فرضی انکاؤنٹر کرنے والے پولیس والوں کو سزا اس لیے نہیں ملتی کہ ان کی جانچ کا کام بھی پولیس والوں کو سونپا جاتا ہے۔
>
> تھاپڑ نے ایک گندی سی گالی بکی۔۔ یہ ہے ہمارے ملک کا کرپٹ سسٹم۔ گجرات کے ہتیاروں کو اسی ملک میں ترقی کے نام پر نائک بنایا جا رہا ہے۔ وہاب الدین فرضی انکاؤنٹر کا ہی معاملہ لو۔ شروع میں جب یہ انکاؤنٹر سامنے آیا تھا تو یہی میڈیا تھا جس نے وہاب الدین کو پورے ملک کا ہیرو بنا دیا تھا۔۔ لیکن جانچ کے دائرے میں اعلی پولیس افسران اور سرکاری مشنریاں بھی شامل تھیں۔۔ کچھ نہیں ہوتا اس ملک میں۔ عربوں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کھربوں کے گھٹالے تک چھپا دیے جاتے ہیں۔ چار دن آگ لگتی ہے
پانچویں دن سب ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔۔بس گرم ہے ایک چیز۔۔آتنک
واد۔۔مسلم آتنک واد۔۔''

(صفحہ ۱۳۴)

ناول کے ابتدائی حصے میں تھاپڑ وقفے وقفے سے ہی آتا ہے۔ تھوڑی دیر رہتا ہے اور پھر غائب ہوجاتا ہے۔ تھاپڑ ایک سچ بولنے والا سیکولر کردار دکھائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ان کرداروں میں سے ایک ہے جو ہر قیمت پر سچ اور صرف سچ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کے اندر جانبداری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے اس کا جھکاؤ مسلمانوں کی حمایت کی جانب بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس جھکاؤ کی وجہ تو ناول کے آخر میں معلوم ہوتی ہے۔ یہاں ایک مسلم حمایتی کے طور پر مسلمانوں کا مسیحا دکھائی دیتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی حفاظت اور اپنے دوست ارشد پاشا کی مدد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ جب بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر ہوتا ہے تو ارشد کے بیٹے اوسامہ کو اپنے گھر میں رکھتا ہے۔ اس کا خیال اپنے بیٹے کی مانند رکھتا ہے۔ اس انکاؤنٹر کو فرضی کہتے ہوئے اپنی ناراضگی کا اظہار کھلے لفظوں میں کرتا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں :

''آٹھ بجے تک تھاپڑ آگیا۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اس نے سسٹم کو ایک سڑی ہوئی گالی دی۔ 'تیری ماں کی۔۔ کیا لگتا ہے انھیں؟ اس پورے علاقے کے آپریشن کی وجہ کیا تھی؟ کیوں کہ یہ علاقہ مسلمانوں کا ہے؟ یہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے؟ اور وہ ساری دنیا میں یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا ہر مسلمان آتنک وادی ہے؟ جس محلے میں مسلمان زیادہ رہتے ہیں وہاں صرف کٹر وادروش ہے؟ اور یہ کٹر واد ملک کی سالمیت اور جمہوری قدروں کو توڑتی رہتی ہے؟ تم نہیں سمجھوگے ارشد پاشا۔۔ دراصل یہ ہندو سنگٹھنوں اور مہاسبھاؤں کی وہ آگ ہے جس نے اب سارے دیش کو جلانا اور سلگانا شروع کیا ہے۔ سیمی یا انڈین مجاہدین کا آسانی سے نام لینا ان کی سمجھ میں تو آتا ہے لیکن ایسے ہزاروں ہندو اگروادی سنگٹھن ہیں، ان کا نام ان کی زبان پر کیوں نہیں آتا۔۔؟''

(صفحہ ۱۸۸)

تھاپڑ اپنا یقین مزید مضبوط کرنے کے لیے کہتا ہے :

ISSN : 2582 - 3612

'تھاپڑ نے لمبی سانس لی۔۔' کبھی کبھی اس ملک کو گالیاں دینے کی خواہش ہوتی ہے۔۔اس ملک میں گاندھی کی پوجا ہوتی ہے۔۔اور گاندھی وچاروں کو گالیاں ملتی ہیں۔۔گاندھی پر فلمیں بنتی ہیں۔ ہر حکومت گاندھی واد اور گاندھی جیسی شخصیت کو بیچنے میں لگی رہتی ہے۔۔اس گاندھی کے لیے جس کی نظر میں ہندو مسلم دو آنکھوں کی طرح تھے۔۔لیکن کیا ہو رہا ہے۔۔؟ ایک بڑی آبادی اقلیت بنادی گئی ہے۔ ایک بڑی آبادی سوالوں کے گھیرے میں ہے۔۔اس سے وفاداری اور حب الوطنی کی امید کی جاتی ہے اور دوسری طرف مسلسل دہشت گردی اور اسلامک آتنک واد کے نعروں کے درمیان ایک پوری قوم کو کمزور اور دبو بنائے جانے کا کھیل جاری ہے۔''

(صفحہ ۲۲۹)

اس طرح تھاپڑ نہ صرف ارشد پاشا بلکہ تمام مسلمانوں میں ان کا ہمدرد اور حمایتی کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ اب نہ صرف ارشد بلکہ اکثر مسلمان اپنے مسائل ان سے بیان کرتے ہیں۔ ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ تھاپڑ اتنے دنوں سے مسلمانوں کے درمیان رہ رہا ہے کہ اسے ان کے مسائل، ان کی طاقت اور ان کی کمزوریوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ کس وقت کیا کہنا اور کرنا چاہیے۔ اپنے عقل کے استعمال، وقت کی ضرورت یا اس سے تجربہ حاصل کرکے، یا ان مشاہدات کی مدد سے تھاپڑ اپنے اصل مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا رہتا ہے۔ دراصل وہ ایک مشن پر مامور ہوتا ہے۔ اور وہ مشن کچھ اور نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت اور مذہبی فریضہ ورسوم کی جانکاری حاصل کرنا ہے۔ ان کے ان مقاصد پر ہلکی سی روشنی اس وقت پڑتی ہے جب مسلمان علوی کے ابو کے انتقال کے بعد احتجاج کرتے ہیں اور تھاپڑ کو اس کا علم پہلے نہیں ہوتا ہے تو گویا وہ غصے سے پھٹ پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ غصے میں آدمی کا اصل رنگ سامنے آجاتا ہے اور تھاپڑ کے ہوشیار رہنے کے باوجود اس کے اصلی رنگ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ راشد اور تھاپڑ کی ٹیلی فون پر ہو رہی گفتگو آپ بھی سنیں :

''گناہ یہ ہے کہ لاش بول نہیں سکتی۔ کیا پچیس کروڑ کی آبادی ایک لاش میں تبدیل ہوچکی ہے، تم یہ کہنا چاہتے ہو۔

نہیں۔ پچیس کروڑ کی آبادی اب لاش میں تبدیل نہیں ہوگی۔ یہ کہنا چاہتا ہوں۔

ہونہہ۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھاگئی۔ جیسے تھاپڑ کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

چہرے پر فکر کی چادر تن گئی ہو۔
میرے لیے یہ تھاپڑ کا نیا چہرہ تھا۔
تھاپڑ کی آواز دوبارہ ابھری۔
اس کے باوجود ڈراما بٹلہ ہاؤس چوراہے پر کھیلا جا رہا ہے۔ میں اس کی حمایت نہیں کروں گا۔۔ اس طرح کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ اور انقلاب کے نمائندے کون ہیں۔ میر صاحب......
....تھاپڑ کی آواز کمزور تھی۔ 'پھر بھی میں کہتا ہوں یہ ٹھیک نہیں ہورہا۔ مسلمانوں نے احتجاج کے لیے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا۔ کیا اب بھی تم سمجھتے ہو کہ حکومت خود سے کوئی فیصلہ لے سکتی ہے اور دوسری پارٹیاں خاموش رہ جائیں گی۔''

(صفحہ ۶۸۷)

بنارس سے دلی تک کے سفر میں ارشد پاشا کا اجے سنگھ تھاپڑ پر یقین اور اعتماد اس قدر رہا کہ وہ جب جب پریشان ہوتا، اجے اس کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ اجے سنگھ تھاپڑ اس کے بھائیوں جیسا تھا۔ اور یہ بات ارشد پاشا جانتا تھا کہ جب تک اجے سنگھ تھاپڑ جیسے لوگ زندہ ہیں، کوئی بھی طاقت مسلمانوں کو پریشان نہیں کر سکتی۔ مگر آپ نے محسوس کیا کہ اس کا اعتماد تب ٹوٹتا ہے جب بٹلہ ہاؤس کے مسلمان بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اجے سنگھ تھاپڑ پراسرار طریقے سے کسی خفیہ مقام پر اسے ملنے کے لیے کہتا ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں قاری ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی سانسوں کو بکھرتے ہوئے محسوس کرتا ہے— اب تھاپڑ اپنا نقاب اتار کر اپنی اصلیت بیان کرتا ہے۔ دراصل تھاپڑ سنگھ کا نہ صرف اہم حصہ بلکہ اس کا ایک رہنما ہے۔ اور وہ ایک مشن کے طور پر مسلمانوں کے درمیان رہ رہا تھا۔ خود اس کے الفاظ دیکھیں :

''میں کالج کے دنوں سے ہی اس تحریک سے وابستہ تھا مگر میری وابستگی کی شکل مختلف تھی۔ میں نے سنگھ کو جوائن کرنے کے بعد ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مجھے مسلمانوں کو سمجھنے دیجیے۔ اس میں زندگی بھی گزر سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو سمجھنا ضروری ہے اور مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم بغیر مسلمانوں کو سمجھے اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ سنگھ کی طرف ہری جھنڈی ملتے ہیں میں اپنے کام میں لگ گیا۔۔۔ اور یقینی طور پر سنگھ مسلسل میرے کاموں پر نظر رکھ رہا تھا۔ پھر مجھے تم مل گئے..... مجھے ایک مسلمان کو مکمل طور پر جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک مسلمان گھر کی

ISSN : 2582 - 3612

ضرورت تھی۔ اور تم میری یہ مشکل آسان کیے جا رہے تھے.....''

(صفحہ ۶۹۴)

تھاپڑ مسلمانوں کے درمیان رہ کر نہ صرف خود تجربہ حاصل کر رہا تھا، ان کی کمزوریوں کو جان رہا تھا، ان کی قبر کھود رہا تھا بلکہ پابندی سے روز کی سرگرمیوں اور حالات سے اپنی تنظیم کو باخبر بھی کر رہا تھا۔ اکثر اسے پہلے ہی خبر مل جاتی اور لوگ خود ان سے مشورہ کیا کرتے۔ تھاپڑ کی اس اطلاع پر سنگھ میں روز مرہ کی کاروائی ہوتی اور لوگ اس مناسبت سے تیار کیے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح وقت پر مناسب کاروائی کی جاتی رہی تھی۔ وہ آگے بیان کرتے ہوئے اپنے بارے میں مزید بتاتا ہے :

'میں اپنی کیفیت، اپنے تجربے تحریری طور پر سنگھ کو دے رہا تھا اور میرا مقصد واضح تھا۔ آپ ایک جنگ اس وقت تک نہیں لڑ سکتے جب تک آپ ایک مسلمان فکر کو اندر اندر تک سمجھ سکنے سے محروم رہتے ہیں۔۔ میں نے کہہ رکھا تھا، میری زندگی اس تجربے میں ختم ہو جائے مگر میرے بعد یہ تحریریں سنگھ کے کام آئیں گی۔۔ کیوں کہ آزادی کے بعد کے مسلمانوں کو سمجھنا آسان کام نہیں۔ یہ کئی حصوں میں بٹے ہوئے لوگ ہیں۔ ایک بڑی آبادی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔۔۔ مڈل کلاس مذہب اور سیکولرزم کے درمیان پناہ تلاش کر رہا ہے۔ ایلٹ کلاس کے طبقے کی فکر الگ ہے۔ ایک نظام ایسا بھی ہے جہاں اسلام کی ترویج و ارتقا کے لیے باہر سے پٹرو ڈالر آرہے ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے تھے۔''

(صفحہ ۹۵-۶۹۴)

اب ارشد کو احساس ہوتا ہے کہ تھاپڑ اصل میں کون ہے اور ان کے درمیان وہ کیوں رہ رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کا حامی تھا یا دشمن۔ ارشد کے بیٹے اسامہ کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بعد اسے تلاش کرنے کی غرض سے ارشد کے ساتھ اسے تلاش کرنے کے لیے کیوں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھوم رہا تھا۔ گویا وہ دوست نما دشمن تھا۔ وہ مسلمانوں کے درمیان رہ کر ان کی قبر تیار کیا کرتا رہا ہے۔ ملک میں جتنے بھی بم بلاسٹ اور فسادات ہوئے ہیں ان میں ان کا پورا ہاتھ رہا ہے۔ درحقیقت اسامہ کی تلاش کے پیچھے تھاپڑ کا مقصد کیا تھا اس پر ان الفاظ سے روشنی پڑتی ہے :

''تھاپڑ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا— تمہارے بیٹے نے سب گڑبڑ کر دیا۔ وہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اسی راستے پر چلا، جس راستہ پر ہم چلے تھے۔ ہم اسے مار سکتے تھے۔ لیکن ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس نے وہ کیا، جو سو سال میں ہم نہیں کر پائے۔ اس نے ہندو تیرتھ استھانوں کو چنا — مندروں اور آشرم کو چنا — اور اپنی شناخت کے ساتھ ہمارے دھرم گروؤں کا دل جیتتا چلا گیا — سنگھ میں گھبراہٹ تھی۔ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔''

(صفحہ ٦٩٦)

ارشد تھاپڑ کے دفتر یعنی سنگھ کے تجربہ گاہ میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی خفیہ جگہ ہے جہاں عام لوگوں کا گزرنا ممکن ہے۔ وہ اس تجربہ گاہ کے جس حصے سے گزرتا ہے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہے۔ کہیں تمام میڈیا یا ہاؤس کے مالک موجود ہوتے ہیں جو اسی مرکز کے حکم پر اپنے چینل یا اخبار میں نیوز اور ویوز پیش کرتے ہیں تو کہیں تنظیم کے لیے ایسے ناموں کی تلاش کر رہے نوجوان کمپیوٹر کے اسکرین پر نظریں گڑائے ہوئے دکھائی دیتے جس کا استعمال اگلے کسی فساد، بلاسٹ، یا آتنک وادی حملے کی ذمہ داری لینے کو تیار رہے۔ کسی کمرے میں مسلمانوں کے مذہبی رسوم کی ادائیگی کا درس چل رہا ہوتا ہے تو کہیں تلاوت کلام پاک میں لوگ منہمک دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کمرے میں باجماعت نماز تک پڑھی جا رہی ہوتی ہے۔ ایسے مناظر پر ارشد کی نظر پڑنے پر تھاپڑ ان سے ملوانے کا وعدہ کرتے ہوئے ارشد کو لے کر ایک کمرے میں آجاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ لوگ اسی کمرے میں حاضر ہوتے ہیں تو تھاپڑ ارشد کو ان سے ملواتا ہے :

ان لوگوں سے ملو۔ یہ رابن ہے۔ یہ اروند پارلیکر۔ یہ ارجن رام دیو... یہ گنیش شریواستو... یہ سارے لوگ عربی جانتے ہیں۔ یہ سب اپنے اپنے کام میں ماہر ہیں۔۔۔ دراصل تم سے ملنے کے بعد....

تھاپڑ مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آیا........ سامنے کمرے میں ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے جماعت کھڑی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ یہ کوئی نماز کا وقت نہیں تھا۔

امامت کرنے والے شخص کی قرأت میری روح کو معطر کر رہی تھی۔

..... دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں تو اٹھارہ سے بیس لوگ تھے، جو کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے سر پر ٹوپیاں تھیں۔ پیشانی پر سیاہ نشان تھا، جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ قیامت کے روز یہاں سے نور پھوٹے گا۔ ان میں سے کچھ کے چہرے پر داڑھیاں بھی

تھیں۔ یہ ایک قطار سے کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔

گھبراؤ مت۔ آؤ ان میں سے کچھ کا تعارف کراؤں۔

یہ ورن ہے۔ ورن امامت کر رہا تھا..... یہ باگیشور، یہ گھنشیام، یہ سمت... یہ اروند.... ڈرومت۔ نماز صرف تم ہی نہیں پڑھتے۔ انھیں باضابطہ صحیح نماز پڑھنے کی ٹریننگ دی گئی ہے۔ اور ان کی ... پیشانی پر جو سیاہ داغ ہے وہ بھی نقلی نہیں۔ یہاں کچھ بھی نقلی نہیں ہے دوست۔ ہم انھیں اور یجنل اوسامہ... یعنی مسلمان بنا کر تمہارے درمیان اتار رہے ہیں۔

.... تو سنو ارشد پاشا۔۔۔... ہم تم میں گھل مل رہے ہیں... جیسے دودھ میں پانی گھل مل جاتا ہے۔۔ کیا دودھ میں پانی دیکھ سکتے ہو تم؟ ہم تم میں ایسے ہی گھل مل جائیں گے کہ تم اپنوں کی شناخت بھی نہ کر سکو۔ ہر جگہ ہر موڑ پر۔۔۔ ہم تمہارا سایہ بن کر ساتھ چلیں گے۔۔۔ تم ہمیں پہچان بھی نہیں سکو گے اور ہم تمہارا آسانی سے شکار کر سکیں گے۔''

(صفحہ ٦٩٨-٩٩)

ہم سب واقف ہیں کہ کس طرح سے ملک کے مختلف حصوں میں فساد کروائے گئے اور اس کمیں کس کا ہاتھ تھا۔ کئی شہروں کے اہم اور مذہبی مقامات پر بم بلاسٹ کروائے گئے اور تفتیش کرنے والی ایجنسیوں کو گمراہ کرنے کے لیے ٹوپی اور تسبیح رکھ دیے گئے۔ لیکن تفتیش کرنے والی ایجنسیوں نے بعض اوقات اور وقفے وقفے سے حقیقت کا انکشاف بھی کیا اور ایسے لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا۔ ان گرفتار کیے گئے افراد نے اقبالیے بیانات میں نہ صرف سنگھ کے ممبر ہونے یا ان کے ذریعہ کام کروانے کے بارے میں بتایا بلکہ ایسے ایسے رہنماؤں کی شمولیت کا انکشاف کیا جو ہماری قوم کے رہبر اور ایوانوں کے باعزت اور باوقار ممبرانوں میں شامل ہیں۔ ان گرفتار کیے جانے والوں میں مذہبی پیشوا ہیں تو قوم کے محافظ بھی شامل ہیں۔ قانون کے رکھوالے ہیں تو سماج کے معمار کہے جنے والے بھی ہیں۔ اور ان میں سے ہی ایک تھاپڑ دکھتے ہیں۔

اجے سنگھ تھاپڑ کے کارنامے انتہا پر اس وقت نظر آتے دکھائی دیتے ہیں وہ ارشد کی گھبراہٹ کو محسوس کرتا ہے۔ وہ اسے یہاں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اس یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ قوم اب بے جان ہو چکی ہے۔ اس کی ایک ایک حرکت پر اس کی نظر ہے۔ ان کے درمیان تھاپڑ کے اتنے لوگ مختلف صورتوں میں موجود ہیں کہ ان کی شناخت کر پانا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تھاپڑ اور ان جیسے لوگ آسانی سے ہمارا شکار کر لیتے ہیں۔ تھاپڑ کے حوالے سے ایک آخری ٹکڑا دیکھیں :

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''ڈرومت۔ جیسے تمہیں یہاں باعزت لایا گیا ہے۔ ویسے ہی ہم تمہیں یہاں سے باعزت باہر بھی نکالیں گے۔ اور ہمیں تم سے کوئی ڈر کوئی خطرہ نہیں ہے— دو باتیں ممکن ہیں۔ یا تو تم باہر کے لوگوں کو یہ باتیں بتاؤ گے۔ یا نہیں بتاؤ گے۔ نہیں بتاؤ گے، اس کی امید زیادہ ہے۔ کیونکہ کاشی سے دلی تک تم میں ایک نپنسک صحافی کو دیکھا ہے میں نے۔ اس صحافی کے پاس قلم بھی نہیں ہے۔ اور اگر تم بتاؤ گے تب بھی، ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیسے بتاؤ گے؟ کس کس کو بتاؤ گے۔ ممکن ہے تم جسے بتا رہے ہو، وہ تمہارے حلیے میں ہمارا ہی آدمی ہو...... وہ تمہارے لباس میں ہمارا ہو۔ تمہارے نام میں ہمارا ہو۔ تمہارے مذہب میں ہمارا ہوا......''

(صفحہ ۷۰۰)

اب اگر تھاپڑ کے کردار پر غور کرتے ہیں تو ایک ساتھ کئی دنیائیں ہمارے تعاقب میں نظر آتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں کس پلاننگ کے ساتھ کام کر رہی ہیں اور ان تنظیموں کی طاقت نہ جانے کتنے تھاپڑ ہیں۔ گزشتہ برسوں میں اس کی کئی مثال ہمارے سامنے آئیں ہیں۔ ظاہری طور پر ان کا کام اور کردار کچھ اور دکھائی دیتا ہے اور حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ بلکہ ایسی ایسی جگہوں پر تھاپڑ جیسے لوگ موجود ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح ناول آتش رفتہ کا سراغ میں پیش کیا گیا کردار اجے سنگھ تھاپڑ کو علامت کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے جو مختلف مقام اور اوقات میں مختلف صورت اختیار کر سکتا ہے لیکن ان کا کام اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ اور تھاپڑ اور ان کا سنگٹھن کس طرح سے کام کر رہا ہے اس کا انکشاف بھی مشرف عالم ذوقی نے اس کردار کی مدد سے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس ناول کے مطالعے کے دوران صرف ادبی نقطۂ نظر کو ہی ذہن میں نہیں رکھنا چاہئے بلکہ سماجی اور قومی ضرورتوں کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اب جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس میں دوست اور دشمن کی پہچان مشکل ترین ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں ہمیں اپنی آنکھیں ہر وقت کھلی رکھنی ہو گی تب شاید ہم دوست اور دشمن کی تفریق کو سمجھ پائیں گے اور اجے سنگھ تھاپڑ جیسے لوگوں کی شناخت کر سکیں گے۔

Prof. Mohammad Kazim
Deptt. of Urdu
University of Delhi
Delhi - 110007
Mobile: +91 9868188463

ڈاکٹر جمال اُویسی

ن۔م۔راشد کے تعلق سے چند باتیں

یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ ن۔م۔راشد نے اقبال کی طرح پس نوآبادیاتی افکار سے لیس اپنے خیالات نظموں کے ذریعہ پیش کئے اور یہ بھی کہ جس طاقت ور لہجہ کے ساتھ اقبال نے مغرب کے مشہور مفکرین کے خیالات کی تکذیب کی تھی، انہیں صداقت کا آئینہ دکھایا تھا، راشد نے بھی ایسا ہی کیا یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ راشد کے تعلق سے اردو تنقید میں بہت زیادہ مواد نہیں ملتا، سوائے گنتی کے ان چند مضامین کے جو شہریار اور مغنی تبسم کی مرتب کردہ کتاب میں موجود ہیں یا پھر جو اِکّا دُکا مضامین شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، وزیر آغا جیسے جدیدیت کے سربراہوں کے یہاں نظر آتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے راشد کے تعلق سے جو تنقیدی گفتگو ''شعر غیر شعر اور نثر'' میں اپنے ایک مضمون میں کی ہے اس کو بھی چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اب شاید ہی یہ مضمون تمام ذہنوں میں محفوظ ہو۔ حمید نسیم کے طویل مضمون کی یاد بھی اب باقی نہیں رہ گئی ہے۔ (حالانکہ اس مضمون میں کچھ نئے نکتوں کی طرف اشارے کئے گئے تھے) تاوقتیکہ یہ مضمون تنقیدی نوعیت کا کم، تاثراتی وانفرادی زیادہ تھا۔ البتہ شمیم حنفی صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''ن۔م۔راشد۔ زندگی کے مساوات میں ایک گمشدہ ہندسہ کی تلاش'' مجھے یاد آ رہا ہے جو ان کی کتاب ''قاری سے مکالمہ'' کا آخری مضمون تھا۔ یہ مضمون بہت سے دعووں اور ستائشوں سے بھرپور ایک خراج عقیدت ن۔م۔راشد کے نام ہے جس کا آخری جملہ بڑا چونکانے والا تھا :

''راشد کی شاعری ایک بڑے فکری اعتماد کے ساتھ مغرب کو مشرق کی طرف بھیجا جانے والا ایک سندیسہ بھی ہے، یعنی ایک اور پیام مشرق''

(صفحہ نمبر ۲۲۴)

کیا واقعی ن۔م۔راشدؔ کی شاعری مغرب کو بھیجا جانے والا ایک اور پیام مشرق تھا؟ اگر واقعی یہ بات سچ ہے تو ابتک راشد کے تعلق سے خموشی کیوں ہے یا پھر اس بات کی مزید تحقیق و جستجو کیوں نہیں کی گئی؟ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے مذکورہ مضمون میں ایک بات اور یہ کہی تھی کہ راشد کی شاعری دانش ورانہ تخلیقی بصیرت کے خمیر سے اٹھی تھی اور ان کے زمانے کی شاعری کے پانو وہاں ٹھہرتے دکھائی نہیں دیتے۔ اس حوالے سے بھی راشدؔ کے پس منظر میں اقبالؔ آ جاتے ہیں۔ جس دانش ورانہ شاعری کی بات شمیم حنفی اب کر

رہے ہیں وہ اردو میں سب سے پہلے اقبال کے یہاں پیدا ہوئی۔ یہ الگ بحث ہے کہ اس قسم کی شاعری کے ارتعاشات غالب اور اکبرالہ آبادی کے یہاں بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔لیکن اقبال کے ساتھ دانش وری کچھ اس طرح پیوست ہے کہ یہ ایک منصوبہ بند کام دکھائی پڑتا ہے۔اقبال کا پورا شعری کارنامہ ایک ذہنی و فکری تفاعل پر مبنی ہے، یہ ایک طویل مکالمہ ایک مشرق کے انسان کا مغرب کے جدید معاشرہ سے ہے۔ مغرب کا یہ جدید معاشرہ جو انیسویں صدی میں تیار ہوا اس کو آراستہ کرنے والوں میں چارلس ڈارون، نیطشے، ہیگل، مارکس، سگمنڈ فرائڈ جیسے لوگ شامل تھے۔اقبالؔ کی نگاہ میں مغرب کا یہ جدید معاشرہ ملحد تھا۔اقبال ڈارون، نیطشے، فرائڈ وغیرہ کے افکار کی تصدیق کرنے کے بجائے ان کی تکذیب کرتے تھے۔گرچہ اقبالؔ کے برعکس اردو کے جدید زمانے کے شعرانے ان مغربی مفکرین سے متاثر ہو کر شاعری کی اور انہوں نے ان مغربی افکار کی کنہہ میں جا کر چھان پھٹک نہیں کی۔بیسویں صدی کے آغاز میں اقبال نے کہہ دیا تھا:

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(طلوع اسلام)

اقبال کا پیام مشرق ایک نٹ شل میں سمجھ میں آتا ہے۔ان کا سارا فارسی کلام طویل تر مخاطبہ مغرب سے ہے۔یہ ایک مکالمہ ان نقالوں سے ہے جنہوں نے غصب کرنا سیکھا تھا اور جن کی فطرت دوسروں کے مال کو اپنا بنانے کی تھی۔ان باتوں کو صرف نظر کر کے اگر ہم صرف اور صرف اقبال کے کلام سے رشتہ رکھ کر سوچیں تو صاف نظر آئے گا کہ انہیں اردو کے عام شاعروں کی طرح شعر و شاعری سے کوئی تعلق خاطر نہیں تھا۔انہوں نے شاعری کو ایک میڈیم کے طور پر استعمال کیا اور پورا پیام مشرق مغرب کو دے ڈالا۔کیا ن۔م۔راشد کی پوری شاعری بھی (جو صرف آزاد یا معریٰ نظموں کے ذخیرے پر مشتمل ہے) ایک جواب مغرب کو تھی اور کیا اس شاعری میں اسی طرح کے منظم افکار قید ہیں جیسی اقبال کی شاعری تھی؟ یہ معاملہ تحقیق طلب ہے۔

راشد کے چار مجموعوں میں ''ماورا'' کو ہٹا کر کے دیکھا جانا چاہئے کہ اس مجموعہ کی شاعری زیادہ تر مبہم ہے اور ایام جوانی کے رومان پرور شعری تجربہ کی عکاس ہے۔اس کی نظموں میں کوئی منظم فلسفہ یا فکر نظر نہیں آتی۔اس لئے ان فکری ارتعاشات کو تلاش کرنا بے سود ہوگا جن کی مدد سے ایک نیا پیام مشرق تعمیر ہو سکتا ہے۔راشد کے ذہنی ہیجان نے جن نظموں کی تخلیق میں مدد کی تھی وہ نظمیں جدید انسان کی ناآسودہ خواہشات کا شناخت نامہ تھیں۔راشد کی نگاہ میں بیسویں صدی کا وہ انسان ہے جو جنگ اور بدامنی کا شکار ہے۔ یہ

انسان معاش کی تلاش میں سرگرداں ہے۔وہ مذہب بیزار ہے اور خودکشی کرنے پر آمادہ ہے۔یہ ایک ایسے جدید انسان کی کیفیات کو نغمہ بنانے کی کوشش ہے جسے خود پر بھی اعتماد نہیں۔ہاں یہ انسان ماضی کا پرستار نہیں ہے۔بلکہ وہ ماضی سے بیزار ہے۔راشد اپنے جن خیالات کو نظم میں باندھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل علامہ اقبال کی شاعری اور خیالات کا جواب ہیں۔اقبال کی ماضی پرستی راشد کو پسند نہیں آتی اور وہ اقبال کے افکار پر کچھ اس طرح طنز بھی کرتے ہیں:

آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے
سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کی مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت اُداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی! (دریچے کے قریب)

بلاشبہ راشدؔ نے جدید نظم کا ایسا پیکر اختیار کیا ہے جو ان سے پہلے اردو میں مقبول و متعارف نہیں تھا۔اور نہ ہی ابہام کی ایسی تہیں پہلے اردو کی نظموں میں پائی جاتی تھیں اس لئے راشد کی نظم کا قاری کے ذہن میں پوری طرح حل ہونا آج بھی دشوار ہے لیکن نظم کے ارتعاشات فکری سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے اپنے ایک بڑے اور نسبتاً قدآور پیش رو شاعر کو نظم کے پس منظر میں رکھا ہے۔اگر یہ طنز بھی ہے تو بڑا بلیغ طنز ہے اور راشد کے شعری بیانیہ کے جادو میں گرفتار ہوئے بغیر رہا بھی نہیں جاسکتا۔راشد اقبال سے

کہتے ہیں کہ آج کے انسان کی بے بسی دیکھئے کہ وہ کس طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔اس لئے اس کو ماضی کی داستان مت سنائیے۔ یہ دیکھئے کہ اس پر کیا افتاد پڑی ہے۔کسب معاش نے اس کے پیروں کو پہیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔اس جدید انسان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ آپ کے رزمئے اور مرثئے سن سکے اور سن کر کوئی تدبیر کر سکے،اس کی کہانی یہ ہے :

ایک بوڑھا ساتھکا ماندہ سارہوار ہوں میں
بھوک کا شاہ سوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے؟
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع خس وخاشاک نکل جاتا ہوں
چرخ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے سے میں پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے! (دریچہ کے قریب)

یہ جدید انسان کے چوبیس گھنٹے کی زندگی کا خاکہ ہے۔اس کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ اپنے شاندار ماضی کی داستان سن سکے اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کر سکے۔راشد اپنی نظموں میں جدید انسان کی روحانی چھٹ پٹاہٹ کو لے کر UNO تک کا سفر طے کرتے ہیں اور ایران کی گلیوں کی خاک چھاننے لگتے ہیں تو انہیں نوآبادیاتی حملوں کی خبر ہونے لگتی ہے۔''ماورا'' ن م راشد کے ابتدائی ذہنی تجربوں پر مبنی مجموعہ تھا۔''ایران میں اجنبی'' تک آتے آتے راشد کے ذہن میں ایک نیا موڑ پیدا ہونے لگتا ہے جسے ہم تبدیلی سے موسوم کر سکتے ہیں۔حالانکہ ''ایران میں اجنبی'' کی تعمیر اس جدید انسان کی ارتقائی منزلیں ہیں جو ''ماورا'' میں سر بہ زانو بیٹھا ڈپریشن کا شکار ہے۔مگر ''سومنات'' تک آکر راشد کے فکری سرچشمے ابلنے لگتے ہیں :

نئے سرے سے غضب کی سج کر
عجوزۂ سومنات نکلی

مگر ستم پیشہ غزنوی
اپنے حجلۂ خاک میں ہے خنداں
وہ سوچتا ہے:
''بھری جوانی سہاگ لوٹا تھا میں نے اس کا
مگر مرا ہاتھ
اس کی روح عظیم پر بڑھ نہیں سکا تھا
اور اب فرنگی یہ کہہ رہا ہے:
''کہ آؤ اس ہڈیوں کے ڈھانچہ کو
جس کے مالک تمہیں ہو
ہم مل کے نور کمخواب سے سجائیں!'' (سومنات)

ن۔م۔راشد کی یہ فکر دو قدم آگے بڑھ کر ''ایران میں اجنبی'' میں اس طور پر متشکل ہوئی ہے :

مَری کے ویراں کشید گاہوں میں
اُس فتیلے کو ڈھونڈتا ہوں
جو شیشہ و جام و دست ساقی کی منزلوں سے
گزر کے جب بھی بڑھا ہے آگے
تو اس سے اکثر غموں کے اُجڑے ہوئے دماغوں کے تیرہ گوشے
انا کی شمعوں کی روشنی میں جھلک اٹھے ہیں!
میں اس فتیلے کے اس سرے پر
کھڑا ہوں، مجذوب کی نظر سے
مَری کی ویراں کشید گاہوں میں جھانکتا ہوں!
میں کامگاری کے انتہائی سرور سے کانپنے لگا ہوں
جہان بھر کے عظیم سیاح دیر تک یہ خبر نہ لائے
کہ نیل
جو بے شمار صدیوں سے
مصر کے خشک ریگزاروں کو،
رنگ ونغمہ سے بھر رہا تھا

کہاں سے ہوتی تھی اس کی تقدیر کی روپہلی سحر ہویدا؟
میں آج ایسے ہی نیل کی وسعتوں
کی دہلیز پر کھڑا ہوں
(ویران کشید گاہیں)

ایسا معلوم ہوتا ہے ن م راشد کسی Waste Land کی دہلیز پر کھڑے ماضی کے تمام روزنوں سے جھانکنے لگے ہیں اور ان کے اوپر پر اسرار حقیقتوں کا نزول ہونے لگا ہے۔ ''ویران کشید گاہیں'' ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ سے کم حسین معلوم نہیں ہوتی۔ یہ نظم بلاشبہ ایک بڑے شاعر کے ارتقائی ذہن کی غمازی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی نظم کے نئے کرافٹ سے اردو والوں کو باخبر کرتی ہے لیکن یہاں مسئلہ وہی رہ جاتا ہے کہ ن م راشد نے اقبال کی طرح کوئی منظّم پیام مشرق پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی راشد کا نقطۂ نظر اقبال کی طرح ترشا ترشایا ہے کہ ہم جس کسی نظم کو جہاں کہیں سے اٹھا کر یہ کہیں کہ ہاں یہ گزشتہ سے پیوستہ ہے اور یہاں شاعر کا ارتقائی ذہن فلاں منزل میں پہنچا ہوا ہے۔ راشد نے اگر مغرب سے مکالمہ کیا بھی ہے تو متاثر ہو کر کیا ہے۔ راشد نے مغربی شاعروں سے بہت کچھ سیکھا۔ نظم کا پیرایہ، اظہار یہ سب کچھ۔ نظم کے کرافٹ کے اعتبار سے وہ اپنے دور کے تمام شاعروں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں فارسیت کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ اقبالؔ کی طرح راشدؔ نے بھی فارسی زدگی اختیار کر کے اپنی نظموں کو ایک نئے ڈکشن سے آشنا کیا ہے تو یہ ایک مبہم اور نا قابل قبول بات بھی ہے۔ راشد اقبال کی جیسی جتن یا کوشش نہیں کرتے۔ راشد کی شعری زبان میں فارسی الفاظ و تراکیب کی شعوری آمیزش تھی جبکہ اقبال اپنی نظموں کے موضوع اور مواد کی مناسبت کے تحت فارسیت اختیار کرتے تھے۔

راشدؔ نے ''ایران میں اجنبی'' کے بعد ''لا = انسان'' میں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے پختگی حاصل کی ہے لیکن اس مجموعہ کی شاعری کو بھی کسی تنظیم کاری کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ ہم یہ کہیں کہ نوآبادیاتی افکار کا جواب راشد نے اپنے پس نوآبادیاتی افکار سے دیا ہے۔ پس نوآبادیاتی ذہن کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال ہیں۔ اقبال کے ساتھ اکبر الہ آبادی کا نام بھی جوڑ سکتے ہیں۔ لیکن راشد نے دونوں شاعروں کی طرح اپنا پوراز ور مغربی افکار کے ردعمل میں صرف نہیں کیا ہے۔ راشد کا ذہن خود افکار اور آزاد ہے۔ وہ انسان کی برابری کا قائل ہے اور انسان کی عظمت کا جویا بھی لیکن راشد نے مغرب کو کبھی کوئی جواب دوسرے پیام مشرق کے طور پر نہیں دیا۔

Dr. Jamal Owaisi
Head
Deptt. of Urdu
M. R. M. College
Darbhanga (Bihar)
Mob.- 73522 84181

ڈاکٹر سرور ساجد

پروفیسر مولا بخش: شخصیت اور کارنامے

(مختصر سوانحی کوائف)

اردو کے ممتاز و منفرد نقاد، دانشور، سفر نامہ نویس، ترجمہ نگار، خوش گلو شاعر اور خوش بیان مقرر پروفیسر مولا بخش انصاری کا ۲۱/اپریل ساڑھے سات بجے صبح آئی۔ ٹی ہاسپٹل، زکریہ مارکیٹ، علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ محض ۵۸ سال تین مہینے اور انیس دن اِس دنیا میں رہے۔ موصوف تنفس کے مرض میں مبتلا تھے اور اسی کے سبب ان کی موت بھی واقع ہوئی۔

مولا بخش کی پیدائش ۲/جنوری ۱۹۶۳ء کو چمپارن، بہار میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم چمپارن میں ہی ہوئی۔ انھوں نے بہار اسکول اکزامینیشن بورڈ، پٹنہ سے ۱۹۷۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۱ء میں بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے انٹرمیڈیٹ، بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سند رانچی یونیورسٹی، رانچی سے حاصل کی۔ ۱۹۹۱ء میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی سے ''سرسید احمد خاں کے ادبی اسلوب'' کے موضوع پر ایم۔ فل اور دہلی یونیورسٹی دہلی سے ''سرسید کے نثری اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔

مولا بخش نے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ۲/اگست ۲۰۰۱ء کو دیال سنگھ کالج، دہلی میں جوائن کیا جہاں انھوں نے ۲۱/نومبر ۲۰۱۴ء تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۲۲/نومبر ۲۰۱۴ء کو انھوں نے براہ راست پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں جوائن کیا جہاں تادم مرگ درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔

مولا بخش کی تنقیدی روش کی اہمیت اور گہرائی و گیرائی کی پذیرائی کرتے ہوئے اردو اکادمی، دہلی نے ۲۰۱۱ء میں انھیں ''تنقیدی تحقیق' کے نام کا ایوارڈ دیا۔ آذر اکیڈمی، علی گڑھ نے ۲۰۱۲ء میں انھیں ''سند افتخار'' سے سرفراز کیا۔ سرزمین بہار سے انھیں سند توصیف بھی عطا کی گئی۔

علمی و ادبی کارنامے

مولا بخش کی زندگی میں ان کی پانچ کتابیں شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب کا عنوان ہے ''محمد میر اثر

دہلوی''۔ جو خواجہ میر اثر دہلوی یعنی خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی کا مونوگراف ہے جسے اردو اکادمی، دہلی نے شائع کیا ہے۔ میر اثر دہلوی کے حوالے سے انیسویں صدی کے غزلیہ منظر نامے کا مولا بخش نے جس معروضی انداز میں تجزیہ کیا ہے اور اپنے تجزیے کی روشنی میں جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ ان کے غزل کے فن سے رمز آشنائی کا بہترین ثبوت ہیں۔ اثر دہلوی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے مولا بخش نے متعدد قیمتی نکات اس کتاب میں بیان کیے ہیں لیکن اثر دہلوی کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر جو بات موصوف نے خصوصی طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ اثر کی معروف مثنوی ''خواب و خیال'' سے متعلق ہے۔ اس مثنوی کا مطالعہ مولا بخش نے نئے انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند کہ یہ مثنوی شائع شدہ شکل میں نامکمل ہی ہے تاہم مولا بخش نے مثنوی ''خواب و خیال'' سے بحث کرتے ہوئے مثنوی اور داستان کی شعریات کی بحث کا جو باب قائم کیا ہے وہ بے حد اہم بھی ہے اور تفصیلی تشریح کا طالب بھی لہٰذا اس حوالے سے کبھی پھر گفتگو کی جائے گی۔

مولا بخش کی دوسری کتاب ''جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ'' کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء میں اضافے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس تاثر کا اظہار کیا تھا کہ غالب خوش نصیب تھے کہ انھیں مولانا حالی ملے اور میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے مولا بخش ملے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے معاصر ناقدین میں مولا بخش اس لحاظ سے بھی بے حد اہم ہیں کہ انھوں نے بھرپور انداز میں انگریزی کے تھیوری ساز ناقدین کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ شاید مولا بخش اردو کے ایسے واحد نقاد ہیں جنھوں نے دلائل و براہین کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ساختیات اور پس ساختیات کے نام پر مغرب جو کچھ ہمیں دے رہا ہے وہ دراصل ہمارے سنسکرت ادب و شعریات کا مال مسروقہ ہے۔

مذکورہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مولا بخش کے تنقیدی موقف کی وضاحت کے لیے کتاب میں شامل تحریر ''مقدمہ: یہ کتاب کیوں'' کے ابتدائی دو مختصر اقتباسات ملاحظہ کریں :

> ''تھیوری کی تفہیم پر مبنی یہ کتاب فلسفۂ ادب میں نئی پیش رفت کو اپنے طور پر سمجھنے سمجھانے کی میری سعی و جستجو کا نتیجہ ہے۔ تھیوری، ادبی یا دیگر علوم کی تھیوری کو ہی محض تھیوری سمجھنے یا کسی مخصوص ادبی یا سماجی و سائنسی تھیوری کو حتمی سمجھنے کے چلن کے خلاف ایک فلسفیانہ اور دانشورانہ رویے کا نام ہے۔
>
> ہندوستانی ادبیات میں اس بحث کو قائم کرنے میں اولیت گوپی چند نارنگ (پ: ۱۱رفروری ۱۹۳۱ء، صوبہ بلوچستان) کو حاصل، اس لیے اس کتاب کی

> ساری بحثوں میں گوپی چند نارنگ کو مرکزیت حاصل ہے۔ اردو ادب میں تھیوری سازی کے عمل میں گوپی چند نارنگ کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا نام نامی بھی اہم ہے لیکن موصوف نے جس ادبی تھیوری کو ادبی مطالعے کا شیوہ بنایا اُسے ہم نئی تنقید (New Criticism) یا وجودیاتی تنقید (Ontological Criticism) کے نام سے جانتے ہیں۔ ادبی تھیوری میں اس طرز تنقید کی دین سے انکار ناممکن ہے لیکن تھیوری ہر اس نظریۂ ادب کے خلاف ہے جو وحدانی ہے یا جو اپنے علاوہ کسی اور تھیوری کو گھاس نہیں ڈالتا۔ اس لحاظ سے شمس الرحمٰن فاروقی کا موقف تھیوری کے خلاف ہے، تھیوری نظریہ ہائے ادب سے نمٹنے کے ردّ عمل یا خودنگر وحدانی رویوں سے انحراف کا نام ہے۔''
>
> (ص:۹)

مذکورہ پہلے اقتباس میں مولا بخش کے نئے تنقیدی وژن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں تھیوری کی تشکیل کے نظریے سے دلچسپی ہے اور وہ اس سے واقفیت کو ضروری سمجھتے ہیں، ساتھ ہی ادبی مطالعے میں اس کی تطبیق کو بھی اہم تصور کرتے ہیں لیکن اسے حتمی نہیں سمجھتے بلکہ تغیر پذیر تصور کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کی نئی سے نئی تھیوری بھی آنے والے دنوں کے لیے زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوسکتی، تھیوری کی تغیر پذیری ہی اس کی زندگی کا ضامن ہے۔

مذکورہ دوسرے اقتباس میں مولا بخش نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہندوستانی ادبیات کے حوالے سے تھیوری کے مسائل پر غور و فکر اور ادب پر اس کی تطبیق کی بنیاد گوپی چند نارنگ نے ڈالی ہے اس لیے مذکورہ کتاب میں ان کے افکار و آراء کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے تھیوری سازی کے عمل میں گوپی چند نارنگ کے علاوہ مولا بخش نے شمس الرحمٰن فاروقی کا نام لیا ہے اور ان کے متعلق اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ فاروقی صاحب نے بنیادی طور پر نئی تنقید یا وجودیاتی تنقید کو اپنا شیوہ بنایا اور اس طرز تنقید کی دین سے انکار ممکن نہیں لیکن چونکہ یہ طرز تنقید وحدانی ہے اس لیے تھیوری کے منافی ہے کیونکہ اس طرز تنقید میں کسی قسم کی کوئی امتزاجی کیفیت نہیں پائی جاتی اور یہ طرز تنقید اپنے علاوہ کسی اور تھیوری کو برداشت نہیں کرتا جس کی بنا پر مولا بخش شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید کے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فاروقی صاحب کا تنقیدی موقف تھیوری کے خلاف ہے۔ وہ مزید اس بات کی وضاحت بھی کرتے ہیں کہ تھیوری نظریہ ہائے ادب کو بروئے کار لانے کا نام ہے لیکن مولا بخش کی تنقیدی روش چونکہ ہمیشہ ارتقا پذیر رہی اس

لیے اس کتاب کی اشاعت یعنی ۲۰۱۳ء کے تقریباً پانچ سال بعد جب انھوں نے اسلوب اور اسلوبیات کے حوالے سے ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل کتاب (غیر مطبوعہ) تیار کی تو جس انداز میں انھوں نے فاروقی صاحب کے اسلوب شناسی پر اظہارِ خیال کیا ہے اس کی نوعیت قطعاً مختلف ہے۔

مولا بخش کی تیسری تصنیف ''خواجہ حسن نظامی کی نثر (ثقافتی لائحۂ عمل)'' عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے شامل مولا بخش کی تحریر کا یہ پہلا اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ہر معاشرے کی کچھ ثقافتیں ہوتی ہیں جن کی تشکیل میں ماضی کی قدروں، معاشرتی اقدار، مذہبی آئیڈیولوجی نیز ہم عصر سماجی، سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کا اہم رول ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی بھی ہندوستانی معاشرے میں ایک ثقافتی نشان کے روپ میں زندہ ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کی ثقافتی سیاست کے خلاف آواز اٹھائی۔ یک رنگ ثقافت کی جگہ گنگا جمنی تہذیب اور قومی کلچر کے نظریے کو فروغ دیا۔ دراصل ثقافتی اضافیت کا واحد ایجنڈا انھیں عوامی کلچر میں نظر آیا جس کی ایک مہتم بالشان روایت تصوف کی شکل میں سینہ بہ سینہ چلی آئی ہے۔'' (ص:۷)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مولا بخش روایتی یا فارمولا ٹائپ نقاد نہیں بلکہ ٹھوس بنیادوں پر اپنی تنقیدی عمارت تعمیر کرنے کے متمنی ہیں لہٰذا وہ جس قسم کے تنقیدی مطالعے کو ترجیح دیتے ہیں اس میں ثقافتی حوالوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہیں۔ ثقافت جن عناصر سے تشکیل پاتی ہے ان میں مولا بخش کے نزدیک ماضی کی قدریں، معاشرتی اقدار، مذہبی آئیڈیولوجی کے ساتھ ساتھ ہم عصر سماجی، سیاسی اور اقتصادی صورت حال وغیرہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور انھیں عناصر و اجزا کی روشنی میں بحث و مباحثے کے بعد خواجہ حسن نظامی کو موصوف ہندوستانی معاشرے کے ثقافتی نشان کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی نثری خوبیوں اور اسلوب کی باریکیوں سے مولا بخش نے اپنی اس کتاب میں جو بحث قائم کی ہے وہ تفصیلی مطالعے کا متقاضی ہے۔ مولا بخش کی چوتھی کتاب خواجہ حسن نظامی کا مونوگراف ہے جو ۲۰۱۲ء میں ساہتیہ اکادمی، دہلی سے شائع ہوا۔

مولا بخش کی پانچویں کتاب چین کا سفرنامہ ہے جو ''گراں خواب چینی سنبھلنے لگے'' کے عنوان سے ۲۰۱۶ء میں براؤن بک پبلیکیشنز، دہلی سے شائع ہوئی۔ ۱۵۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب چھ جلی اور متعدد ذیلی عنوانات سے مزین ہے۔ ''آغازِ سفر سے پہلے'' کے عنوان سے مصنف نے جو مقدمہ تحریر کیا ہے اس کا

ISSN : 2582 - 3612

ایک ابتدائی اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''سفرنامے کا عنوان 'گراں خواب چینی سنبھلنے لگے' پڑھ کر آپ نے سوچا ہوگا کہ راقم نے اکیسویں صدی میں بھی چینی قومیت کو عالم طفولیت سے بلوغت کی جانب گامزن کیوں محسوس کرایا ہے، جبکہ آج چین دنیا کے چند اہم طاقتور ممالک میں سے ایک ملک بن چکا ہے لیکن حق لگتی بات یہ ہے کہ ملکوں کی ترقی کا معیار وہاں کی فوجی طاقت یا فلک بوس عمارتیں، چوڑی سڑکیں یا اس کی اکانومی نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت کا وہ شعور یا منصوبہ ہے جو کسی بھی ملک میں آپسی اتحاد اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کے جذبے کو مہمیز کرتے ہوئے اس ملک کو عالمی امن کے قائد کے روپ میں ابھارتا ہے اور ہر زبان و ثقافت کے لوگوں کو شناخت کی بالخصوص اقلیتی زبان اور ان کی ثقافت کے تحفظ سے متعلق اس ملک کا اعلیٰ اقدام اور اس سے متعلق قوانین اس ملک خاص کی پہچان قرار پاتے ہیں اور یہی وہ اقدار ہیں جو اس ملک کی ترقی کا اعلیٰ معیار قائم کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ۲۰۱۰ء ماہ اگست کی ۲۸ تاریخ کو چین کی راجدھانی بیجنگ میں منعقدہ سمینار میں ''کثیر لسانی ثقافت اور چین'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔'' (ص:۷)

مذکورہ اقتباس میں مولا بخش نے چین کی کامیابی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے چین کی فوجی طاقت، فلک بوس عمارتیں، چوڑی سڑکیں یا تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی معیشت کو بنیادی اہمیت نہیں دی ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ چین کی ترقی کا راز انسانیت کی خدمت کا شعور اور اس منصوبے میں مضمر ہے جس میں وہاں کے تمام بسنے والوں کی یکساں شراکت پائی جاتی ہے۔ ہر زبان اور ثقافت کے تحفظ کا جذبہ چین کو قائدانہ اہمیت کا حامل ملک بناتا ہے۔ اس کتاب میں مولا بخش نے چین کے سفر کی جو روداد تحریر کی ہے اس کے مطالعے کے بعد قاری کے دل میں ایک بار چین کا سفر کرنے کی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے۔

مذکورہ پانچ شائع شدہ کتابوں کے علاوہ رسائل میں ان کے سینکڑوں مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ علاوہ ازیں تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل چار وقیع اور ضخیم جلدوں پر مبنی کتاب کا مسودہ تیار ہے جس کا مطالعہ وہ اپنے انتقال سے پہلے بڑی دلجمعی سے خود بھی کر رہے تھے اور دوستوں سے بھی ان کی پروف ریڈنگ کروا رہے تھے۔ دراصل ان چار جلدوں کے منظر عام پر آجانے کے بعد ہی مولا بخش کے تنقیدی و

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

تحقیقی قد و قامت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا۔ مولا بخش نے اپنی تنقید کے لیے ایک منفرد زبان اور منہاج متعین کر رکھی تھی۔ ان کی تنقید کی زبان استدلالی ہے، واضح ترسیل اور منطقی طرز اظہار کی بنیاد پر ان کی تحریریں ہمیں غور و فکر پر اکساتی ہیں۔ ان کی تنقیدی رایوں سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن انکار ممکن نہیں۔

Dr.Sarwar Sajid
Associate Professor
Deptt. of Urdu
Women's College
A.M.U., Aligarh-202002
Mob:8210370291

ڈاکٹر محمد صادق حسین

ناول ''زندہ محاورے'' کا تنقیدی جائزہ

اردو ناول ابتدا سے موضوعاتی پیشکش کے حوالے سے اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح ناول نگاروں نے فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی کشمکش، صارفیت، نفسیاتی پیچیدگیوں اور عورتوں کی محرومی کو ناولوں میں مرکزیت عطا کی اسی طرح ہجرت کے مسائل کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے بیشتر ناول نگاروں نے اہم اور معتبر ناول تحریر کئے ہیں۔ اس سلسلے سے ''اداس نسلیں'' عبداللہ حسین، ''آنگن'' خدیجہ مستور ''زمین'' خدیجہ مستور ''دوگز زمین'' عبدالصمد ''زندہ محاورے'' ناصرہ شرما ''ٹوٹا ہوا آدمی'' خالد سہیل ''مقدس جیل'' خالد سہیل ''خواب رو'' جوگندر پال ''دوسری ہجرت'' سرور غزالی ''فرار'' ظفر پیامی ''چلتا مسافر'' الطاف فاطمہ ''کالی مائی'' علی امجد ''نہ جنوں رہا نہ ماٹی رہی'' زاہدہ حنا وغیرہ۔

جس طرح تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات نے انسانی زندگی کو ہر اعتبار سے پامال رکھا تھا ہجرت اسی پامالی کا سدباب بن کر سامنے آیا لہٰذا جب ہندوستان اور پاکستان دو ملک کے افراد خود اپنے ہی ملک میں غیر محفوظ تصور کرنے لگے۔ تب ہجرت کا فیصلہ لینا ان کے لئے ضروری ہو گیا، لیکن ہجرت کرنا ہر فرد کے لئے نیک فال ثابت نہیں ہوا بلکہ مہاجرین کے لئے غیر ممالک میں کئی مسائل در پیش آئے۔ مثلاً - اقتصادی استحصال، کلچروں کا تضاد، بے جڑی اور شناخت کا مسئلہ، بے گانگی، نوسٹالجیا بنا کر ہر ایک حقیقت سے قارئین کو روبرو کرایاہ۔ میں یہاں ہجرت کے سلسلے سے ایک اقتباس شامل کرنا چاہوں گا تا کہ قارئین ہجرت کے سلسلے سے مزید معلومات فراہم کر سکیں ملاحظہ کیجئے :

> ''ہجرت بشمول پناہ گزینی جلاوطنی اور عدم شہریت کی فرد افراد کے گروہ کسی آبادی یا قوم کے لئے انتہائی خوشگوار اور تکلیف دہ عمل ہے اور بہ رضا و رغبت اس کا تصور محال ہے۔ ہجرت کا عمل ایک طویل عرصے سے جاری ہے تاریخ مذہبی حوالوں اور قصص میں بہت سی ہجرتوں کا ذکر موجود ہے۔ ہجرت کا یہ سلسلہ تب بھی تھا اور آج بھی ہے۔ ممکن ہے کہ کبھی اس کی رفتار مدھم ہو گئی ہو اور کبھی تیز، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہجرت کا سلسلہ بالکل ہی رک گیا ہو۔

ایسا ہمہ وقت عمل جو علاقائی و جغرافیائی حدبندیوں، مذہبی و لسانی قیود د، سماجی و خاندانی، رشتوں سے اوپر اٹھ کر اختیار کیا جاتا ہے یقیناً اس کے اسباب و محرکات کافی پیچیدہ، لیکن آفاقی نوعیت کے ہوں گے............ پناہ گزینی جلاوطنی اور عدم شہرت ہجرت کی یہ تینوں قسمیں سو فیصدی جبر کا نتیجہ ہیں۔''

(اردو فکشن میں ہجرت، خان شاہد وہاب، ص-۴۳-۴۱)

اس اقتباس کی روشنی میں ہجرت کے حوالے سے مزید معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ میں یہ عرض کردوں کہ خواتین ہوں یا مرد ناول نگار سبھوں نے اس موضوع کو مرکزیت عطا کی ہے اور ہجرت کے بے شمار مسائل کو سامنے لایا ہے۔ خواتین ناول نگاروں کی صف میں بھی بیشتر ایسی ناول نگار ہیں جن کے ناول اپنے موضوعاتی پیشکش کے حوالے سے اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جہاں تک ناصرہ شرما کا ناول زندہ محاورے کی بات ہے تو اس سلسلے سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ناول اپنے فنی لوازمات کے حوالے سے کامیاب و کارآمد ہے۔ پورے ناول میں مصنفہ نے ہندوستان میں آئے مہاجرین اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی زندگی کی پریشانیاں کیا تھیں اس پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ہندو پاک کی سیاسی صورتحال کو بھی سامنے لایا ہے۔ خصوصی طور سے ان سیاسی اراکین کی قلعی کھول دی ہے جن کی حرکت نے دو قوموں کے درمیان اختلافات پیدا کر رکھے تھے۔ مطلب یہ کہ ناصرہ شرما نے بڑے ہی بے خوف ہو کر اس ناول میں تمام امور کو پیش کیا ہے اور قاری کو ہر ان سچائیوں سے آگاہ کیا ہے جہاں تک ان کی نگاہیں جانے قاصر ہیں۔ اس سلسلے سے ناول زندہ محاورے کا یہ اقتباس دیکھئے :

''آج دونوں ملکوں میں رہنے والی ادھیڑ اور جوان ہوتی نسلیں بٹوارے جیسے تاریخی واقعہ کی چشم دید گواہ نہیں ہیں، مگر اس کی گونج کسی ناکردہ گناہوں کی سزا بن کر بچپن سے ان کا پیچھا کرتی، ان کے دل و دماغ پر فساد اور طنز کی شکل میں کوڑے برساتی، انہیں شرمندگی کے سمندر میں گردن تک ڈبوتی رہی ہے۔ جو سیاست یہاں بجلی بن کر لوگوں پر گرتی ہے، وہی سیاست وہاں جلتے توے پر چلنے کی سوزش دیتی ہے اور دونوں طرف ایک الزام کٹی پتنگ بن کر پھڑ پھڑاتا ہے کہ تم یہاں کے نہیں ہو، پردیسی ہو، غیر ہو۔ اس لئے دونوں طرف کے باشندوں کے درد کی زمین ایک ہے۔ خون کا رنگ وہی انسانی ہے، بس ذرا سا فرق یہ ہے کہ ادھر والے جانے والوں کے گناہ کی صلیب پر

ٹانگ دیے گئے ہیں اور اُدھر والے لگاتار یادوں کے تہہ خانے سے گزر رہے ہیں۔''

(ناول زندہ محاورے، ناصرہ شرما، ص-۸)

اس ناول کی ابتدا ناول کے مرکزی کردار نظام کے پاکستان جانے سے ہوتی ہے۔ نظام یوں تو ہندوستانی نوجوان ہے جو .U.P کے ایک گاؤں کا باشندہ ہے۔ اس کے والد رحیم الدین، والدہ فاطمہ بی بڑے بھائی امام، بھابھی شمیمہ اور بھتیجے یہ تمام افراد نظام کے ساتھ رہتے ہیں۔ نظام اس جگہ کا باشندہ ہے جہاں بھائی چارگی کی حقیقت سے لوگ آشنا ہیں، لیکن جب تقسیم ہند کا واقعہ درپیش ہندو مسلم نفاق انتہائی صورت اختیار نہیں کرتی ہے، لیکن نظام نہیں چاہتا کہ وہ اور اس کے گھر والے کسی انہونی مصیبت کا شکار ہوں لہٰذا نظام پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ نظام کے گھر والے ہندوستان میں ہی رہ جاتے ہیں۔ نظام جب پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرتا تب اس کا ذہن کن باتوں کو سوچتا ہے اسے مصنفہ نے یوں پیش کیا ہے۔

جس میں جذباتیت بھی ہے اور حقیقت کا پرتو بھی :

''زمین..........! زمین سے چپکے رہنا تبھی تک بھلا جب وہ اپنی پہچان ہو، اپنی عزت ہو، بیج اور اپنی فصل ہو، مگر جب سب کچھ بیگانہ بنا دیا جائے اور ثابت کرنا پڑے کہ یہ مٹی اس سے اچھا وہ ٹکڑا ہے جو کاٹ کر دامن میں ڈال دیا گیا ہو اب اسی کو پالنا پوسنا اور اپنا سمجھنا ہوگا۔ نظام نے گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر پاؤں سے کانٹے نکالتے ہوئے سوچا۔''

(زندہ محاورے، ناصرہ شرما، ص-۱۱)

مصنفہ نے بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ ہجرت کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی پیچیدگی اور نفسیاتی کیفیات کو سامنے لایا ہے۔ نظام یوں تو قافلے میں شامل ہو کر پاکستان ہجرت کر جاتا ہے، لیکن وہاں جس طرح اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے وہ کئی پریشانیوں کا سامنا کرتا ہے وہ بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ کیوں کہ ایک طرف اس کے گھر والے ہندوستان میں صعوبتیں جھیلتے ہیں اور دوسری طرف نظام پاکستان میں اپنے گھر والوں کے لئے تڑپتا ہے۔ اس کی اہم وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد یا یوں کہیں کہ تقسیم ہند نے ایسا منظرنامہ سامنے لایا تھا کہ لوگ اپنے خاندان اور اہل و عیال سے ملنا تو دور باتیں کرنے سے بھی قاصر تھے۔ سبھی تنہائی اور کرب کی زندگی جینے پر مجبور تھے جس سبب ان کی زندگی ہراساں تھی۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے جس میں ناصرہ شرما نے پوری حقیقت کو سامنے لایا ہے۔

''رحیم الدین اٹھے اور اندر جا کر اپنے گرم بستر پر لیٹ گئے۔ کل اس گھر میں

سارے پُرکھوں کی روح آئے گی۔ ایک ایک کر کے سارے مردوں کے نام
پرندرہوگی۔ اس سارے انتظام کے بیچ زندہ اور مردہ گفتگو کا سلسلہ قائم
کریں گے، مگر ان کا وہاں کوئی ذکر نہیں آئے گا جو اپنوں کے درمیان سے
چلے گئے۔ جواب نہ زندہ تھے نہ مردہ، نہ غائب تھے نہ اغوا ہوئے تھے۔ پھر
ان کی قبر کہاں ڈھونڈ کر اس پر شمع جلائیں۔ دعا میں اٹھے ہاتھ خدا سے ان
کے لئے کل کیا مانگیں گے............سلامتی، واپسی، یا صبر............؟''

(ناول زندہ محاورے، ناصرہ شرما ص-۸۷)

تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ ناصرہ شرما نے ہجرت کے منفی اثرات کو نظام کے کردار کے ذریعہ سامنے لایا ہے۔ نظام جس طرح پاکستان ہجرت کرتا ہے اور وہاں اپنی زندگی کی نئی شروعات کرتا ہے وہ قابل تعریف ہے، لیکن زندگی کے سارے اوقات گزارنے کے بعد بھی اسے مہاجر ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے سے نظام کی زبانی مصنفہ نے حقیقت کو بیان کیا ہے :

''پچھتاوا............بہت پچھتاوا ہو رہا ہے بیٹے تم سے کیا چھپانا، کچھ مزہ نہیں
آیا زندگی میں۔ سب کچھ پا کر بھی کیا کھویا ہے نظام تھکے لہجے میں بولے۔''

(زندہ محاورے، ناصرہ شرما ص-۱۴۱)

اس طرح پورا ناول اپنے موضوع اور اسلوب کے حساب سے کامیاب ہے۔ ناصرہ شرما نے بڑی ہی ہنرمندی کے ساتھ ناول لکھا ہے۔ جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

Dr. Md. Sadique Husain
Associate Professor
Deptt. of Urdu
R. L. College, Madhavnagar
Purnea (Bihar)
Mob.- 93344 91303

ISSN : 2582 - 3612

ڈاکٹر سیفی سرونجی

حقانی القاسمی نے حق دوستی ادا کیا!

صلاح الدین پرویز اور حقانی القاسمی کی دوستی سے کون واقف نہیں ہے۔ حقانی القاسمی برسوں دہلی میں ایسے ایسے لوگوں کے لئے کام کرتے رہے کہ جن کا ادب میں کوئی نام نہیں تھا۔ بس لوگ حقانی القاسمی سے فائدہ اٹھاتے رہے اور ان کی صلاحیتیں ضائع ہوتی رہیں۔ کہیں عربی کبھی انگریزی ہندی تخلیقات و مضامین کا ترجمہ کرتے کہیں کسی کے نام سے اداریے لکھتے رہے، آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے میری پہلی ملاقات ان سے حاجی انیس دہلوی صاحب مرحوم کے دفتر میں ہوئی، جہاں اکثر میرا قیام رہتا تھا۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ یہ حقانی وہ ہیں، جن کی صلاحیتوں کو لوگ خوب استعمال کرتے ہیں اور معاوضہ صرف برائے نام ہوتا ہے۔ حاجی صاحب نے بھی کئی ترجمے کرائے کبھی وہ آج کل میں تبصرے کرتے کبھی کسی اخبار میں غرض یہ کہ دہلی جیسے شہر میں وہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے جگہ بناتے رہے بہر حال یہ بات طے ہے کہ صلاحیتیں کبھی چھپتی نہیں ہیں اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے اجاگر ہوتی رہتی ہیں، حقانی کی شہرت ہوتی گئی یوں تو وہ دہلی آنے سے پہلے ہی انتساب سے جڑے ہوئے تھے، ان کے کئی اہم خط انتساب میں شائع ہوئے ہیں۔ جن میں انھوں نے ہمیشہ مجھے ایک بھائی کی طرح سمجھا ہے اور رسالے کے معیار کے سلسلے میں اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے لیکن دہلی جانے کے بعد ان کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ ہاں دہلی جانے سے پہلے ان سے خط و کتابت تو رہی، ان کے بہت خطوں میں سے ایک اہم خط یہاں پیش کرتا ہوں تا کہ حقانی صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات سے قارئین کو بھی واقفیت ہو سکے۔ اس خط میں تیس سال پہلے جو انھوں نے حوصلہ افزائی کی تھی، وہ آج بھی میرے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے :

''محترم سیفی سرونجی صاحب   تسلیمات

مجلّہ انتساب دیکھنے کی خواہش برسوں سے تھی، اب نئے سال میں جا کر آپ کی محبتوں کے طفیل دیرینہ خواہش پوری ہوئی، میں نئے سال کے اس تحفہ کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ اداریہ پڑھ کر آپ کے کرب کا اندازہ ہوا، جن شدائد و مشکلات سے آپ گزر رہے ہیں، اس کا کچھ احساس مجھے بھی ہے کہ اس کوچہ نفاق میں رہتا ہوں جہاں لوگ منافقت کے جملہ آداب بڑی محبتوں سے بجالاتے ہیں۔ ایسی منافقت ہے کہ عقابوں کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

حوصلے بھی پست ہو جائیں۔آپ کی بلند ہمتی کی داد دینی پڑے گی کہ تیز وتند ہوا میں بھی ادب کا چراغ جلا رہے ہیں، اس راہ میں ایسے سخت جان و پُر خطر مقام آتے ہیں، جن سے بیشتر مدیران جرائد رسائل کو گذرنا پڑتا ہے۔ کچھ ایسے حالات سے تاجور نجیب آبادی مدیر مخزن، ادبی دنیا، شاہکار بھی گذرے تھے اور جرأت کے ساتھ اپنے معائدین ومخاصمین کو خطاب کرتے ہوئے لکھا تھا 'جن قابل رحم لوگوں نے ادبی دنیا کو اپنا مرض الموت بنا رکھا ہے، ان کے کلیجے میں ایک ہوک اٹھے گی کہ ان کی عف عف سرائیوں سے اس ماہتاب عالمتاب کی جلوہ باریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ان ہرزہ کاریوں کی فتنہ شعاری خود ان کے حق میں کانٹے بو رہی ہے۔ یہ واقعیت نا قابل انکار بن چکی ہے کہ ادبی دنیا کے معاندین کی ہرزہ نگاہوں کو تعلیم یافتہ طبقے میں پڑھنے والا کوئی نہیں۔ادبی دنیا کے لئے یہ بات مشمہ برابر بھی اہمیت نہیں رکھتی کہ اسے نھوا چھٹوا شہر کا گنگو تیلی اچھا نہیں سمجھے بلکہ کمال عروج پر پہنچنے کے واسطے ایسے پست فطرت حاسدوں کے ایک جم غفیر کی ضرورت ہے۔ جو اس کی طلعت فشانیوں کو دیکھ دیکھ کر نو اسنجان شب کی طرح زندگی کو اپنے لئے اجیرن بنالیں ادبی دنیا اپریل ۱۹۳۲ء آپ یہ مان کر چلئے کہ اس زبان میں رسالہ نکال رہے ہیں، جس میں بقراط زیادہ سقراط کم پائے جاتے ہیں اردو میں عبد اللہ بن ابی منافق اعظم بیسیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ برادران یوسف جنم لے رہے ہیں۔تو خوف مت کھائے کہ کوئی نہ کوئی قافلہ ایسا ضرور گذرے گا، جو آپ کو اندھیرے کنویں سے نکالے گا۔ بلند عزائم کے ساتھ آگے بڑھئے خدا کی اس دنیا میں کشتیاں جلا کے آگے بڑھنے والوں کی خاصی تعداد رہی ہے۔حیف صد حیف اردو نواز اب ایسی ذلیل وگھٹیا حرکتوں پر اتر آئے ہیں، خدا آپ کو بلند عزم وہمت عطا فرمائے۔ میں اپنی طرف سے نیک تمنائیں اور خواہشات پیش کرتا ہوں اور مکمل تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

مخلص: حقانی القاسمی''

اس خط سے حقانی القاسمی کی محبتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔قاسمی انسانی ہمدردی کے پیکر ہیں، خلوص محبت اور ایثار کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا اعتراف بڑے بڑوں نے کیا ہے اور ان کی صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے لیکن انھیں اب تک ایسا اچھا موقع نہیں مل پایا تھا کہ جس سے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کھل کر پیش کرسکیں۔اسی درمیان صلاح الدین پرویز سے ان کی فلم 'محبتوں کا سفر' کی شوٹنگ کے دوران ممبئی ان کے گھر قیام رہا اور انھوں نے م۔ ناگ، امریش پوری، رضا مراد، عامر خان، آر کے ہانڈہ اور دیگر فلمی ہستیوں سے ملوایا اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ بہت جلد میں ایک سہ ماہی رسالہ

'استعارہ' نکالنے جا رہا ہوں اور اس کے ایڈیٹر رہیں گے م۔ ناگ۔ اتفاق سے ان کی تمام فلمیں فلاپ ہوگئیں اور محبتوں کا سفر بھی مکمل کرنے کے بعد بھی ریلیز نہ ہوسکی اور وہ اپنا سارا کاروبار بند کر کے دہلی شفٹ ہوگئے۔اس دوران دہلی میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ فلمیں وغیرہ تو چھوڑ دیں اور اپنے اس خواب کو پورا کریں جو کہ آپ نے جو کہ بمبئی میں کہا تھا کہ میں ادبی سہ ماہی 'استعارہ' نکالنا چاہتا ہوں۔ دہلی اس کے لئے بہترین جگہ ہے اور یہاں سب زرائع بھی ہیں۔بمبئی میں تو انھوں نے م۔ ناگ کو ایڈیٹر بنانے کی بات کہی تھی لیکن دہلی میں معاملہ دوسرا تھا، حالانکہ دہلی میں ان کے بہت اچھے دوستوں کا بڑا حلقہ تھا، خاص طور سے محمود ہاشمی، شہپر رسول اور بہت سے۔ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ میرے ذہن میں آیا کہ یہی موقع ہے۔ میں نے کہا میں ایسا نام بتا دوں کہ آپ کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ایک ایسا باصلاحیت فنکار جس کو سب نے استعمال کیا ہے۔حقانی القاسمی اور واقعی پھر انھوں نے کر دکھایا۔

''استعارہ'' کی اشاعت اور حقانی القاسمی کی شمولیت نے اردو ادب میں ایک ایسے رسالے کی شروعات کی جس نے ادبی دنیا میں دھوم مچا دی اور ایک سے بڑھ کر ایک شمارہ شائع کیا۔اب حقانی القاسمی کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا بھرپور موقع ملا۔کیسے کیسے مضامین تبصرے حقانی کے آئے کہ ساری ادبی دنیا نے انہیں نئی نسل کا ایک اہم نقاد تسلیم کرلیا۔ پاکستان میں تو یہ عالم ہے کہ حقانی نئی نسل کے سب سے بڑے نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔حقانی اور صلاح الدین پرویز نے مل کر ادبی دنیا میں ایک ایسی ہلچل پیدا کی کہ ان کا استعارہ عصری ادب کا بہترین منظرنامہ پیش کرنے کا سب سے بڑا رسالہ تسلیم کیا جانے لگا اور اس کے مسلسل اداریے تبصرے مضامین پر بحث ومباحثے، ادب کی مختلف اصناف ناول ڈرامہ غزل افسانہ ایسی کوئی صنف نہیں جس پر گفتگو نہ کی گئی ہو اور یہ سب کمال حقانی القاسمی کا تھا۔صلاح الدین پرویز نے بھی پورے اختیارات حقانی کو سونپ دئے تھے اور حقانی نے استعارہ کے ذریعے ادب میں چھائے جمود کو جس سلیقے اور اپنی منفرد تحریروں سے توڑا ہے۔ وہ حقانی القاسمی کا ایک ایسا بڑا کارنامہ ہے کہ ''استعارہ'' کے تمام شمارے اس کے گواہ ہیں۔صلاح الدین پرویز اور حقانی کی دوستی نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا لیکن افسوس صلاح الدین پرویز کی موت نے حقانی کو راستہ ہی میں چھوڑ دیا اور ''استعارہ'' جس سے کہ بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ بند ہوگیا۔میں نے صلاح الدین کی زندگی میں ہی ان پر کتاب ''صلاح الدین بحیثیت نظم نگار'' لکھی تھی جو شائع ہونے والی تھی۔کمپوزنگ بھی ہو چکی تھی کہ صلاح الدین پرویز صاحب نے اس کی سی ڈی منگوالی کہ میں استعارہ پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع کروں گا۔افسوس ان کی موت کے بعد وہ مسودہ بھی کہیں غائب ہوگیا۔ایک بار پھر حقانی اکیلے رہ گئے اور میں بھی اپنے محسن اور کرم فرما سے محروم ہوگیا۔صلاح الدین پرویز کے انتقال کے بعد میری کتاب کی اشاعت تو نہ ہوسکی لیکن حقانی القاسمی نے حق دوستی ادا کر دیا کہ صلاح الدین پرویز کے انتقال کے بعد ان کے مضامین تو شائع ہوتے ہی رہے لیکن ''تنقیدی

اسمبلاژ'' کے نام سے چار سو چھپن صفحات پر مشتمل یہ کتاب صلاح الدین پرویز کے لئے بہترین خراج عقیدت کے طور پر شائع کر کے واقعی حقانی نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ساٹھ کے قریب تمام معتبر لکھنے والوں کے مضامین صلاح الدین پرویز کی شخصیت اور ان کی کتابوں پر تبصرے استعارہ کی اشاعت اور دیگر تحریروں سے مزین ''تنقیدی اسمبلاژ'' حقانی کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جو ایک تاریخ ساز کام ہو گیا۔ اس کتاب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، سلیم احمد، فہیم اعظمی، سحر انصاری، بشیر بدر، محمود ہاشمی، نظام صدیقی، احمد ہمیش، شمیم حنفی، حامدی کاشمیری سے لے کر درجنوں قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں اور سب سے اہم حقانی القاسمی کا دل دہلا دینے والا دیباچہ شامل ہے۔ اس میں حقانی کی دلی کیفیت صلاح بھائی سے تعلق ان کی قربانیاں اور محبتیں اور استعارہ کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کے جذبے سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ حقانی کی ایسی تحریر ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں :

''وہ صبح میرے لئے قیامت کی صبح سے کم نہ تھی، سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگنے لگا جیسے میں خود موت کے ایک تجربے سے گذر رہا ہوں۔ شاید اس موت میں میری بھی موت شامل ہو گئی تھی۔ ان لمحوں اور رتجگوں کی موت میں میری موت بھی شامل ہو گئی تھی۔ ان لمحوں اور رتجگوں کی موت جن میں نئے آئیڈیاز نے جنم لیا تھا۔ ان لفظوں کی موت جو ہم دونوں نے مشترکہ طور پر وضع کئے تھے، تخیل کی چنگاری کی موت جس نے استعارہ کو زندہ رکھا تھا۔ اس ایک لمحے میں جانے کتنی موتیں واقع ہوئی تھیں کہ ان کا شمار میرے لئے مشکل تھا اور ان سب سے بڑی موت استعارہ کی تھی، جو ہم دونوں کی زندگی تھی بلکہ بقول دیگرے ہم دونوں کا ہمزاد۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ استعارہ صلاح الدین اور حقانی کا ایک ایسا خواب تھا کہ اس خواب کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دونوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اپنی نیندیں قربان کیں، دن رات اس کی اشاعت کے لئے کوشاں رہے اور اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ استعارہ حقانی اور پرویز کی پہچان بن گیا۔ استعارہ کا لوگ بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ ساری ادبی دنیا کو اور خاص طور پر نئی نسل کو ایک پلیٹ فارم مل گیا۔ ان کے مسائل ان کی ادبی اہمیت کو تسلیم کرانے، ان پر مضامین اور ان کے حق کے لئے استعارہ کی اشاعت میں اپنا گھر بار اپنی ضروریات کو بالائے طاق رکھ کر پابندی سے نکالنے کا خواب یہ سب کچھ صلاح بھائی کے انتقال سے اچانک ختم ہو گیا اور حقانی صلاح الدین پرویز دونوں ہمزاد کی یہ جوڑی بچھڑ گئی۔ پروفیسر قیصر نجفی نے صحیح لکھا تھا :

ISSN : 2582 - 3612

''استعارہ جسے میں صلاح الدین پرویز اور حقانی القاسمی دونوں کا ہمزاد تصور کرتا ہوں ممکن ہے اہل نظر الگ الگ وجود کا ایک ہمزاد تسلیم کرنے سے گریز کریں۔ ان کے لئے عرض ہے کہ مادھو لال حسینی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اگر مادھو لال اور سائیں حسینی کو ایک دوسرے کا عشق ایک کر سکتا ہے، تو صلاح الدین پرویز اور حقانی القاسمی کو استعارہ کا عشق ایک جان اور سہ قالب کیوں نہیں کر سکتا۔''

یہ سچ ہے کہ یہ صلاح الدین پرویز کی موت نہیں ہے بلکہ استعارہ کی موت ہوئی ہے اور استعارہ کی موت سے حقانی تو اپنے بہترین دوست ایک بھائی سے محروم ہو ہی گئے لیکن استعارہ کی موت سے نئی نسل جس محرومی کا شکار ہوئی ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ حقانی اور پرویز نے استعارہ کی اشاعت کو استحکام بخشا تھا۔ وہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ تھا، جس نے ادب کی دنیا میں ایک تاریخ مرتب کی۔ حالانکہ یہ بات سچ ہے کہ صلاحیتیں چھپتی نہیں ہیں۔ حقانی القاسمی کی شرافت انسانی ہمدردی ایمانداری ان کے اخلاق علمیت قابلیت سے ساری ادبی دنیا واقف ہے۔ ان کی یہی ایمانداری اور قابلیت کو دیکھ کر اسد رضا صاحب نے صلاح الدین پرویز کی موت اور استعارہ کے بند ہونے کے فوراً بعد انہیں روزنامہ راشٹریہ سہارا اور بزم سہارا کی ٹیم میں شامل کر لیا۔ یہ سچ ہے کہ سہارا جیسا میڈیا انہیں مل گیا لیکن ہر اخبار کی کچھ مصلحتیں ہوتی ہیں۔ وہاں قدم قدم پہ مصلحتیں ہیں، استعارہ جیسی آزادی نہیں کہ دونوں نے مل کر ادب کے دھارے کو موڑ دیا۔ استعارہ میں حقانی القاسمی کو اپنی پوری صلاحیتیں اجاگر کرنے کی پوری آزادی تھی اور انھوں نے استعارہ کے چند شماروں میں ہی ثابت کر دیا تھا۔ افسوس ہم استعارہ کی موت سے محروم ہو گئے لیکن مایوس نہیں کہ خدا شاید کوئی راستہ نکال دے اور استعارہ کی پھر سے اشاعت ہو سکے۔ حقانی القاسمی نے اس کتاب میں یعنی ''تنقیدی اسمبلاژ'' میں صلاح الدین پرویز کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر مشتمل کتاب کی اشاعت سے حق دوستی تو ادا کر دیا لیکن کاش کوئی حقانی کی اس کیفیت کا اندازہ لگا سکے، جس کا اظہار انھوں نے اس کتاب کے دیباچے میں کیا ہے کہ جسے پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ۔

وہ ایک شخص دوستو مر تو گیا مگر
روشن جہاں میں پیار کی قندیل کر گیا

Dr. Saifi Sironji
Editor Quarterly"Intesab Aalami",
Saifi library
Sironj-464228
(MP)
Mob.-9425641777

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی

سیّد احمد قادری کے افسانے: حیات وکائنات کا نوحہ

کہانی سننے، کہانی پڑھنے اور کہانی کہنے کا رواج انسانی شعور وفہم کے ساتھ چلا آرہا ہے لیکن ہر عہد میں وہی کہانی سنی اور پڑھی جاتی ہے جو کیف وسرور اور انبساط وشادمانی کے جذبے سے قاری وسامع کو ہمکنار کرتی ہے۔ اس کے لئے کسی عمر اور معیار کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بچے بھی ان کہانیوں سے اکتا کر نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں جو انہیں دلچسپ نہیں محسوس ہوتیں۔ اسی طرح بڑے بھی ایسی کہانیوں کو پڑھنے سے کتراتے ہیں جو ان کی حس اور ان کے شعور کو بیدار نہیں کرپاتی ہیں۔ گویا کہانی کے لئے پہلی شرط یہ ٹھہرتی ہے کہ وہ دلچسپ ہو اور انفراح وانشراح کی کیفیت سے ہمیں دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ مزید یہ کہ دل ودماغ دونوں میں ارتعاش واضطراب بھی پیدا کرسکے۔ رومانی دور سے لے کر حقیقت پسندی تک، ترقی پسندی کے رجحانات سے لے کر جدیدیت تک، علامت نگاری سے تجریدیت تک، مابعد جدید اور ماضی کی بازیافت جیسے میلانات سے الگ ہٹ کر کہانی کو سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ رجحانات ومیلانات کے فکری ونظری جائزے ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔ دراصل دیکھنا یہ ہے کہ کہانی کار نے کہانی کا ٹریٹمنٹ کس زاویے سے کیا ہے اور اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔

قصہ گوئی کے ابتدائی ایام میں بالعموم اس پہلو پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ گہوارۂ تہذیب میں قدم رکھنے کے بعد انسان کو جن تصادمات وحادثات اور امتحانات وخطرات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے نتیجے میں کہانی گڑھنے، بنانے یا بیان کرنے کا جذبہ/ مادّہ از خود بیدار ہوسکے۔ خاص طور پر اس نکتے پر زیادہ باتیں ہوئیں کہ دن بھر کی کڑی دھوپ اور محنت ومشقت سے گزرنے کے بعد اعصابی، جسمانی اور ذہنی طور پر تسکین یا فرحت حاصل کرنے کے لئے قدیم دور کے باسی رات کو الاؤ کے گرد جمع ہوتے اور ان مصروفیات، مہمات اور تجربات کے بارے میں باہم تبادلۂ خیالات کرتے۔ ان کے اسی طرزِ عمل نے آگے چل کر باقاعدہ کہانی سنانے کے جذبے کو مہمیز لگایا۔ ہر چند اس میں مزید اضافے کی ضرورت ہے تاکہ مختلف ادوار سے وابستہ قصوں کہانیوں کے مطالعہ سے انسان کے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے زاویۂ نگاہ کو پرکھنے اور سمجھنے میں ہمیں خاطر خواہ مدد حاصل ہو۔

اس گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ہم جس روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور ہماری کہانی کی تار وپود کی جڑیں جہاں پیوست ہیں، اس میں کہانی کتنی ہی نئی کیوں نہ ہو، وہ کہانی پن سے کلیتاً دامن نہیں چھڑا سکتی ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، شفیع جاوید، خالدہ اصغر، انیس رفیع، شوکت حیات، شموئل احمد، سیّد محمد اشرف، سیّد احمد قادری، سلام بن رزّاق، طارق چھتاری وغیرہ کی کہانیوں میں یہ خوبی ملے گی کہ کہانی میں اظہار کے مسائل خواہ علامتی ہوں یا استعاراتی، تمثیلی ہوں یا تخلیقی، تجریدی ہوں یا ابہامی، معنویت کا نظام اور کہانی کا کہانی کے طور پر پڑھا جانا بنیادی وصف ہے۔ گویا کہانی سے کہانی پن کا اخراج ایک غیر افسانوی عمل ہے۔ ان جیسے کہانی کاروں کا تصوراتی ادبی رشتہ اجتماعی لاشعور کے ان صدیوں پُرانے تقاضوں، روایتوں اور تہذیبی وحکایتی مزاج وافتادِ طبع سے ضرور رہا ہے جو صدیوں کے تجربوں سے حاصل ہونے والے فہم ودانش کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا :

> ''کردار کے نقوش کو اُجاگر کریں یا ٹائپ کو بروئے کار لائیں، بند ماحول کو پیش کریں یا کشادہ کینوس کو سامنے لائیں، قریب سے نظارہ کریں یا دور سے نظر ڈالیں، وہ ہر حال میں مجبور ہیں کہ کہانی کی سطح پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ بصورت دیگر افسانہ جواب مضمون بن جائے گا یا ایک شعری پیکر یا محض نثر کا ایک ٹکڑا۔''

(نئے مقالات، وزیر آغا، ۱۹۷۰ء)

اس ضمن میں مشہور افسانہ نگار رشید امجد کا خیال ملاحظہ کریں :

> ''افسانے میں چاہے وہ نیا ہو یا پُرانا، کہانی پن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اختلاف دراصل کہانی پن کی تعریف کا ہے۔ ہمارے پُرانے افسانہ نگار واقعات کے تسلسل یا اجتماع کو کہانی کہتے تھے، ہم خیال کی اکائی کو بھی اگر اس میں ترتیب قائم ہے، کہانی سمجھتے ہیں۔''

(رشید امجد سے ایک انٹرویو، اوراق، لاہور، ۱۹۹۰ء)

دوسری طرف فکشن اور شاعری کے معتبر تنقید نگار پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کے خیالات بھی سنتے چلیں تاکہ مستور گوشے منور ہوسکیں :

> ''کہانی جس انداز کی بھی لکھی جائے، علامتی، تمثیلی اور مبنی برحقیقت نگاری، کامیاب کہانی وہی ہوگی جو شعور کے مقابلے میں لاشعور اور کسی بیش قیمت تجربے پر مبنی ہونے کی صورت میں ہمارے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر بیدار

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کرسکے۔ ہمارے لئے فراواں، حیرت، مسرت، آگہی اور بصیرت کے
اسباب مہیا کرسکے۔''

(تنقید و تفہیم، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ۲۰۱۲ء، ہم عصر اردو افسانہ، ص:۲۰۲)

افسانے کے حوالے سے محولہ بالا گرانقدر آراء کی روشنی میں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جس طرح غزل کے لئے تغزل کا ہونا بنیادی شرط ہے، اسی طرح افسانے کے لئے کہانی اور افسانویت کا ہونا لازمی ہے۔ افسانویت میں اسلوب، زبان، تکنیک، ہیئت سب کچھ آجاتے ہیں جو ہمیں ایک ایسے ذائقے کا احساس دلاتے ہیں جس میں یہ سارے اجزائے تحلیل ہوجائیں۔ اسے آسانی کے لئے اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ موسیقی میں بہت سارے سُر ایک دوسرے میں مدغم ہوکر دلکش و دلربا نغمے کو جنم دیتے ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب کو جن لوگوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ وسعت و استقامت بخشی، قارئین کو اپنا گرویدہ بنایا، ناقدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور نئی فنّی بلندیاں سر کیں، ان میں ایک قابل ذکر نام سیّد احمد قادری کا ہے۔ سیّد احمد قادری نے اپنی کہانیوں سے افسانوی ادب کو ایقان و اعتبار سے ہمکنار کیا ہے اور ان راہوں میں اپنے نقوش قدم بھی مرتسم کئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مقلدین کی بھیڑ میں ان کی آواز گم نہیں ہوتی اور کہانی کے بنیادی تقاضوں کو انہوں نے فراموش بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نئے تجربے کی تازگی و تابانی کے ساتھ ساتھ مشاہدات و مظاہر کا تنوع موجود ہے جو ان کی قوت وعظمت کو ضوبار کرتے ہیں۔

سیّد احمد قادری ایک کثیر الجہات اور کثیر الصفات شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تحریرات کا کینوس بے حد وسیع رہا ہے اور ان کا ادبی تشخص مختلف خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ بیک وقت ناقد، محقق، صحافی، ادیب، افسانہ نگار، مؤلف، مترجم اور مرتب ہیں۔ لہٰذا ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ان اصناف کے وسیلے سے اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے اور اپنا انفراد و امتیاز بھی قائم کیا ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بنیادی طور پر سید احمد قادری نے ایک ممتاز، منفرد، مفتخر اور معتبر افسانہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ موصوف کی تحریروں میں نہ صرف ان کے نقوش قدم بہ آسانی تلاش کئے جاسکتے ہیں بلکہ ان کے امتیازی اوصاف کی زرخیزی و زرتابی بھی نمایاں ہوتی ہے۔

سیّد احمد قادری نے 'ریزہ ریزہ خواب' (۱۹۸۵ء)، 'دھوپ کی چادر' (۱۹۹۵ء) اور 'پانی پر نشان' (۲۰۰۶ء) جیسے افسانوی مجموعے کی معنی خیزی و معنی آفرینی کے ذریعہ افسانوی تاریخ میں اپنی مہر ثبت کردی ہے۔ ان مجموعوں کی کہانیوں کا اختصاص یہ ہے کہ زندگی کی قدروں کی خواہ وہ معاشرتی ہوں یا تہذیبی، سیاسی ہوں یا مذہبی، تاریخی ہوں یا ثقافتی، عمرانی ہوں یا سماجی، ہر ایک کی بھرپور نمائندگی ان میں ملتی ہیں۔ اور یہ

ISSN : 2582 - 3612

نمائندگی داخلیت اور خارجیت کے شعوری عمل کے وسیلے سے تخلیقی اور بیانیہ اسلوب اظہار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو افسانہ اور قاری کے درمیان وقوع پذیر ہونے والے رشتے کے انہدام کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی کی تفہیم اور اس کی شناوری کے گہرے اور منفرد تجربے کی فراوانی رہی ہے جو ان کے افسانوں کو تہ داری و طرح داری عطا کرتی ہے۔ دراصل سید احمد قادری نے اپنے عہد کے واقعات و حادثات اور تضادات و تصادمات کا دوربیں نگاہوں سے مطالعہ و محاسبہ کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کیا ہے اور پھر اپنے تجربات میں قاری کو شامل کرکے اپنے افسانوں کو تخلیقی شعلگی سے ہم رشتہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

''ملبہ'' (۲۰۱۵ء) سید احمد قادری کا حالیہ اور تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کے گہرے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور طویل ریاضت و محبت کا خاصا دخل رہا ہے۔ اس مجموعے کے ذریعہ سید احمد قادری نے اردو افسانے کا ایک ایسا منظرنامہ ترتیب دیا ہے جو نہ صرف اپنی ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی کے سبب اپنے پیش رووں کے تجربات کی تکرار سے انحراف ہے بلکہ نئے امکانات و مضمرات سے روشن بھی ہے۔ ''ملبہ'' میں سید احمد قادری نے حیات و کائنات کے مختلف رنگ و آہنگ کو بڑی ذمہ داری، چابک دستی اور ہنرمندی کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ''ملبہ'' کے محتویات اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ زندگی کے حقائق کو سید احمد قادری نے زبان عطا کردی ہے اور زندگی کے کلیدی آفاق کو روشن کردیا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''ملبہ'' بیالیس (۴۲) افسانوں پر مشتمل ہے جس میں چند افسانے گذشتہ مجموعوں سے بھی شامل کئے گئے ہیں لیکن بیشتر افسانے نئے ہیں۔ ان افسانوں میں کچھ علامتی و تمثیلی ہیں تو کچھ استعاراتی و بیانیاتی لیکن ہر جگہ ماجرا سازی، کردار نگاری اور بیانیہ طرز اظہار نے ان افسانوں کو بالیدہ و بامعنی بنادیا ہے۔ یہ سارے افسانے نہ صرف زندگی کے مختلف و متنوع گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ کہانی کے اعلیٰ ترین تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ موضوعات کی سطح پر ان میں ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف محسوسات کی سطح پر بھی ان میں وہ واردات و کیفیات شامل نظر آتی ہیں جن کی بدولت دل اور ذہن مضطرب و مرتعش ہوجاتے ہیں۔

''ملبہ'' سید احمد قادری کے چالیس برسوں کی ریاضت کی زندہ اور تابندہ مثال ہے جس میں انہوں نے اپنی فنکارانہ صلابت، خداداد صلاحیت، گہری حساسیت، ذہنی بالیدگی، سنجیدہ گامی، قلم کی سبک ساری، ژرف نگاہی اور تخلیقی تب و تاب کے وہ جواہر دکھائے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر ایک نئی سرشاری اور تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی نادرہ کاری قابل دید ہوجاتی ہے۔ ہم سید احمد قادری کے ان افسانوں کو پڑھ کر سرسری طور پر نہیں گزر سکتے ہیں۔ یہ افسانے ہمیں کہیں چونکاتے ہیں تو کہیں غور و فکر کے لئے مجبور کرتے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہیں، کوئی واقعہ یا موضوع ہمیں استعجابی و تحیراتی کیفیتوں میں مبتلا کرتا ہے تو کوئی کردار اپنے عمل اور ردِّ عمل کی وجہ سے ہمارے ذہن کے تاروں میں انتشار و ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی جذبات کی آندھیاں خس و خاشاک کی طرح سب کچھ اُڑا کر لے جاتی ہیں تو کبھی حالات کی سفاکی حسین خوابوں کے محل کو زمیں بوس کر دیتی ہیں، کبھی دل میں خواہشوں اور امنگوں کے دریا موجزن ہوتے ہیں تو کبھی زندگی درد کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں دل کے کنج میں پھول کھلنے کی سرخوشی محسوس ہوتی ہے تو کہیں ناتمام خواہشات کی محزونی کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں محبوب کی یادوں کی دستک سنائی دیتی ہے تو کہیں بے لوث محبت کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ گویا زندگی کے تمام تر وسعت و آفاق اور عرفان و آگہی قدرے تازگی و شگفتگی اور حدت و ندرت کے ساتھ ان کے افسانوں میں نہ صرف جلوہ گر ہوتے ہیں بلکہ ایک بڑے کینوس پر بھی پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔

عصری زندگی اور اس کے مسائل و معاملات کی عکاسی کی زندہ تصویروں کے مناظر و مظاہر کا مطالعہ سید احمد قادری کے ''ملبہ'' میں کیا جا سکتا ہے۔ قادری نے مسلسل سلگتے ہوئے مسائل، وجودی تہذیبی، نفسیاتی اور گہرے سیاسی و سماجی سروکار کو اپنی مرتعش فکر کا محور بنایا ہے۔ بے مہری حیات کی ناقدری و ناسپاسی، تاجرانہ ذہنیت کی بالا دستی 'بازاری' تہذیب کے جس عہد سے ہم گزر رہے ہیں اور جس درد و کرب اور انحطاط و زوال کو انسانی زندگی جھیل رہی ہے، اس کے تناظر میں سیّد احمد قادری کے افسانوں کی افادیت و معنویت بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کے فکری رویے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ مشینی زندگی کے تمام تر خد و خال ان کی نگاہوں میں رہے ہیں اور آج کی زندگی جو پیچیدگی اور ریاکاری کا مرقع بنی ہوئی ہے، وہ بھی ان کے حلقۂ فکر و خیال میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔

سیّد احمد قادری کے افسانوں کے انفراد و اختصاص کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں کسی فکر و فلسفہ، رجحان و میلان، عقیدہ و نظریہ اور آئیڈیولوجی یا منشور کا کوئی جبر نہیں ہے اور نہ ہی کسی بنی بنائی لکیر یا فارمولے کے مطابق لکھنے پر اصرار ہے۔ انہیں اس امر کا اندازہ ہے کہ کسی مخصوص آئیڈیولوجی یا کلیشے میں فنکار جب مقید و محصور ہو جاتا ہے تو فن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور فن پارہ کہیں دور پڑا ہانپتا رہتا ہے۔ انہوں نے پورے ایمان و ایقان کے ساتھ زندگی کو اپنے افسانوں میں تمام فنّی لوازم کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی صنفی قدر و قیمت سے محروم ہوئے بغیر فضا میں خوشبو کی صورت پھیل جاتی ہے اور اپنے قاری کو ایک مسرت آمیز ذہنی اضطراب اور روحانی خلش میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہے۔ سیّد احمد قادری نے حالات و کوائف کو اس طرح سمیٹا ہے کہ زندگی کی بے کرانی و بے مائیگی کے ساتھ ساتھ

ISSN : 2582 - 3612

اس کی تلخیاں و ترشیاں نمایاں ہو کر دل و دماغ کو ایک خاص قسم کا تاثر دینے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ قادری نے مزاحم قوتوں کے خلاف اپنے احتجاج و اضطراب اور تنفر و تنغض کے حق کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اپنی کہانیوں کی بنت کاری میں انہوں نے اس قدر چابک دستی، مہارتِ فن، شعورِ باطن اور بالغ نظری کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ پڑھ کر طبیعت شگفتہ و سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ بے چین و بے کیف ہو جاتی ہے۔

عہد حاضر میں گلوبلائزیشن کے حوالے سے جس طرح آج دہشت و بربریت، تشدد و غارت گری اور نسل کشی کے واقعات سے پیدا شدہ مناظر نظر آتے ہیں اور روح کو پارہ پارہ کر دینے والے سفاکانہ مظالم اور سیاسی و سماجی جبر کی دلدوز کہانیوں سے ہمارے ذرائع ابلاغ بھرے دکھائی دیتے ہیں، اس حقیقت سے کسی کو انکار و انحراف نہیں۔ سید احمد قادری ایک اولوالعزم فنکار ہیں اور حرمت منصب سے آشنا بھی، اس لئے وہ ان سفاک حقائق سے چشم پوشی کرنے کے بجائے اس عہد کی زخم خوردہ روح سے ہم کلام ہونے کی جسارت کرتے ہیں اور تہذیبِ جدید کے چہرے پر پڑی ہوئی دبیز نقاب کو الٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قادری کے افسانے معاشرتی زبوں حالی، سیاسی سماجی ظلم و استبداد، استحصال و فریب کاری اور آمریت کے خلاف اضطراب و احتجاج اور غم و غصّے کی افزائش کا سبب بھی بنتے ہیں اور ہمارے ذہن و ضمیر پر بہت دیر تک نشتر زنی کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

''ملبہ'' کے محتویات میں موضوعات کی فراوانی ہے۔ چونکہ سید احمد قادری کا وژن آفاقی ہے، اس لئے کسی مخصوص موضوع پر اکتفا کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ وہ بغیر کسی ترغیب، خوف یا ذہنی دباؤ کے اپنی صوابدید کے مطابق موضوعات منتخب کرتے ہیں اور اپنی صلابت فکر اور فطانت ذہن کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ زندگی کی ناہمواریاں، قدروں کی شکست و ریخت، تہذیبی انہدام، ثقافتی زوال، جنگ و جدال کے مناظر، زر و جواہر کی لعنت، نیوکلیائی اسلحوں کے سر اُبھارتے خدشات، گلوبل کلچر، فرد اور سماج کے مابین تزاحم و تصادم، سرمائے کے تسلط کے نئے پیرائے، سائبر اور انٹرنیٹ سماج، صارفیت کا پھیلاؤ، سسکتے ہوئے معصوم چہرے، فاقہ کش لوگ، رشتوں کی مٹی کی نمناکی وغیرہ سارے موضوعات ان کے محتویات میں شامل رہے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ زندگی کے کسی نہ کسی شفق پر محیط ہوتا ہے جس کے مناظر دیکھ کر دیدۂ حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے اور رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ چونکہ قادری نہ تو قنوطی ہیں اور نہ رجائی بلکہ قنوطیت اور رجائیت ان کے افسانوں میں کچھ اس طرح ہم آمیز ہو گئے ہیں کہ ایک نئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور جس جس جگہ جس شق کا تقاضہ ہوتا ہے، وہ اُبھرتی ہے۔

''ملبہ'' کے افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی نیرنگی و بوقلمونی نے ایک پورا جہان آباد کر رکھا ہے لیکن سارے افسانوں پر الگ الگ بحث کرنا مقصود نہیں۔ پھر بھی کچھ افسانوں کا ذکر ناگزیر ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کہ یہ افسانے نہ صرف 'افسانوی انتخاب' میں شامل ہونے کے لائق ہیں بلکہ سید احمد قادری کی ذہنی بالیدگی کا ہمیں بھرپور احساس دلاتے ہیں۔

افسانہ ''ملبہ'' سیّد احمد قادری کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس افسانے میں روح عصر کچھ اس قدر پیوست ہے کہ مادّی حقائق کے تمام نقوش ونفوس جلوہ ساماں نظر آتے ہیں۔ اس افسانے میں انہوں نے وقت کی آندھی اور ملک کی تباہ کاریوں کا نوحہ پیش کیا ہے۔ وقت کی آندھی میں سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے، کچھ بھی سالم نہیں رہتا ہے۔ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو صرف ملبہ اور یہ 'ملبہ' رہ رہ کر تڑپاتا ہے اور کرب میں اضافہ کرتا ہے۔ ہم خاموش تماشائی کی طرح صرف تباہی و بربادی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ سید احمد قادری نے یہاں تباہ ہوتی ہوئی زندگی اور ملبہ کی صورت میں بکھرے ہوئے وجود کی بُنت کاری ہنرمندانہ طریقے سے کی ہے۔ ایک ایسی زندگی اور ایک ایسا وجود جو کبھی اپنی پہچان رکھتا تھا لیکن وقت کے ملبے میں وہ شناخت اور پہچان معدوم ہو گئی۔ اس کی منظرکشی میں صرف خارجیت ہی نہیں، داخلیت بھی نظر آتی ہے جو قاری کے قوت مشاہدہ اور جمالیاتی حس کی وساطت سے ایک محاکاتی فضا قائم کر دیتی ہے۔ آج کے تناظر میں اس افسانے کا موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آج پوری دنیا میں سیاسی ریشہ دوانیوں کے سبب جس طرح انسانیت خاک بسر اور انسانی وجود روحانی تشنج اور خلفشار سے دوچار ہے، یہ وہ مناظر اور مقامات ہیں، جن کی نظیر انسانی آنکھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وجودی دہشت، اذیت اور اصطباغ ذہنی اس مقام تک آ پہنچی ہیں کہ ہماری روح پر تازیانے لگاتے رہتے ہیں۔ قادری نے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی خیر اور صداقت کی جستجو میں رخت سفر باندھ رکھا ہے۔ یہ افسانہ دیر تک ہمارا تعاقب کرتا ہے اور ہمارے وجود کے نہاں خانوں میں بازگشت کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ ہماری حسیت کا مقدس حصہ بن جاتا ہے۔

افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' انسان کے بدلتے مزاج کو ظاہر کرتا ہے اور موجودہ عہد کے سنگین مسئلوں پر گفتگو کی فضا ہموار کرتا ہے۔ یہ اپنے اندر کئی ابعاد و جہات رکھتا ہے۔ اس افسانے میں موجودہ عہد اور زندگی کی تمام تر تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تنہائی اور تاریکی کے جبر نے شدت کے ساتھ دلوں پر ڈیرہ جما رکھا ہے لیکن ہماری بے حسی اور مفاد پرستی ہمیں اس گھٹن کا اندازہ لگانے میں مانع رکھتی ہے۔ انسانوں کے بیچ محبت، خلوص اور تقدس کی جو فضا قائم ہوئی تھی، اب وہ بہت حد تک مکدر ہو گئی ہے۔ زندگی کی اس تلخ حقیقت کی تصویرکشی مہارت سے کی گئی ہے۔ معاشرے کی مایوس کن صورت حال، اخلاقی و تہذیبی زوال اور اقدار کی پامالی کے باوجود قادری مایوسی، غصہ اور احتجاج کے شکار نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک مثبت فکر کے ساتھ جیتے ہیں جو ان کے افسانوں کے کلیدی آفاق بن جاتے ہیں۔

''دوراہے پر کھڑی زندگی''، ''دنیا ننگی ہے''، ''مانگے کا اُجالا''، ''آنگن کی بات''، ''دستک رشتوں

کی'' وغیرہ جیسے افسانے آج کے مسائل سے آنکھیں چار کرتے ہیں۔ آج انسان نت نئے مسائل میں الجھا ہوا ہے اور ان سے نجات بھی حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لئے وہ طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرتا ہے اور سکون قلب کے لئے سو سو طرح کے جتن بھی کرتا ہے لیکن سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ افسانہ نگار کی ذہنی کشمکش اور اس کے درد کی زیریں لہریں ان افسانوں میں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں اور زندگی کے تمام مظاہر و امکانات کو اجزا میں تقسیم کر کے دیکھنے کے بجائے فرد اور سماج، زمین اور زماں، جسم اور جاں کو ایک غیر منقسم اکائی کے طور پر تسلیم کراتی ہیں۔

یہ اور اس طرح کے کئی افسانے آپ کو ''ملبہ'' میں بکھرے دکھائی دیں گے، جن میں نادرہ کاری کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی نظر آئے گی۔ ان کے افسانے طویل ہوں یا مختصر، اپنے بیانیہ کی داخلی قوت اور ہنرمندی کے سبب اپنے اندر بے پناہ اثر پذیری اور جاذبیت کے امکانات رکھتے ہیں۔ سید احمد قادری کے حدیث دل اور حکایت آرزو سماجی نظام کے تمام تر صفات سے اس قدر مزین ہیں کہ ان میں ایک ایسے دھڑکتے دل کی آواز سنائی دیتی ہے جو درد جہاں کا پیام دیتی ہے۔ سید احمد قادری نے جہاں زبان و بیان کی سطح پر افسانے کو نیا پن اور ندرت بخشا ہے، وہیں افسانوں کے فکری اور معنوی پس منظر کو بھی وسعت و گہرائی عطا کی ہے۔

سیّد احمد قادری کے افسانوں کا اختصاص پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ''ملبہ'' موصوف کے فکر و فن کی ارتقائی صورت ہے جس پر پڑھنے والوں کی نظر ہونی چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی انفرادیت و اہمیت کو تسلیم کرنا انصاف کے عین متقاضی ہے۔

Dr. Asim Shahnawaz Shibli
P. G. Deptt. of Urdu
Moulana Azad College
Kolkata
Mob.- 98311 56932

انوارالحسن وسطوی

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں :2 مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

اردو شعروادب کے نامور استاد، معروف ادیب وناقد اور اردو تحریک کے مشہور قافلہ سالار ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی رحلت اردو شعروادب کا نقصان تو ہے ہی، خود میرا ذاتی نقصان بھی ہے۔ محبی ممتاز صاحب سے میرے تعلقات 40/برسوں پر محیط تھے۔ جنوری 1980ء میں جب ان کی تقرری بہار یونیورسٹی کے آر۔این۔کالج، حاجی پور میں بحیثیت اردو لکچرر ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں اردو املا کے تعلق سے ان کے کئی مضامین روزنامہ ''صدائے عام'' پٹنہ میں شائع ہوئے تھے۔ ان کے ان مضامین پڑھ کر میں متاثر ہوا تھا اور ان سے ملاقات کی غرض سے ان کی قیام گاہ واقع محلّہ نون گولہ، حاجی پور پہنچا تھا۔ اس پہلی ملاقات نے ہم دونوں پر ایسا جادو کر دیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ پھر مکمل چالیس سال تک ہم دونوں کا تعلق نہ صرف بغیر کسی رکاوٹ کے برقرار رہا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان بھی چڑھتا گیا۔ ہماری دوستی اتنی مضبوط اور مستحکم ہو گئی جسے دیکھ کر کچھ لوگ ہم دونوں کو ایک چنے کی دو دال اور کچھ لوگ ایک جان دو قالب کہنے لگے۔ ہم دونوں کی دوستی کی بنیاد ''اردو'' اور صرف ''اردو'' تھی۔ اردو ان کا بھی اوڑھنا بچھونا تھا اور میرا بھی۔ ویشالی ضلع کی تین دہائی کی اردو تحریک میں ہم دونوں شانہ بشانہ رہے۔ ''انجمن ترقی اردو'' ہو یا ''کاروانِ ادب'' وہ کمیٹی کے صدر رہے اور ناچیز سکریٹری رہا۔ ان تنظیموں کے پلیٹ فارم سے ویشالی ضلع میں اردو کی ادبی ولسانی تحریک کس قدر مضبوط ہوئی اس سے بہار کی اردو آبادی بخوبی واقف ہے۔ چنانچہ ایسے مشفق رفیق اور مخلص دوست کی رحلت میرے لیے کسی سانحہ سے کم نہیں ہے۔ موصوف کی چالیس سالہ رفاقت کے قصے کو بیان کرنے کی فی الوقت مجھ میں نہ ہمّت ہے اور نہ سکت۔ لیکن غم کا بوجھ ہلکا کرنا ضروری سمجھتے ہوئے یہ بے ربط سی تحریر سپردِ قلم کرنے کی ہمّت جٹائی ہے، جسے نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ایک صاحبِ طرز نثر نگار اور دیدہ ور ناقد کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنی شناخت رکھتے تھے۔ موصوف ادیب وناقد کے علاوہ محقق، مبصّر اور دانشور کی حیثیت سے بھی معروف رہے۔ موصوف کا شمار اقبال شناسوں اور ماہرِ لسانیات میں بھی ہوتا تھا۔ وہ صحت زبان کے ایک مثالی معلّم تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کے مطالعہ، تفہیم اور تدریس میں گزاری۔ انھوں نے تقریباً

38/سال کی لمبی سروس مدّت میں پہلے آر۔این۔کالج (حاجی پور) اور بعد میں بہار یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس لمبی مدّت میں اردو کی ایک نسل تیار کی جو آنے والے دنوں میں اردو کا علَم بلند رکھے گی اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا نام استاذالاساتذہ کی حیثیت سے تادیر یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی کئی تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں جن کے نام ہیں: ''ادب اور ادبی رویّہ'' (تنقیدی مضامین)، ''اقبال: شاعر ودانشور''، ''اردو میں مرصع نثر کی روایت'' (تحقیقی مقالہ)، ''متاعِ لوح وقلم'' (تنقیدی مضامین)، ''متاعِ نقد ونظر'' (تنقیدی مضامین)، ''قندیلیں'' (شخصی وتاثراتی مضامین)۔ آخرالذکر کتاب سالِ رواں کے فروری ماہ میں دہلی سے چھپ کر آئی ہے، جس کا اجرا مرحوم نے 14/مارچ 2021ء کو اپنی ذاتی لائبریری (ممتاز لائبریری) کے ہال میں بزرگ شاعر ناشاد اورنگ آبادی کے ہاتھوں کرایا تھا۔ یہ کتاب 62/مرحومین اور 2/قائمین شخصیتوں کے احوال وآثار پر مشتمل ہے جن میں اردو شعروادب کی مقتدر ہستیاں بھی ہیں، علماء دین بھی ہیں، موصوف کے خاندان کے افراد بھی ہیں، اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک کے ان کے اساتذہ بھی ہیں اور ان کے حلقۂ احباب کے افراد بھی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے بڑی محنت سے تمام شخصیات کے اوصاف حمیدہ کو اپنی تصنیف ''قندیلیں'' میں محفوظ کر کے خود راہی ملک عدم ہو گئے۔ اللہ کو ان سے یہ کام لینا تھا، لہٰذا اللہ نے ان سے یہ کام لے لیا۔ موصوف اپنی اس تصنیف پر بے حد خوش تھے۔ اتنا خوش تھے کہ انھیں اتنا خوش ان کی کسی دوسری تصنیف پر نہیں دیکھا گیا تھا۔ انھوں نے حاجی پور کے علاوہ پٹنہ، مظفر پور اور دوسری جگہوں پر اپنے احباب اور علم کے قدردانوں کے درمیان اپنی یہ کتاب خود جا کر پہنچائی۔ کچھ مقامات پر انھوں نے اپنی یہ کتاب بذریعہ ڈاک روانہ کی۔ مظفر پور میں جناب عالیجنات پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کو اپنی کتاب پیش کر کے لوٹنے لگے تو غیر ارادی طور پر دونوں حضرات جذباتی ہو گئے اور ایک دوسرے کو پکڑ کر رونے لگے۔ یہ بات ممتاز صاحب نے ہی مجھے بتائی تھی۔ رونے کی وجہ اس وقت تو سمجھ میں نہیں آئی، لیکن ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے انتقال ہو جانے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ چونکہ دونوں حضرات کی یہ آخری ملاقات تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے اسی لیے منجانب اللہ یہ سب کچھ ہو گیا۔ پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب ممتاز صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ممتاز صاحب کے انتقال کی خبر سے ان کے دل کا کیا عالم ہوا ہوگا یہ تو وہی جانتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صبرِ جمیل دے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا ایک مسودہ ''دُردِ تہِ جام'' (تنقیدی مضامین) کے نام سے اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار سے گذشتہ فروری میں اشاعت کے لیے منظور ہو چکا تھا۔ رمضان المبارک کے بعد اپنی اس کتاب کو اشاعت کے لیے وہ دہلی بھیجنے والے تھے۔ قبل ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ان کا بُلاوا

آ گیا اور انھوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اکثر ملاقاتوں میں مجھ سے یہ کہا کہ ''دُردِتہِ جام'' میری آخری کتاب ہے۔ شاید اس کے بعد اب میری کوئی دوسری تصنیف منظر عام پر نہیں آئے۔ موصوف کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ انشاء اللہ حالات سازگار ہوتے ہی ان کی اس کتاب کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرانے کی سعی کی جائے گی۔ لیکن اپنی اس کتاب کو دیکھنے کے لیے وہ اب دنیا میں نہیں ہیں۔ اس کا ملال ان کے خانۂ افراد اور ان کے چاہنے والوں کو ہونا فطری بات ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی ادبی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی تنقید نگاری ہے انھوں نے ادبی موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے۔ ان کی سات کتابوں میں چار کتابیں تنقیدی مضامین پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا ناقدانہ موقف حد درجہ معروضی، متوازن اور غیر جانبدار رہا۔ ان کی تنقیدی نگارشات اخلاقی اقدار کی حامل نظر آتی ہیں۔ وہ اخلاقی وانسانی قدروں کی بالادستی ہر حال میں چاہتے تھے۔ وہ مغرب کے مادّی افکار و نظریات سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور انھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکوں سے الگ رہ کر ادب وشاعری کی جانچ پرکھ کی۔ انھوں نے ممتاز ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ اسٹنٹ ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ انھیں اپنے تحقیقی مقالہ (اردو میں مرصع نثر کی روایت) کا نگراں منتخب کیا اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ لیکن ادبی تنقید میں ان کی انتہاپسندی سے کھل کر اختلاف کیا اور اپنے ادبی نظریہ میں اعتدال اور توازن کو ہی گلے لگائے رکھا۔ وہ ہمیشہ پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر عبدالباری، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، پروفیسر نجم الہدیٰ اور پروفیسر احمد سجّاد کی طرح ادب میں اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن رہے۔ ان کے صالح تنقیدی شعور کا اعتراف اردو شعر وادب کے کئی نامور اور سرکردہ ناقدوں اور ادیبوں نے کیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے تنقیدی مضامین نہ صرف ہندوستان کے اہم رسائل میں شائع ہو کر قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے بلکہ ان کے کئی مضامین پاکستان کے ادبی رسائل میں بھی شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ بلاشبہہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ادبی دنیا میں شہر حاجی پور اور ضلع ویشالی کی نمائندگی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ایک مثالی استاد، اردو کے ممتاز ادیب وناقد اور ماہرِ اقبالیات کے ساتھ ساتھ اردو تحریک کے مشہور قافلہ سالار بھی تھے۔ اردو تحریک سے ان کی وابستگی چار دہائیوں پر محیط ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے قلم سے اردو ادب کی آبیاری کی وہیں شہر حاجی پور اور ضلع ویشالی میں اپنے رفقائے کار کے تعاون سے سرگرم اردو تحریک چلائی جس کی بازگشت نہ صرف ریاستی سطح پر سنی گئی بلکہ ملکی سطح پر بھی اس کا اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی قیادت میں تقریباً تیس سالوں تک ضلع ویشالی میں اردو کی ادبی ولسانی تحریک پورے آب وتاب کے ساتھ چلی۔ درجنوں ادبی سمینار، سمپوزیم اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ کئی

درجن کتابوں کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ طلبہ وطالبات کے لیے تحریری وتقریری مقابلے منعقد کرائے گئے، کوئز مقابلوں کا انعقاد ہوا۔ درجنوں ادبا وشعرا کے اعزاز میں ادبی وشعری نشستوں کا بھی انعقاد کیا گیا جن کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی قائدانہ صلاحیت کے مدنظر انجمن ترقی اردو، بہار کے بحرانی دور میں انھیں 2009ء میں انجمن ترقی اردو، بہار کا کارگذار صدر بھی بنایا گیا۔ انجمن ہٰذا کے جن اراکین عاملہ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو کارگذار صدر بنائے جانے کی حمایت کی ان میں پروفیسر سہیل احمد، ڈاکٹر نجیب اختر، محمد رسول اختر، ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ)، ڈاکٹر سید احمد قادری، سید فضل وارث (گیا)، پروفیسر اسرائیل رضا، تمنّا مظفرپوری (پٹنہ)، انوارالحسن وسطوی، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق (حاجی پور)، حبیب مرشد خاں، محمد منظور حسن (بھاگلپور)، ڈاکٹر امتیاز انجم (سہرسہ)، پروفیسر احترام الیقین اور ڈاکٹر کونین اختر (مظفرپور) کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے انجمن کے کارگذار صدر ہونے کا بہار کے علمی وادبی حلقے میں بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن چند اراکین انجمن کی مخالفت کے سبب ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے بد دل ہو کر عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر بعد کے دنوں میں انجمن ہٰذا سے ان کی علیحدگی بھی ہو گئی۔

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ شہر حاجی پور اور ضلع ویشالی کی ادبی سرگرمیوں کے اصل محرک اور روحِ رواں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ہی تھے۔ اس سچائی کا اعتراف ضلع کے دیگر لوگوں کے علاوہ معروف ادیب وشاعر پروفیسر ثوبان فاروقی مرحوم (سابق صدر شعبۂ اردو، آر۔ این۔ کالج، حاجی پور) نے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے اعزاز میں منعقدہ ایک تہنیتی مجلس میں کیا تھا:

> ''ممتاز صاحب کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ تمام کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ وہ ایک مثالی استاد اور اردو کے مستند ادیب اور اعلیٰ درجہ کے ناقد ہیں۔ بے شمار مضامین ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حاجی پور میں انھوں نے علمی وادبی فضا قائم کی اور لوگوں کے اندر علم وادب کا ذوق پیدا کیا اور ویشالی ضلع میں اردو تحریک کو مضبوط کرنے کی جدوجہد کی۔''

(ڈاکٹر ممتاز احمد خاں: ایک شخص ایک کارواں۔ مرتّب: ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق۔ ص۔ 118)

خلاصۂ کلام یہ کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی شخصیت اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو تحریک کے حوالے سے بھی اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ اردو کے پروفیسر تو بہت لوگ ہوئے اور ہیں لیکن اردو تحریک سے بہت کم لوگوں کی وابستگی رہی ہے۔ تحریکِ اردو میں ان کی نمایاں خدمات کے سبب بہار کی اردو تحریک کی تاریخ

میں ان کا نام یقیناً محفوظ رہے گا اور نئی نسل کے لیے ان کی خدمات مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ایک آئیڈیل انسان تھے۔ ادب نوازی، علم دوستی، نرم گفتاری، حسنِ اخلاق، منکسر المزاجی اور مہمان نوازی ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی تھیں۔ اپنی سیرت، اخلاق اور کردار سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے اور اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ دوست تو دوست دوستوں کے دوست اور رشتہ داروں کے رشتہ دار سے بھی نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے اور انھیں یاد رکھتے تھے۔ دراصل وہ دوست بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا اور نہ وہ کسی سے دشمنی رکھتے تھے۔ وہ بالکل بے ریا اور بے ضرر انسان تھے۔ ان کی ایک بڑی خوبی اور انفرادیت یہ تھی کہ وہ یک طرفہ دوستی بھی کرتے تھے۔ کوئی ان سے ملے یا نہ ملے، فون کرے یا نہ کرے، لیکن وہ پابندی سے لوگوں کی خیریت دریافت کرنے لوگوں کے گھر پہنچ جاتے یا پھر فون سے خیریت دریافت کرتے۔ ان کی ایک بڑی اور نمایاں خوبی یہ تھی کہ انھوں نے دولت مندوں اور مالداروں سے کبھی دوستی نہیں رکھی۔ سیاست دانوں سے بھی دوری ہی بنا کر رکھا۔ انھوں نے عام لوگوں سے دوستی بنائے رکھنے کو ہمیشہ ترجیح دی۔ ان کی اگر کسی سے دوستی ہو جاتی تو وہ اس کے بیٹے اور پوتے سے بھی دوستانہ طریقے سے ہی ملتے تھے۔ وہ خود بہت پڑھے لکھے انسان تھے، اس کے باوجود وہ اہل علم کی بے حد قدر کرتے تھے۔ خصوصاً علمائے کرام کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے طالب علموں کے علاوہ دیگر نو وارد ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے تھے۔ ان کی اس بے لوثی کا یہ ثمرہ ہے کہ انھوں نے کتنے نوجوانوں کو ادیب و فنکار بنا دیا۔ فی زمانہ اکثر پڑھے لکھے لوگ حتّیٰ کہ کچھ علمائے کرام بھی مسلک اور برادری کے امتیاز کے شکار ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اس روگ کو اپنے پاس کبھی پھٹکنے نہیں دیا۔ یہی سبب ہے کہ ہر مسلک اور برادری کے لوگ ان کے دوست اور رفیق تھے۔ وہ بہ اعتبارِ عقیدہ غیر مقلد تھے لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنے عقیدے کی تبلیغ اور تشہیر نہیں کی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرا مذہب بھی ''اسلام'' ہے اور میرا مسلک بھی ''اسلام'' ہے۔ موصوف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر سے کافی متاثر تھے۔ اردو شاعروں میں علامہ اقبالؒ ان کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ جس کا اظہار ان کی تحریروں، تقریروں اور گفتگو سے ہوتا تھا۔ علامہ اقبالؒ پر ان کی تصنیف ''اقبالؔ: شاعر و دانشور'' اقبالؔؒ سے ان کی والہانہ محبت کی دلیل ہے۔ ان کی یہ کتاب اقبالیات کے باب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی اس کتاب کے سبب وہ یقیناً تادیر یاد رکھے جائیں گے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ابن رضوان احمد خاں کی پیدائش 13؍ستمبر 1953 (تعلیمی اسناد کے مطابق) کو موضع مروّت پور، مہنار (ویشالی) میں ہوئی۔ انھوں نے 1970ء میں ہائر سکنڈری کا امتحان مہنار ہائر سکنڈری اسکول سے پاس کیا۔ 1975ء میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے (اردو آنرس) کی ڈگری

ISSN : 2582 - 3612

حاصل کی۔ 1977ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے اور 1978ء میں اسی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے پہلی ملازمت پروفیسر کلیم الدین احمد کی ادارت میں انگریزی۔ اردو لغت سازی پروجکٹ میں بحیثیت اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کی۔ بعدہٗ جنوری 1980ء میں بہار یونیورسٹی، مظفر پور کے تحت حاجی پور کے آر۔ این۔ کالج کے شعبۂ اردو میں لکچرر بحال ہوئے جہاں پروفیسر ثوبان فاروقی صاحب صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے 1988ء میں ''اردو میں مرصع نثر کی روایت'' کے موضوع پر پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کے نگراں پہلے پروفیسر کلیم الدین احمد رہے۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر ممتاز احمد (صدر، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) مقالے کے نگراں مقرر ہوئے۔ جون 1994ء میں موصوف کا تبادلہ آر۔ این۔ کالج (حاجی پور) سے بہار یونیورسٹی، مظفر پور کے شعبۂ اردو میں ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب معروف اور جیّد ادیب و ناقد پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب یونیورسٹی ہذا میں صدر شعبۂ اردو کے عہدے پر فائز تھے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ستمبر 2018ء میں بحیثیت ایسوشی ایٹ پروفیسر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں 1989ء تا 2009ء انجمن ترقی اردو، ویشالی کے صدر اور 1985ء تا 2009ء انجمن ترقی اردو، بہار کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ پروفیسر ایم۔ او۔ صدیقی صدر انجمن ترقی اردو، بہار کی وفات کے بعد 2009ء میں تقریباً ایک سال انجمن ہذا کے کارگزار صدر بھی رہے۔ جس کا ذکر قبل آچکا ہے۔ وہ 2011ء سے تادمِ آخر ''کاروانِ ادب'' (حاجی پور) کے صدر کے عہدہ پر فائز رہے۔ موصوف اپنی تین تصانیف ''ادب اور ادبی رویہ''، ''اقبال: شاعر و دانشور'' اور ''اردو میں مرصع نثر کی روایت'' پر بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے ذریعہ انعام سے نوازے گئے۔ موصوف کی مجموعی ادبی خدمات پر معروف ادبی تنظیم ''دانش مرکز'' پھلواری شریف (پٹنہ) نے اکتوبر 2015ء میں انھیں ایوارڈ سے نوازا۔ 2015ء میں ہی ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق نے پروفیسر موصوف کی ادبی، تحریکی و تدریسی خدمات کے اعتراف میں تقریباً چار درجن مضامین و تاثرات (منثور و منظوم) کا ایک مجموعہ ''ڈاکٹر ممتاز احمد خاں: ایک شخص ایک کارواں'' کے نام سے شائع کرایا۔ یہ کتاب علمی و ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ 23؍اپریل 2021ء کو مختصر علالت کے بعد پروفیسر صاحب موصوف نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ 24؍اپریل 2021ء کو بعد نماز ظہر ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کی امامت پروفیسر موصوف کے آبائی گاؤں موضع مروّت پور (مہنار) جامع مسجد کے امام و خطیب مولانا سیف الاسلام نے فرمائی۔ بعدہٗ موصوف حاجی پور کے ''دارالبقا'' قبرستان (باغ ملی) میں سپردِ خاک کیے گئے۔

محبی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں انتقال سے ایک ہفتہ قبل بالکل صحت مند اور بھلے چنگے تھے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

17/اپریل 2021 (۴/رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ) کو بعد نماز مغرب انھوں نے مجھے فون پر بتایا کہ شمیم (چھوٹے بیٹا) کی طبیعت خراب ہے اور میں بھی تھوڑا بخار محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے موصوف سے پوچھا کہ کسی ڈاکٹر سے ملے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ کوئی ڈاکٹر اندنوں مریض کو دیکھ ہی نہیں رہا ہے، کیسے دکھاؤں؟ میں نے انھیں بتایا کہ ایس۔ڈی۔او، روڈ (حاجی پور) میں ایک ڈاکٹر دیپک کمار ہیں، وہ باقاعدہ مریض دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو مل سکتے ہیں۔ 18/اپریل (اتوار) کو میرے مشورے کے مطابق وہ ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے انھیں دوا لکھ دی اور گھر پر آرام کرنے کی صلاح دی اور ان کے بیٹے شمیم کو دیکھ کر کسی اسپتال میں ایڈمٹ کر دینے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر ممتاز صاحب کا علاج گھر پر ہی چلتا رہا لیکن ان کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ آکسیجن کی نوبت آگئی۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود وہ اخبارات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ 19/اپریل (سوموار) کو بعد نماز عصر انھوں نے مجھے فون پر کہا کہ انتقال تو بہتوں کا ہو گیا لیکن کم از کم پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اور جناب ریاض عظیم آبادی کے انتقال پر ''کاروانِ ادب'' کی جانب سے ایک تعزیتی بیان ضرور جاری کر دیجئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ بیان جاری کر چکا ہوں۔ 20/اپریل منگل کو بعد نماز عصر میں نے ان کی خیریت کے لیے جب انھیں فون کیا تو انھوں نے میرا فون ریسیو تو کیا ضرور لیکن ان میں بات کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ انھیں بہت کھانسی ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے فون رکھ دینے کی گذارش کی۔ یہی ان سے میری آخری گفتگو تھی، جسے میں بخوبی سمجھ بھی نہیں سکا۔ 21/اپریل (بدھ) کی صبح یہ خبر ملی کہ وہ حاجی پور کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں۔ موصوف کے صاحبزادے ڈاکٹر لطیف احمد خاں نے موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے اپنے گھر پر یا پھر نرسنگ ہوم جانے کے لیے منع کر رکھا تھا۔ پھر بھی ان کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے 22/اپریل (جمعرات) کو میں ان کی عیادت کے لیے جب نرسنگ ہوم پہنچا تو معلوم ہوا کہ طبیعت زیادہ بگڑ جانے کے سبب انھیں گذشتہ شب پٹنہ لے جایا گیا ہے، جہاں انھیں ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں ایڈمٹ کیا گیا ہے۔ 23/اپریل کو بعد نماز جمعہ جب میں نے ممتاز صاحب کے موبائل نمبر پر فون کیا تو ان کی اہلیہ نے میرا فون ریسیو کیا اور بتایا کہ آج ان کی طبیعت کچھ بہتر ہے۔ انھوں نے آج تھوڑا ''دلیا'' کھایا ہے۔ اس امید افزا خبر کے تین گھنٹے بعد یہ افسوسناک خبر موصول ہوگئی کہ پروفیسر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ موصوف کے انتقال کی خبر سوشل میڈیا پر آتے ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پروفیسر صاحب کا موبائل ان کے افرادِ خانہ نے بند کر دیا تھا۔ لہٰذا اس خبر کی تصدیق اور اظہارِ تعزیت کے لیے میرے پاس حاجی پور کے علاوہ دہلی، کولکاتہ، پٹنہ، سیوان اور مظفرپور وغیرہ دور دراز مقامات سے مسلسل اور بے شمار فون آنے شروع ہو گئے۔ میں خود اس افسوسناک خبر سے اس قدر مغموم اور نڈھال ہو گیا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر بھی ہمت کر کے

ISSN : 2582 - 3612

تمام لوگوں کے فون ریسیو کرتا رہا اور انھیں پروفیسر صاحب کی بیماری اور انتقال کے تعلق سے بتاتا رہا۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی رحلت اردو ادبی دنیا کا عظیم خسارہ ہے۔ پروفیسر ممتاز صاحب واقعی ممتاز تھے۔ ان کی جیسی خوبیوں کے مالک اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر ممتاز خاں کی رحلت سے اردو دنیا، ریاست بہار، ضلع ویشالی اور شہر حاجی پور میں جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ شاید اب پُر نہ ہو سکے گا اور راقم السطور کے لیے تو ان کی رحلت ایک سانحۂ عظیم ہے۔ چالیس سالہ رفاقت کی یادیں مجھے زندگی بھر رُلاتی اور تڑپاتی رہیں گی۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چاہنے والوں اور پسماندگان کو ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنے کی ہمّت اور طاقت دے۔ اور مرحوم کی کوتاہیوں کو درگذر فرما کر انھیں جنّت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین

Anwarul Hasan Wastavi
"Hasan Manzil"
Ashiana Colony
Road No.-06
Hajipur
Distt. Vaishali
Mob.-9430649112

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

حلیم صابر

بلند پایہ علمی وادبی شخصیت: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

جب کوئی بڑی ادبی شخصیت دنیائے ادب سے اُٹھ جاتی ہے تو ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنا آسان نہیں ہوتا اور جب پے بہ پے کئی ادبی شخصیتیں دنیا سے رخصت ہو جائیں تو مزید خلا پر خلا پیدا ہوتا چلا جاتا ہے جسے پُر کرنے میں زمانے بیت جاتے ہیں۔ایسی ہی کیفیت معروف عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب، محقق اور ناقد ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مختصر علالت کے بعد ان کی اچانک وفات کے سبب پیدا ہوگئی ہے۔ 2020ء کے اواخر سے 2021 کے اوائل تک کئی بلند پایہ علمی و ادبی شخصیتیں شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی، مجتبیٰ حسین، راحت اندوری اور گلزار دہلوی وغیرہ کی جدائی کے داغ جو ہمارے دلوں پر دے گئیں ان صدموں سے ابھی نکل بھی نہ پائے تھے کہ ہرگانوی صاحب کی موت کا صدمہ بھی جھیلنا پڑا جو صدمۂ جاں گسل سے کم نہیں ہے کیونکہ مرحوم سے ملاقاتوں کا طویل سلسلہ اور فون پر آئے دن ان سے ادبی حوالے سے گفتگو مدتوں ہمیں ان کی یاد دلائے گی۔

مناظر عاشق ہرگانوی کا شمار ایسی بلند پایہ علمی و ادبی ہستیوں میں کیا جاتا ہے جو بیک وقت معلّمی کے فرائض ادا کرتے ہوئے علم و ادب کا اتنا وسیع حلقہ اپنے زیرِ اختیار رکھتے تھے کہ ان کی ادبی حیثیت مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہوئے نہ صرف ہندو پاک بلکہ اردو کی عالمی بستیوں تک درجہ اعتبار حاصل کر چکی تھی۔ مناظر عاشق جیسا علم آگاہ، ادب شناس، ادب پرور، ادب گستر اور ادب نواز ہر عہد میں کم تعداد میں ملتے ہیں۔ اردو ادب کی ترویج و ترقی کے تعلق سے نشر و اشاعت کا ایسا مستحکم اور طویل سلسلہ انہوں نے قائم کر رکھا تھا کہ ادب کی مختلف اصناف نظم و نثر کے حوالے سے ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین وغیرہ پر مشتمل کوئی نہ کوئی کتاب ہر دوسرے ماہ اشاعت پذیر ہو کر ان کی اشاعتی اسکیم میں اس قدر اضافہ کرتی گئی کہ تمام شائع شدہ کتابوں کی تعداد ڈھائی سو کے ہندسے کو پار کر گئی اور یہ شرف مناظر عاشق ہی کو حاصل ہوا ورنہ ڈھائی سو سے زائد کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مرتب ڈھونڈ کر اردو کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی شاید مل پائیں۔

مناظر عاشق نے شاعری کی تو ہر رنگ میں اپنے رنگِ سخن کا نمونہ پیش کیا اور رنگِ تغزل پر توجہ کی تو حسن کا جائزہ از سر تا پا لے کر شاعری کے ایسے منفرد انداز پیش کئے کہ ''حسن کے لاکھوں رنگ کون سا رنگ

ISSN : 2582 - 3612

دیکھو گے'' کے مصداق شعریت کی قوس وقزح بکھیر دی جس کے سامنے شام اودھ کی فضاؤں میں آسمان ادب کے ضوفشاں ستارے بھی ماند پڑ گئے۔مزید برآں اردو شاعری کی مروجہ مختلف اصناف غزل، نظم، قطعہ اور رباعی وغیرہ کے علاوہ ملکی و غیر ملکی اصناف سخن دوہا، ماہیا، ہائیکو، تنکا اور رینگا وغیرہ بھی نہ صرف ان کی مشق سخن کی زد میں آئیں بلکہ مذکورہ اصناف سخن پر ان کے مجموعے بھی اشاعت پذیر ہوئے اور اس طرح سیکڑوں کتابوں کی اشاعت کا فریضہ ادا کر کے اردو ادب کے خزانے میں مناظر صاحب نے گراں قدر اضافہ کیا ہے۔آپ کو کئی زبانوں انگریزی، اردو اور ہندی وغیرہ پر عبور حاصل تھا۔اردو کے علاوہ ان کی تخلیقات و تالیفات ہندی میں بھی مجموعے کی شکل میں شائع ہوئے اور بقدر ضرورت غیر اردو داں تک اردو فن پاروں کے انگریزی ترجمے بھی کتابی صورت میں پیش کرتے تھے۔ 2015 میں جاپانی صنف ''رینگا'' پر مشتمل شعری مجموعہ ''سناٹوں کا شور'' مناظر عاشق ہرگانوی با اشتراک حلیم صابر شائع ہوا تو اس کے بعد اس کا ترجمہ بھی کتابی شکل میں پیش کیا جس کے مترجم حسنین صاحب ہیں۔

مناظر عاشق صاحب کی تصنیفات کے علاوہ تالیفات اور انتخاب وغیرہ کی بھی ایک بڑی تعداد منظر عام پر آئی جس میں پچھلے سال کورونا پر مختلف شعرا کی نظموں کا انتخاب اور کورونا وائرس افسانچوں کا انتخاب جس میں تقریباً سوا سو افسانہ نگاروں کے افسانچے شامل اشاعت کئے گئے۔مناظر صاحب ہمیشہ معتبر قلمکاروں کی پذیرائی کیا کرتے تھے اور نو واردان بساط ادب کی بھی حوصلہ افزائی ان کے افسانچوں اور نظموں کا انتخاب شائع فرما کر کیا کرتے تھے۔

مناظر عاشق صاحب کی تصنیفات، تالیفات اور متفرقات کی تعداد ڈھائی سو بتائی جاتی ہے۔ جن میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو مناظر صاحب نے معتبر تخلیق کاروں، ادیبوں اور شاعروں کے فکر و فن، حیات و خدمات اور ان کے فن پاروں کا تنقیدی جائزہ لینے کیلئے تصنیف کیں اور ان کے ادبی حیثیت کا اعتراف کیا۔اس کے علاوہ پچاس کے قریب ایسی کتابیں تحقیق و تنقید پر مبنی مناظر عاشق ہرگانوی کی خدمات کے اعتراف میں مشاہیر ادب کی تحریر کردہ منظر عام پر آئیں جن سے مناظر صاحب کی مختلف تخلیقی جہات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔کتابوں کے نام، موضوعات اور ان کے مصنفین کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمائیں۔

☆ مناظر عاشق ہرگانوی: ناقد اور شاعر (نظام صدیقی) ☆ مناظر نامہ منظوم (پروفیسر عبدالمنان طرزی) ☆ ہرگانوی: ناقد اور محقق (ڈاکٹر شمس تبریز خاں) ☆ ہرگانوی: بحیثیت شاعر (ڈاکٹر نیر حسن نیر) ☆ ہرگانوی: شش جہات فنکار (ڈاکٹر نوشاد عالم آرزو) ☆ ہرگانوی: بچوں کے ادیب (ڈاکٹر سید جمشید حسن) ☆ ہرگانوی: شخصیت (پروفیسر فردوس خاں رومی) ☆ ہرگانوی کا ادبی منظر نامہ (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ☆ ہرگانوی کی ژرف گوئی (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ☆ ہرگانوی: کثیر الجہات فنکار (ڈاکٹر محفوظ الحسن)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

☆ مناظر جناب (منظوم) (افروز عالم) ☆ ہرگانوی کی شاعرانہ جہتیں (ڈاکٹر مظفر مہدی) ☆ ہرگانوی کا لٹریری زون (ڈاکٹر امام اعظم) ☆ ہرگانوی 99 تلخی میں (منزل لوہا ٹھیری) ☆ ہرگانوی کی ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے (نذیر فتح پوری) ☆ ہرگانوی کی آنکھوں دیکھی: تجزیہ (ڈاکٹر احمد معراج) ☆ مناظر عاشق ہرگانوی سرجک اور سمالوچک ہندی (یوگل کشور پرساد) ☆ ہرگانوی کی افسانچہ دوستی (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ☆ ہرگانوی: شاعروں کی دوربین نگاہ میں (محمد افضل خاں) ☆ ہرگانوی کی تنقیدی شناخت (ڈاکٹر شبانہ خاتون) ☆ ہرگانوی کی ادبی آبیاری (صفی الرحمٰن راعین) ☆ ہرگانوی کی افسانوی جہتیں (عذرا مناظ) ☆ ہرگانوی کی سراپا سندر یہ غزلیں ہندی (یوگل کشور پرساد) ☆ ہرگانوی کے افسانے اور تجزیئے (ڈاکٹر عرش منیر) ☆ ہرگانوی کی نعت گوئی میں ندرتِ فن (ڈاکٹر زہرہ شمائل) ☆ ہرگانوی: توشیحی نظم (عبدالمنان طرزی) ☆ ہرگانوی بنام نذیر فتح پوری (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ☆ ہرگانوی کی ادبی فنکاری (صفی الرحمٰن راعین) ☆ ہرگانوی: فکر ونظر کی چند جہتیں (ڈاکٹر احسان عالم) ☆ ہرگانوی: ایک نابغہ (ڈاکٹر منصور خوشتر) ☆ ہرگانوی: طنز ومزاح کے دائرے میں (محمد پرویز) ☆ ہرگانوی: ادب کا کولمبس (ڈاکٹر نذیر فتح پوری) ☆ ہرگانوی اور ڈاک ٹکٹ کی اعزازیابی (صفی الرحمٰن راعین) ☆ ہرگانوی: خواتین قلمکار کی نظر میں (بی الہام فاطمہ) ☆ ہرگانوی کی تخلیقی بصیرت (ڈاکٹر عشرت بیتاب) ☆ ہرگانوی کی لندن یاترا: عید کا البم (محمد سبحان) ☆ ہرگانوی اور ہائیکو نگاری (ڈاکٹر اسما پروین) ☆ ہرگانوی سے مصاحبہ (ادھو مہاجن بسمل) ☆ ہرگانوی: پچھمّ بردوان کے ناقدین کا محاسبہ (طلعت انجم فخر) اور ہرگانوی کے فن کے تعلق سے معراج احمد معراج اور ڈاکٹر افضال عاقل کی دو کتابیں۔ اُن پر آخری کتاب جوان کی زندگی میں شائع ہوئی ''مناظر عاشق ہرگانوی کی نظموں میں لمس کی بازیافت'' مصنفہ عشرت جہاں بیگم اور مقدمہ پروفیسر سید آل ظفر نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے فکروفن، تحقیقی وتنقیدی کاوش اور دیگر اصناف ادب پر انکی خدمات کے تعلق سے ڈھیر ساری کتابیں انہیں درجۂ اعتبار عطا کرتی ہیں۔ مزید برآں ان کے زیر ادارت سہ ماہی ''کوہسار'' جرنل ان کی ادبی صحافت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مزید کئی ادبی جریدے ان کی سرپرستی میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے۔ جبکہ ''ساغر ادب'' مظفر پور کی مجلس ادارت سے بھی ان کا تعلق تا حیات قائم رہا۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو مناظر صاحب کی پوری زندگی علم وادب کے فروغ کیلئے وقف نظر آتی ہے۔ جس کا اعتراف مشاہیر ادب کرتے ہیں۔ ایسے زود نویس معتبر قلمکار ہر عہد میں نہیں نظر آتے جنھوں نے مختلف موضوعات پر ادب کے حوالے سے سیکڑوں کتابیں پیش کر کے اردو ادب کے خزانے میں اضافہ کیا ہو۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ مناظر عاشق صاحب ملک وبیرون ملک کی بیشتر علمی وادبی تقریبات میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ ان کے مشاعروں اور سیمیناروں وغیرہ میں شرکت کی روداد جو دنیا بھر کے اخبارات رسائل میں شائع ہوئے ان کو اگر نقل وجمع کر کے اشاعت کے دامن میں جگہ دی جائے تو ایک ضخیم کتاب منصۂ شہود پر آجائے گی۔ مناظر صاحب نے ایسے ایسے مقام پر پہنچ کر اردو ادب کا پرچم بلند کیا جہاں اردو والے مختلف آبادیوں میں سمٹے ہوئے تھے۔ جنوبی ہند کے ساحلی شہر وشاکھا پٹنم کے لوگ انہیں آج بھی یاد کرتے ہیں جہاں وہ معروف شاعر اور صحافی عثمان انجم مدیر ''اصنام شکن'' کی دعوت پر متعدد بار سیمینار، مشاعرے اور ادبی تقریبات میں اپنی شرکت کے گہرے نقوش چھوڑ آئے۔ اڑیسہ کی سرحد کے قریب آندھرا پردیش کے صنعتی شہر رائے گڑھا میں جے کے پیپر مل کے قریب عثمان انجم کی درخواست پر کمپنی نے مشاعرے کی ذمہ داری قبول کی اور ایک شاندار کل ہند پنچ لسانی اردو، ہندی، تیلگو، اڑیہ اور انگریزی کے شعراء پر مشتمل مشاعرہ 2002ء میں زیر صدارت مناظر عاشق ہرگانوی پہلی بار کامیابی سے ہمکنار ہوا جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں آج بھی تازہ ہے۔

شمالی ہند کے علاوہ جنوبی ہند میں مناظر عاشق صاحب ادبی تقریبات میں اپنی شرکت سے کامیابی کے نقوش چھوڑے ہیں جن کی یادیں آج بھی تازہ ہیں۔ وشاکھا پٹنم میں تو 2002 سے 2016 تک مسلسل سیمیناروں اور مشاعروں میں شریک ہوئے جس کا انعقاد عثمان انجم زیر اہتمام بزم اصنام، وشاکھا پٹنم کیا کرتے تھے۔ پچھلی بار 2017ء میں وشاکھا پٹنم کے کل ہند سیمینار ہرگانوی صاحب علالت کے سبب صدارت کے فرائض ادا نہ کر پائے تو ان کی نیابت کا فریضہ راقم الحروف نے ادا کیا۔ آج دنیائے ادب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی وفات پر سوگوار ہے جو یکم جولائی 1948ء کو نالندہ بہار میں پیدا ہوئے اور 17 اپریل 2021ء کو کورونا کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کئی سال قبل حج کی سعادت سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔ اللہ نے انہیں دینی اور دنیوی دونوں جہاں کے اعزاز سے نوازا۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کے علاوہ ادبی تنظیموں نے انہیں درجنوں ایوارڈ سے نوازا۔ جب تک آپ بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے بحسن وخوبی اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ بہت سارے طلبا وطالبات نے آپ کے زیر نگرانی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بہت سے طلبا نے آپ کے فکروفن پر تھیسس لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آج ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہیں گی۔

Halim Sabir
Member: "Governing Body"
West Bengal Urdu Academy
2, Chamru Singh Lane
Kolkata- 700011
Mob.- 9748772983

ڈاکٹر گل افشاں شمیم

اردو صحافت: ایک جائزہ

اردو صحافت کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔جس طرح انسانی زندگی کے لئے دیگر وسائل اہمیت رکھ رہے ہیں، اسی طرح صحافت کی اہمیت بھی قائم ودائم ہے۔امید ہے کہ یہ سلسلہ ہنوز جاری رہے گا۔یہ حقیقت ہے کہ اردو صحافت کے معیار ووقار کا اندازہ اخبارات ورسائل کی ترقی سے لگایا جاتا ہے اس لئے جس اخبار کی شمولیت، سماجی، سیاسی، تہذیبی وثقافتی تصویر کشی میں جس حد تک زیادہ ہوگی صحافت کی ترقی بھی اسی طرح ہوگی۔لفظ صحافت عربی لفظ صحیفہ سے مستعار ہے جس کے لغوی معنی مطبوعہ صفحہ کے ہیں۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے اور صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔بہر حال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایک ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقتوں پر شائع ہوتا ہے۔چنانچہ تمام اخبارات ورسائل صحیفہ ہیں۔''

(فن صحافت، عبدالسلام خورشید، ص-۹)

ہم اس بات سے آشنا ہیں کہ صحافت کا میدان کافی وسیع وعریض ہے اس لئے اس کی تقسیم بھی مشکل مراحل سے گزرنے کے برابر ہے۔اردو صحافت کے سلسلے سے مسٹر میر چندانی کا یہ قول دیکھئے :

''صحافت ملک وقوم کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔صحافت تہذیب وتمدن ثقافت و سماجی قدروں کی عکاسی کرتی ہے۔''

(مجلّہ بہار اردو ایڈ میٹرس کونسل، ص-۲۸)

بقول......مسٹر جی۔کے پوری :

"Journalism means the communication of information regarding the events of a day through written words sound of picture."

(Journalism by G.K. Puri, P-9)

ISSN : 2582 - 3612

صحافت کے سلسلے سے اس بات کا انکشاف بھی ضروری ہے کہ صحافت شاعری نہیں اور نہ ہی اسے داستان سرائی کا فن تسلیم کیا جائے گا بلکہ صحافت بیک وقت ادب، شاعری، داستان گوئی، سیاست بازی، خطابت کی شعلہ سامانی سبھی کچھ کو اپنے دامن میں سمیٹنے میں کامیاب رہتی ہے۔صحافت کے سلسلے سے ایک مختصر جملہ کسی اہل قلم نے بھی بہت خوب کہا ہے کہ ''صحافت ہفت اقلیم پر بسیط ہے'' لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ صحافت کا کینوس کافی وسیع وعریض ہے۔ساتھ ہی اس کا دائرہ کار اس طرح وسیع پذیر ہے کہ اس کی سماجی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی واخلاقی ہمہ گیری وسعت اور معنویت کو ابتدا سے تسلیم کیا گیا ہے۔یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی قائم رہے گا۔کیوں کہ جس طرح معاشرہ ترقی کے زینے طے کر رہا ہے ویسے ویسے صحافت بھی عروج کے زینے طے کر رہا ہے۔اس کی خاص وجہ ہے کہ صحافت ترسیل وابلاغ کا اتنا مؤثر اور طاقتور ذریعہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سماجی پیشوروں، سیاسی رہنماؤں اور مشاہیر ادب نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس سے جڑے بھی رہے ہیں۔

جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ صحافت نے کئی ملکوں کے غیر مخلصانہ وسماجی رویے پر تختے الٹ دیے ہیں۔ساتھ ہی انقلاب میں عوام کی ہم نوائی بھی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج صبح ہوتے ہی خاص وعام افراد اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں اور ملک وبیرون ملک کی صورتحال سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔مختصر یہ کہ اب اردو صحافت زندگی کا اہم حصہ بن چکی ہے۔اردو صحافت کی اہمیت کے سلسلے سے اکبرالہ آبادی یوں رقم طراز ہیں ؎

کھینچوں نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

اردو صحافت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی بڑی بڑی شخصیتوں مثلاً راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، گوپال کرشن گوکھلے، سرسید احمد خاں، مولانا ظفر علی خاں، محمد باقر، مولانا حسرت موہانی، لالہ لاجپت رائے، دیانرائن نگم، قاضی عبدالغفار، خواجہ حسن نظامی، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس وغیرہ نے صحافت سے منسلک ہوکر بڑے بڑے معرکے سر کئے۔

اس بات کا بھی انکشاف ضروری ہے کہ اردو صحافت کے میدان میں ''جام جہاں نما'' کا خاص مقام ہے۔اسے اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس کی زبان اور اس کے آغاز کے سلسلے سے کافی اختلاف ہے۔اس لئے تحقیق کے بعد اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے ۲۸/مارچ ۱۸۲۲ء کو جام جہاں نما کے اجرا کی درخواست دی گئی، لیکن بعد میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فارسی سے لوگوں کا زیادہ مانوس رہنا اردو ضمیمہ کی عدم مقبولیت کی وجہ بنی۔بالآخر اس کا اردو ضمیمہ بند کرنا پڑا۔اس لئے تاریخی سطح پر اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کہ اردو کا پہلا اخبار ’’دہلی اردو اخبار‘‘ ہے اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

> ’’اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اردو کا پہلا باضابطہ اخبار ’دہلی اردو اخبار‘ ہی تھا۔ جسے دہلی سے مولانا محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا تھا جس کا نام بعد میں ’اردو اخبار‘ ہوگیا۔‘‘
>
> (اردو صحافت بہار میں، ڈاکٹر سید احمد قادری، ص-۳۹-۳۸)

میں مختصر گفتگو اردو صحافت کی تاریخ کے سلسلے سے بھی کرنا چاہوں گی اس سلسلے سے ۱۹/ویں صدی میں اشاعت پذیر اخبارات کی ایک لمبی فہرست ہے مثلاً ...... ’’نور بصیرت‘‘ (کلکتہ) ’’انجمن اسلام‘‘ (لکھنؤ) ’’گلدستہ شعرا‘‘ (لکھنؤ) ’’مراسلہ کشمیر‘‘ (لکھنؤ) ’’بنارس گزٹ‘‘ (بنارس) ’’زینت سخن‘‘ (آگرہ) ’’سرپنچ‘‘ (گورکھپور) ’’مفید عالم‘‘ (آگرہ) ’’نجم الاخبار‘‘ (اٹاوہ) ’’احسن الاخبار‘‘ (امروہہ) ’’منشو محمدی‘‘ (بنگلور) ’’قاسم الاخبار‘‘ (بنگلور) ’’خادم ہند‘‘ (بمبئی) ’’شعلہ طور‘‘ (کانپور) ’’شوخ اودھ‘‘ (لکھنؤ) ’’مطلع نور‘‘ (کانپور) ’انڈین پنچ‘‘ (لکھنؤ) ’’مرقع تہذیب‘‘ (لکھنؤ) ’’اخبار ہندوستانی‘‘ (لکھنؤ) ’’انجمن پنجاب لاہور‘‘ (جریدہ روزگار مدراس) ’’جام جمشید‘‘ (مرادآباد) ’’جلوۂ طور‘‘ (میرٹھ) ’’رسالہ آئینہ ہند‘‘ (لاہور) مذکورہ بالا تمام اخبارات ۱۸۲۲ء تا ۱۸۹۹ء تک کے عہد میں شائع ہوئے اور ہندوستانی معاشرت کی پیشکش میں اپنا اہم رول ادا کیا۔

اس عہد کے بعد جب ہم ۲۰/ویں صدی کی اردو صحافت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی اردو صحافت کی تاریخ تشفی بخش رہی ہے۔ کیوں کہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک اردو صحافت بتدریج ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی اور مشکلوں کا سامنا کرتی ہوئی عوام کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب رہی اور ساتھ ہی برطانیہ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں عوام کی رہنمائی میں بھی ہم پلہ رہی۔ اس عہد کا سب سے مشہور اخبار ’’پیسہ اخبار‘‘ مدیر اعلیٰ محبوب عالم اور ’’اودھ اخبار‘‘ مدیر اعلیٰ مالک منشی نول کشور ہے۔ مذکورہ بالا اخباروں کے علاوہ زمیندار کے بعد ایسے اخبارات و رسائل، جن کا ذکر کرنا گزیر ہے، ان میں حسرت موہانی کا رسالہ ’’اردوئے معلیٰ‘‘، ’’اردو اخبار‘‘، ’’مستقبل‘‘، شیخ عبدالقادر کا ’’مخزن‘‘ بابو دینا ناتھ کا ہفتہ وار ’’ہندوستانی‘‘ شانتی نرائن بھٹنا گر کا ہفتہ وار ’’سوراجیہ‘‘ شیخ محمد اکرم اور علامہ راشدالخیری کا رسالہ ’’عصمت‘‘ نسیم انہونوی کا رسالہ ’’حریم‘‘ خواجہ حسن نظامی کا جریدہ ’’نظام المشائخ‘‘، ’’توحید‘‘، ’’غریبوں کا اخبار‘‘ اور ’’منادی‘‘ مولانا آزاد کا ’’الہلال‘‘، ’’نیرنگ عالم‘‘، ’’المصباح‘‘ اور ’’احسن الاخبار‘‘ منشی نوبت رائے کا ’’خدنگ نظر‘‘ مولوی مجید حسن کا ’’مدینہ‘‘ منشی دیا نرائن نگم کا ’’زمانہ‘‘ نیاز فتح پوری کا ’’نگار‘‘ مالک رام کا ’’تحریر‘‘ مولانا محمد علی جوہر کا اخبار

’’ہمدرد‘‘ جالب دہلوی کا ’’ہمدم‘‘ مہاشہ کرشن کا روزنامہ ’’پرتاپ‘‘ سید حبیب کا روزنامہ ’’سیاست‘‘ لالہ لاجپت رائے کا ’’بندے ماترم‘‘ حکیم اجمل خاں کا روزنامہ ’’الامان‘‘ لالہ شاملال کپور کا ’’کیسری‘‘ لالہ خوشحال چند خورشید کا ’’ملاپ‘‘ جس کے بعد میں مدیر رنبیر ہوئے، حاجی ساجد احمد کا ’’پٹنہ اخبار‘‘ سلطان احمد کا ’’اتحاد‘‘ (پٹنہ) لالہ دیش بندھو گپتا کا ’’تیج‘‘ سردار دیوان سنگھ مفتون کا ’’ریاست‘‘ نبیر سنگھ ولد مہاراجہ گلاب سنگھ (کشمیر) کا ’’رنبیر‘‘ مولانا عبدالماجد دریابادی کا ’’سچ‘‘، ’’صدق‘‘ اور ’’صدق جدید‘‘ مولانا عرفان، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، بلال احمد زبیری، مولانا الوحید صدیقی اور مولانا محمد عثمان فارقلیط کا ’’الجمیتہ‘‘ (جمعیته العلماء ہند کا ترجمان) عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کا ’’انقلاب‘‘ شیو نرائن بھٹنا گر کا ’’وطن‘‘ مرتضیٰ احمد خاں میکش اور چراغ حسن حسرت کا ’’احسان‘‘ انیس احمد عباس کا ’’حقیقت‘‘ قاضی عبدالغفار کا ’’پیام‘‘ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا ’’پیغام‘‘ علامہ شیخ کا ’’لالہ نانک چند ناز کا ’’پربھات‘‘ سادھو سنگھ ہمدرد کا ’’اجیت‘‘ نذیر حیدر کا ’’صدائے عام‘‘ سہیل عظیم آبادی کا روزنامہ ’’ساتھی‘‘ غلام احمد خاں آرزو کا ’’ہندوستان‘‘ حمید نظامی کا ’’نوائے وقت‘‘ خلیل الرحمٰن کا ’’جنگ‘‘ جواہر لعل نہرو کی سرپرستی میں حیات اللہ انصاری کا ’’قومی آواز‘‘ وغیرہ جیسے اخبارات و رسائل کسی نہ کسی شکل میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ادبی، مذہبی اور معاشی سطح پر اپنی نمایاں پہچان بنانے میں کامیاب رہے۔

مذکورہ بالا تمام باتوں کی روشنی میں ہم اردو صحافت کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

Dr. Gul Afshan Shamim
Head
Deptt. of Urdu
J. D. Womens College
Patna - 800 014
Mob.- 78579 96992

ڈاکٹر محمد تنویر اختر نورؔ

سجّاد ظہیر اور اردو افسانہ نگاری

سجّاد ظہیر اردو کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں ''گرمیوں کی ایک رات''، ''انگارے''،''نیند نہیں آتی''،''دلاری''،''پھر یہ ہنگامہ'' اور ''جنت کی بشارت'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان افسانوں میں سماج کی بدحالی اور کھوکھلا پن پیش کیا گیا ہے۔ان میں سے بعض کہانیاں بیانیہ ہیں اور بعض کہانیوں میں نئی تکنیک اختیار کی گئی ہے۔ یہ سبھی کہانیاں اپنے موضوع، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے اردو کے افسانوی ادب میں نئی چیزیں ہیں اور معاصر حیات و معاشرہ کی سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اخلاقی اقدار کی روشنی میں بعض پہلو قابلِ اعتراض ہیں لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ ان کہانیوں نے اردو افسانے کو ایک نئی سمت دکھائی اور انقلاب کی راہ نکالی۔

سجّاد ظہیر نے اپنے افسانہ ''گرمیوں کی ایک شام'' میں سماج میں پھیلی ہوئی بداخلاقی اور ظاہر داری کو بے نقاب کیا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار منشی جی بظاہر نہایت اخلاق مند آدمی ہیں۔ وہ اپنے دفتر کے چپراسی جمّن سے اخلاق و مروت کی باتیں کرتے ہیں لیکن ضرورت پڑنے پر اس کی حاجت روائی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب جمّن کو کچھ پیسے کی حاجت ہوتی ہے اور وہ منشی جی سے قرض مانگتا ہے تو وہ اپنی اقتصادی مجبوری کا ذکر کرتے ہوئے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں مگر اس کے بعد اپنے ایک رئیس دوست کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھے پر مجرا سننے چلے جاتے ہیں۔تاثر کے اعتبار سے ''گرمیوں کی ایک رات'' کامیاب افسانہ ہے۔اس افسانہ میں سجّاد ظہیر نے ایک فرد کی خارجی اور داخلی شخصیت کے تصادم کو افسانوی رنگ میں پیش کر دیا ہے۔

اس کے بعد انگارے میں شامل سجّاد ظہیر کے افسانے ہیں۔ان کا افسانہ ''انگارے'' کے عنوان پر ہی اس مجموعہ کا نام ''انگارے'' رکھا گیا ہے۔

''انگارے'' کی اشاعت کے بعد ملک کے کچھ حلقوں میں غیض و غضب کی آگ بھڑک اٹھی کیوں کہ فکر و فن کے اعتبار سے یہ افسانے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ تھا۔ان افسانوں کی زبان و بیان میں بے باکی، برہمی، تلخی اور سرکشی تھی اور نہایت اچھوتے اسلوب میں معاشرے اور افراد کی کج

ISSN : 2582 - 3612

کلاہیوں کو منظرِ عام پر لایا گیا تھا جس کو قدامت پسند افراد برداشت نہیں کر سکے۔اس پر سخت حملے ہونے لگے اور مجموعہ ضبط ہو گیا۔

اس مجموعہ میں سجّاد ظہیر کی پانچ کہانیاں شامل ہیں۔ اپنے افسانہ ''انگارے'' اور ''نیند نہیں آتی'' میں انھوں نے مذہبی طبقے کی ظاہر داری اور نمائشی طریقۂ کار کو بے نقاب کیا ہے۔ان افسانوں میں ان کا لہجہ کچھ زیادہ ہی تیز ہو گیا ہے۔ دراصل سجّاد ظہیر ایک حقیقت نگار فن کار تھے اور یہ سب درست ہے کہ حقیقت تلخ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ سجّاد ظہیر کے افسانوں میں تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ ''نیند نہیں آتی'' میں شعور کی رَو کی کیفیت ملتی ہے۔ یہ ایک نیا نیہ افسانہ ہے۔اس میں ایک بے روزگار نوجوان اکبر کی دلی کیفیت کو نمایاں کیا گیا ہے جس کو غربت اور افلاس کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ ایک بے روزگار نوجوان کے حواس پر افلاس اور غربت چھا گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو نیند نہیں آتی اور بے خوابی کے عالم میں وہ بڑبڑاتا ہے۔ بے خوابی کے اسباب کو سجّاد ظہیر نے نہایت فن کارانہ انداز میں اس افسانہ میں پیش کر دیا ہے۔اس کہانی میں کوئی پلاٹ نہیں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی آغاز و اختتام ہے بلکہ ایک افلاس زدہ نوجوان کی دلی کیفیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس افسانہ سے ایک عبارت ملاحظہ ہو۔اس سے اکبر کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

> ''یا اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا۔تو ارحم الراحمین ہے۔ میں تیرا ایک ناچیز گنہگار بندہ، تیرے سامنے دست بدعا ہوں ....مگر کچھ بھی ہو ذلت مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ میری بیوی پر گالیاں پڑنے لگیں، مگر میں کروں تو کیا کروں، بھوکا مروں، ہڈیوں کا ڈھانچہ، اس پر ایک کھوپڑی، کھٹ کھٹ کرتی سڑک پر چلی جا رہی ہے۔اکبر صاحب آپ جسم کا گوشت کیا ہوا، آپ کو رشک آتا ہو تو میری پیروی کیجیے۔ میں کسی کی پیروی نہیں کرتا۔میں آزاد ہوں، ہوا کی طرح سے۔آزادی کی آج کل اچھی ہوا چلی ہے۔ پیٹ میں آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ ہیں کہ آزادی کے چکّر میں ہیں۔ موت یا آزادی نہ مجھے موت چاہئے نہ آزادی کے، کوئی میرا پیٹ بھر دے۔''

موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے یہ انوکھے انداز کا افسانہ ہے، اس میں چھوٹے چھوٹے دھاردار جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے زبان و بیان ملتے ہیں۔ بیان کی بے رابطی اس افسانے کا اصل حُسن ہے کیونکہ بے خوابی اور بھوک کی حالت میں انسان بے ربط ہی لگا کرتا ہے۔اس

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لئے بے ربط خود کلامی اس افسانہ کی کامیابی میں بیحد معاون ہے اور اپنے تاثر کے اعتبار سے افسانہ نہایت کامیاب ہے۔

سجاد ظہیرؔ کے افسانوں میں ''دلاری'' سب سے کامیاب افسانہ ہے۔اس میں حقیقت نگاری اور فن کاری کی خوبصورت ہم آہنگی کا احساس ملتا ہے۔اس افسانہ کا مرکزی کردار، دلاری ہی ہے جو شیخ ناظمؔ علی کے گھر میں ایک لونڈی کی طرح پرورش پاتی ہے۔''دلاری'' ایک معصوم لونڈی کا مرثیہ ہے جس کی آبرو کبھی رئیس ناظمؔ علی کے یہاں لوٹی جاتی ہے تو کبھی بازار میں۔اسا افسانہ میں ایک غریب و نادار، بے بس عورت سے دل بہلانے والے زمیندار کی افسوس ناک کہانی ہے۔یہ افسانہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔دلاری جب سِن بلوغ کو پہنچتی ہے اس وقت کی کیفیات کو سجاد ظہیرؔ نے اس طرح سے رقم کیا ہے:

''جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے اور دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو بھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں تو وہ اکثر رنجیدہ سی رہنے لگی۔لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔چھوٹی صاحبزادی، حسینہؔ بیگم اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سِن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔مگر جوں جوں ان کا سِن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔''

(انگارے۔ص:۴)

افسانہ ''پھر یہ ہنگامہ'' سماجی تناظر میں لکھا گیا ہے۔یہ افسانہ تکنک اور انداز بیان کے اعتبار سے بالکل منفرد انداز کا ہے۔یہ افسانہ جس تکنیک پر لکھا گیا ہے اس کو پروفیسر قمر رئیسؔ نے سرریلسٹ آرٹ کہا ہے۔سرریلزم کے توسط سے فن کار علامتوں کے ذریعہ انسان کے لاشعور کی مصوری کرتا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کی علامتیں اور بیانات ناقابل فہم بھی ہوجاتے ہیں مگر سجاد ظہیرؔ نے سماج اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بھوک، افلاس، جہالت، تعصب اور بے ربطی کو علامتوں کے توسط سے بے نقاب کیا ہے لیکن دوسرے سرریلسٹ فن کاروں کی طرح ان کی علامتیں مبہم نہیں ہیں۔بلکہ ان کے افسانوں میں شامل علامتیں افہام و تفہیم میں رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دیتیں۔اس افسانہ کی پوری کہانی خود کلامی پر منحصر ہے۔جس سے متعلق پروفیسر قمر رئیسؔ لکھتے ہیں :

''جس میں شعور اور لاشعور آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔اس میں جو منظر اور ذہنی پیکر ہیں وہ بہ ظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق اور بے ربط ہیں۔لیکن

ISSN : 2582 - 3612

مجموعی طور پر یہ کہانی اس عہد کے ایک ایسے ہندوستانی نوجوان کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا آئینہ بن جاتی ہے جو ایک بے قرار روح اور دردمند دل رکھتا ہے'' (تنقیدی تناظر، ص۔۴۷)

اس کہانی سے چند تصویریں ملاحظہ فرمائیں:

''عقل اور ایمان، آسمان و زمین، انسان اور فرشتہ، خدا اور شیطان......سوکھی ہوئی خشک زمین جو برسات میں بارش سے سیراب ہوجاتی ہے اور اس میں عجیب طرح کی خوشگوار سوندھی خوشبو آنے لگتی ہے۔قحط میں لوگ بھوکے مرتے ہیں۔بوڑھے، بچے، جوان، مرد عورت......آنکھوں میں حلقے پڑے ہیں۔ہڈیاں پسلیاں جھرّی پڑی ہوئی کھال کو چیر کر معلوم ہوتا ہے باہر نکلی پر رہی ہیں۔'' (انگارے، ص:۵۵تا۵۶)

سجاد ظہیرؔ کے تقریباً تمام افسانوں کے مواد میں بہت حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ان کا موضوع افراد اور معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے جس کو انہوں نے مختلف انداز سے ایک نئی تکنیک میں پیش کیا ہے۔تکنیک کی جدت کے علاوہ سجاد ظہیرؔ کے افسانوں کے کردار میں تہہ داری اور پیچیدگی بھی ہے۔انہوں نے مختلف امور کی ءء وضاحت کے لئے آزادانہ طریقہ بھی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ہیجانی جوش اپنے شباب پر پہنچ گئے ہیں اور تضحیک واستہزاء کے رنگ نمایاں ہوگئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے فنی اعتبار سے کمزور ہوگئے ہیں۔ مثلاً ''جنت کی بشارت'' میں انہوں نے ایک بوڑھے مولوی داؤدؔ کی کہانی لکھی ہے۔مولوی داؤدؔ کی بیوی آٹھ بچوں کو چھوڑ کر رحلت کر جاتی ہے تو وہ ایک نئی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ان کی بقیہ عمر تلاوت قرآن اور عبادت و ریاضت میں بسر ہوتی ہے لیکن جوان بیگم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے لہذا مولوی داؤدؔ کی عبادت و ریاضت کا مصلّا ان کی جوان بیگم کا مدفن بن جاتا ہے۔اس افسانہ میں سجاد ظہیرؔ نے فطری جبلت اور کھوکھلی روحانیت کو بے نقاب کیا ہے۔تاہم اس افسانہ کی زبان و بیان میں تلخی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے تضحیک واستہزا کا رنگ مزید گہرا ہوگیا ہے۔

Dr.Md Tanwir Akhtar Noor
Associate Professor
D.A.V. P. G College, Siwan
Mob: 9304705171

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن

عابد سہیل کے ادبی جہات

عابد سہیل (۲۰۱۶ء۔ ۱۹۳۲ء) کی شخصیت متنوع صفات و جہات کی حامل رہی ہے۔ وہ ایک بلند پایہ صحافی، مترجم، خاکہ نگار اور افسانہ نگار کے علاوہ افسانہ کے نقاد بھی تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن ادیبوں نے اپنی فکری ہمہ جہتی اور ادبی نگارشات کے سہارے دانشوروں میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے، ان میں عابد سہیل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ عابد سہیل معتدل ذہن اور حقیقت پسند نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی گہری رہی۔ ادبی حلقوں میں ان کی شناخت ایماندار، کمیٹیڈ اور راسخ العقیدہ شخصیت کی حیثیت سے معروف تھی۔ وہ ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں ترقی پسند تھے اور جب ترقی پسند تحریک اپنا اثر ورسوخ کھو رہی تھی، عابد سہیل تب بھی اس سے وابستہ تھے۔ ایک دور ایسا بھی آیا جب پوری تحریک اور اس کے مبلغین کو نیولیفٹ نے ترمیم پسند قوت کا ترجمان کہہ کر مسترد کر دیا تھا اور جدید رجحان کے پیروکاروں نے انہیں غیر متعلق قرار دے دیا تھا۔ اس مشکل اور نازک صورتحال میں بھی انہوں نے اپنے کمِٹمنٹ اور ترقی پسند ادب سے وابستگی کو برقرار رکھا اور معتدل ذہن اور میانہ روی سے اپنی ترقی پسند شناخت قائم رکھی۔ حالانکہ وہ دور اردو ادب میں فلور کروسینگ کا تھا۔ کئی ادیب، دانشور اور نظریہ ساز بھی کمٹمینٹ سے پھر گئے تھے۔ مگر عابد سہیل بڑے صبر واستقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے نظریہ پر قائم رہے۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری کی حیثیت سے برسوں تک ترقی پسند نئے ذہنوں کی تربیت کی ہے۔

یہ سچ ہے کہ عابد سہیل کے مزاج میں صلح پسندی کے بجائے حوصلہ مندی اور جرأت و بے باکی تھی۔ اقتدار کی بدعنوانیوں اور بالادست عناصر کے جبر واستحصال کے خلاف احتجاج ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت کے مقابلے آزاد رہنے کو ترجیح دی۔ وہ کبھی اپنی فکری قوتوں کو حکومت کے لئے وقف کرنے پر خود کو راضی نہ کر سکے۔ اور آزاد رہ کر زبان و ادب کے گیسو سنوارتے اور نکھارتے رہے۔

عابد سہیل کا ادبی وتخلیقی سفر تقریباً ساٹھ سے زیادہ برسوں کو محیط ہے۔ آپ کے تخلیقی سفر کا آغاز

ISSN : 2582 - 3612

۴۹۔ ۱۹۴۸ء کے آس پاس ہوا۔ عابد سہیل نے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ انہوں نے پہلا افسانہ اس وقت لکھا جب وہ آٹھویں جماعت میں تھے لیکن اس کے متعلق انہیں کچھ یاد نہیں۔ آپ کا پہلا افسانہ ''دور آسمان کے خلاؤں میں'' ۱۹۴۸ء میں دیوان سنگھ مفتون کے ہفت روزہ ''ریاست'' کے خاص نمبر میں شائع ہوا۔ اس وقت آپ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ ان کا پہلا افسانہ اپنی طرز کا منفرد افسانہ تھا۔ جس میں زندگی اور انسانی قدروں کی بھرپور عکاسی کی گئی تھی۔ ادبی حلقوں میں افسانہ کی اس قدر پذیرائی ہوئی کہ عابد سہیل پوری طرح افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ افسانہ لکھنے کی ان کی رفتار دھیمی ہے۔ وہ زیادہ افسانوں کی بہ نسبت اچھے افسانہ لکھنے کے قائل ہیں۔ ان کے منتخب افسانوں میں ''اندھیرے کا کرب''، ''سب سے چھوٹا غم''، ''جینے والے''، ''بفاتن''، ''سوانیزے پر سورج''، ''نیا سفر''، ''تیسرا خط''، ''وہ ایک لمحہ''، ''پیاسے''، ''رشتے''، ''روح سے لپٹی ہوئی آگ''، ''سچے جھوٹے موتی''، ''ایک بے نام کہانی''، ''میں اور میں''، وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

یہ افسانوی مجموعے پریم چند کی حقیقت پسندی کی ترویج وتوسیع کی علامت ہیں۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسند خیالات اعتدال اور توازن کے ساتھ نمایاں ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً بھوک، غریبی، بے روزگاری، سماجی ناانصافی اور جاگیردارانہ ظلم وجبر کی حقیقی تصویر پُر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خان لکھتے ہیں :

> ''افسانہ نگاری کے عمل میں انہوں نے ترقی پسندی کی انتہا پسندی کو بالائے طاق رکھ کر صرف پریم چند کی حقیقت پسندی کو میانہ روی کے ساتھ اپنایا............ان کے ہر افسانے میں زندگی اور زندوں کے درمیان جو رشتے ہیں۔ ان کی عکاسی میں نفسیاتی نزاکتوں اور تہہ داریوں کو جس حقیقت پسندی سے وہ اپنے دھیمے، نرم اور شائستہ اسلوب سے سپرد قلم کرتے ہیں یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔''
>
> (تفکرات، ڈاکٹر اشفاق محمد خان، ص۔ ۱۰۵)

عابد سہیل افسانہ کے اُفق پر اس وقت نمودار ہوئے جب کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور غلام عباس جیسے افسانہ نگاروں کی شہرت اور مقبولیت کے چراغ روشن تھے۔ عابد سہیل نے اپنے عہد کی ان قدآور تخلیق کاروں کی صف میں کھڑے ہو کر اپنی صلاحیت کا نہ صرف لوہا منوایا بلکہ اپنی منفرد و یگانہ شناخت قائم کی۔ ان کے افسانے ان کے وسیع مطالعے، عمیق تجربے اور فکر ونظر کے فنکارانہ استعمال کے شواہد فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی اور سماج کے اہم بنیادی مسائل کو اس طرح

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے کہ زندگی کی ساری حقیقتیں پہلے سے زیادہ روشن نظر آنے لگتی ہیں۔ان کے افسانوں کا موضوع انسانی زندگی کی نیرنگیاں، سماجی تفریق، طبقاتی کشمکش، انسانوں کی محرومیت اور حالات کا جبر ہوتا ہے۔مگر ان سب کا اظہار جملہ فنی لوازم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی ان کے فن وفکر کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''دراصل عابد سہیل زندگی کی ناہمواریوں کے نکتہ چیں ہیں۔وہ استحصال کی مختلف صورتوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ان کے یہاں اخلاقیات کا سبق یہ ہے کہ افسانوں میں نہ صرف تفریق کی جائے بلکہ مختلف طریقے پر ان میں بھید بھاؤ ہے اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ سامراجی طاقتیں وقتاً فوقتاً ابھرتی رہتی ہیں۔فن کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی نشاندہی کی جائے اور رویوں میں جو کچھ ہے، ان کے خلاف آواز اٹھائی جائے لیکن یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہو بلکہ فن کے جو تقاضے ہیں وہ بطور خاص برتے جائیں۔''

(تاریخ ادب اردو، پروفیسر وہاب اشرفی،ص۔۱۲۶۵)

عابد سہیل کو افسانوی ادب سے فطری لگاؤ تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہیں قصہ کہنے کا فن کچھ اس طرح سے آتا ہے کہ کہانی خود بخود اندر سے کھلتی چلی جاتی ہے۔وہ نہایت سادگی اور سہج پن سے حقائق کی عکاسی اپنے فطری لہجے اور غیر ارادی اسلوب میں اس طرح کرتے ہیں کہ آخری جملے تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔''جینے والے'' کا اختتامیہ پیراگراف ملاحظہ فرمائیں :

''یہ تو نصیبے ہے،اس کا لال انگوچھا گردن میں لپٹا ہوا ہے۔''

اور تھوڑی ہی دیر میں نصیبے کی موت کی خبر پل کے منڈیر کے اس کونے سے اس کونے تک پھیل گئی۔

شام ہوئی اور سامنے کے ہوٹل کو بجلی کے بلبوں سے خوب سجا دیا گیا تو جودھے کو نہ جانے کیسے ایک بات یاد آ گئی۔

''شدو تجھے یاد ہے نا پچھلی سال شرفو بھی کل کے دن منڈیر سے گر کر مرا تھا۔''

''کل ہی کے دن۔شدو بولا۔ یہ تو یاد نہیں پر اتنا جرور یاد ہے کہ تھے خوب گرمیوں کے دن۔''

''تجھے کیسے یاد رہا۔''

''یہ سامنے والا ہوٹل اس دن بھی خوب سجایا گیا تھا۔ رات بھر گانا بجانا ہوتا

ISSN : 2582 - 3612

رہا تھا۔''

جودھے نے کہا۔

''ہاں ہاں،اب یاد آ گیا۔اس دن بھی یہ ہوٹل خوب سجا تھا۔''

شدو کو سب کچھ یاد آ گیا۔

''اور اس سے بھی ایک سال پہلے جب رامائن منڈیر سے گر کر مرا تھا تب بھی۔''

''ہاں اس کے اگلے دن بھی ہوٹل خوب سجا تھا۔چیتی بولی مجھے خوب یاد ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے'' جودھے نے اپنی ٹانگیں بلا سوچے سمجھے منڈیر پر پھیلائیں''اب ایک سال کی چھٹی۔خوب ٹانگیں پھیلا کر سوؤ۔کچھ ہونے والا نہیں۔''

وہ سارے دل جو نصیبے کے پل سے گر کر مرنے سے بوجھل تھے۔ان پر سے بوجھ ایک دم ہٹ گیا۔اب ایک سال کی چھٹی بات بالکل پکی تھی۔''

(تفکرات، ڈاکٹر اشفاق محمد خان،ص۔ ۱۰۸)

عابد سہیل نے اپنے مشاہدے کی باریک بینی سے کام لے کر ایسے کردار وضع کئے ہیں جو قاری کے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہر سال پُل کی منڈیر پر سوتے ہوئے تھکے ہارے مزدوروں میں سے کسی ایک مزدور کی پُل سے گر کر موت استحصال زدگی کی علامت نہیں تو اور کیا ہے۔عابد کے افسانے مرقع نگاری، تکنیک، ابہام اور غیر معمولی پلاٹ جیسے عناصر سے بالکل عاری، صاف ستھرے اور ایک محدود ذوق کے نمائندے ہیں۔

عابد سہیل کے افسانے اہم اور منفرد خصوصیات کے حامل ہیں۔اور ساتھ ہی جدید تر افسانوی مزاج سے قریب تر بھی ہیں۔انہوں نے انسانی زندگی کو پُرخلوص اور سچے فنکار کی نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے اور اسی لئے ان کے افسانوں میں خلوص، ہمدردی اور رواداری پوری طرح نمایاں ہے۔ان کے افسانے تصنع اور بناوٹ سے دور اور سادگی و حقیقت سے نزدیک ہیں۔

عابد سہیل کے تخلیقی سفر کا ایک اہم پہلو تنقید نگاری بھی ہے۔وہ افسانوی ادب کے نقاد کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔افسانے کی تنقید میں عابد سہیل اپنے واضح، ٹھوس اور مدلل نظریۂ نقد کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔افسانے پر عابد سہیل کی تنقید کسی کی تقلید نہیں ہے۔ یہ ان کا اپنا انداز فکر و اسلوب

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

نقد ہے۔ دراصل عابد سہیل ایک ممتاز اور کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ جس کے باعث وہ افسانہ کے فکری وفنی لوازمات اور تخلیقی عمل کے پیچیدہ اور دشوار مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے مقبول رسالہ ''کتاب'' کی ادارت کے دوران انہیں متعدد افسانوں میں سے معیاری افسانے کے انتخاب کے عمل سے گزرنا پڑا ہے۔ جس نے ان کے ناقدانہ شعور کو جلا بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ عابد سہیل کے تنقیدی مضامین آج کل، نیا دور، ماہ نو، نقوش اور افکار (پاکستان) جیسے اہم ادبی رسالوں میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ ان کی مقبول ترین کتاب ''فکشن کی تنقید چند مباحث'' ان ہی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں عابد سہیل نے فکشن کی تنقید کے آداب، مبادیات اور لوازمات سے بحث کرتے ہوئے بہت سے انکشافات بھی کئے ہیں یہ اپنے طرز کی ایک منفرد کتاب ہے۔ شاہ نواز قریشی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''فکشن کی تنقید میں انہوں نے جس منطقی انداز میں جس مدلل طریقے سے افسانوی ادب پر گفتگو کی ہے۔ اس طرح سے اس سے پہلے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی ، نہ اس انداز میں کبھی کچھ لکھا گیا۔ انہوں نے افسانوی ادب کی عملی تنقید کے اصول متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ چنانچہ فکشن کی تنقید کو اگر افسانویت یعنی افسانوی ادب کی بوطیقا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''

(نیا دور ماہنامہ لکھنؤ، جنوری ۲۰۰۵ء، ص۔۲۲)

ان کا خیال ہے کہ تنقید کا مقصد ادب کی حقیقت اور اس کی ماہیئت پر غور کرنے کے علاوہ ادیب کو اس کی تخلیق کاوش پر مناسب داد و تحسین دینا بھی ہے۔ عابد سہیل کی تنقیدی تحریروں کا ایک خاص امتیاز ان کا منفرد، مدلل اور سلجھا ہوا اسلوب ہے۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں علمیت، قطعیت اور صراحت بہت نمایاں ہے۔ وہ بے حد سلجھے ہوئے انداز اور مدلل طریقے سے اپنی بات پیش کرتے ہیں، کسی فکر و نظر کے معترض بھی ہوتے ہیں تو اس میں خفگی، تحقیر یا بے زاری کا شائبہ نہیں ہوتا۔

عابد سہیل کی تخلیق کا ایک اہم پہلو ادبی صحافت بھی ہے۔ آپ نے لکھنؤ سے ایک ادبی ماہنامہ ''کتاب'' بغیر کسی مالی امداد کے ۱۹۶۲ء میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی اشاعت بارہ سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ اس رسالہ کا مقصد نئے لکھنے والوں کو متعارف کرانا تھا۔ اس جریدہ میں جن ادیبوں کی نگارشات مستقل شائع ہوئی تھیں ان میں مسعود حسن رضوی ادیب، سید احتشام حسین، علی سردار جعفری، محمد حسن، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر محمود الٰہی، شارب ردولوی اور ڈاکٹر قمر رئیس وغیرہ شامل

ہیں۔ شاعری میں خلیل الرحمٰن اعظمی، سلام مچھلی شہری، شہریار، بشیر بدر، حسن کمال اور ندا فاضلی وغیرہ شامل ہیں۔ ناول کی اگر ہم بات کریں تو قاضی عبدالستار کا ناول ''دارا شکوہ'' پہلی بار ''کتاب'' ہی میں شائع ہوا۔ افسانہ لکھنے والوں میں قاضی عبدالستار، اقبال متین، سریندر پرکاش، اقبال مجید، جوگیندر پال، بلراج کومل، عبدالصمد، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی اور شوکت حیات وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس رسالہ کی ادبی اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اس نے جدید ادب کی تشہیر و ترویج اور اس کی افہام و تفہیم میں اہم رول ادا کیا۔ عابد سہیل نے ''کتاب'' کے کئی یادگار خاص نمبر ترتیب دئے جن میں افسانہ نمبر، شوکت تھانوی نمبر اور ہندی کہانی نمبر شامل ہیں۔ اس رسالہ کی خاص بات یہ ہے کہ عابد سہیل نے اس رسالہ کو کسی مخصوص نظریہ یا رجحان کا نقیب نہیں بننے دیا۔ اس میں انہوں نے ترقی پسندوں کی تخلیقات بھی شائع کی اور جدیدوں کی نگارشات کو بھی جگہ دی۔ آپ نے اس جریدہ کو کبھی ذاتی و شخصی تشہیر کا آلہ کار نہیں بنایا۔ ''کتاب'' میں ان کا نام مدیر کی حیثیت سے نہیں چھپتا تھا حالانکہ وہی اس کے مدیر بھی تھے اور پبلشر بھی۔ مجموعی طور پر ماہنامہ ''کتاب'' اردو کا ایک معیاری اور وقیع جریدہ ثابت ہوا۔ یہ رسالہ ادبی صحافت کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش باب ہے۔

خاکہ پر ان کی تصانیف ''کھلی کتاب'' اور ''پورے، آدھے ادھورے'' اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ عابد سہیل کے فکر و فن میں تنوع و جدت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے فنی آگہی اور تخلیقی بصیرت سے اردو خاکے کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ فکری سطح پر دیکھا جائے تو ان کے خاکے تہذیب و ثقافت کے حسین مرقعے ہیں۔ عابد سہیل نے اشخاص کی تصویر کشی کے پس پردہ متعلقہ عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ خاکہ کا ادب سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ خاکوں میں شخصیات کے پس پردہ متعلقہ عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی ہر پہلو کا تذکرہ ہوتا ہے۔ خاکہ نگار کسی مخصوص شخصیت کی شکل، صورت، خورد و نوش، رہن سہن، عادات و اطوار اور شب و روز کے معمول بیان کرنے کے علاوہ متعلقہ عہد کی منظر کشی بھی کرتا ہے۔

خاکہ کی ادبی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس کا موضوع انسان ہوتا ہے اور انسان ہمارے تہذیب اور معاشرہ کا ایک نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور وقت بہ وقت رونما ہونے والی تبدیلیوں سے خود اثر انداز ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کے تمام پیچ و خم کو تہذیبی و معاشرتی پس منظر میں اجاگر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ کون سی مثبت اور منفی قدریں شخصیت کی ذات کا حصہ ہیں۔ فن کار کی یہی حق گوئی اور حق شناسی اس کے فن کو آفاقیت اور قبول عام عطا کرتی ہے۔

خاکوں میں عموماً تہذیب نفس کا بیان ہوتا ہے۔ خاکہ نگار موضوع اشخاص کے پاکیزہ اخلاق و آداب، حسن عمل، پسندیدہ رفتار وگفتار وغیرہ کو اپنے خاکوں میں پیش کرتا ہے۔ عابدؔ سہیل کے خاکوں میں تہذیب نفس سے متعلق کئی چیزیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً بڑوں کی توقیر و تعظیم، مہمان نوازی، نیک نفسی، اصول پسندی، حق گوئی، صلہ رحمی، بے لوثی، کشادہ دلی، اعلیٰ ظرفی، سادہ لوحی، غیر جانبداری اور دوسروں کی ضرورت میں کام آنا وغیرہ جیسی اخلاقی وانسانی خصوصیات کی زندہ تصویر کشی ان کے خاکوں کا نمایاں وصف ہے۔

عابدؔ سہیل نے فن کے محاسن کا خیال رکھتے ہوئے اپنے خاکوں میں اس عہد کی مخصوص فضا اور ماحول کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکے کسی مخصوص شخصیت کی جیتی جاگتی تصویروں کے علاوہ اس عہد کا منظر نامہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کے خاکوں میں فن کے جملہ لوازم یعنی کردار نگاری، واقعہ نگاری، اختصار، منظر کشی، اور وحدت تاثر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ کردار نگاری میں انہیں دسترس حاصل ہے۔ وہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربات کی بنیاد پر کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں اور شخصیت کی ایسی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں کہ خاکہ اسٹل فوٹوگراف سے آگے بڑھ کر ویڈیو کی فلم میں ڈھلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ نگاری میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعہ کے سہارے متعلقہ شخصیت کے کارناموں سے متعارف کراتے ہیں۔ ان کے یہاں خاکہ نگار پس پردہ رہتا ہے۔ عابدؔ سہیل نے اپنا ذکر اتنا ہی کیا ہے۔ جتنا دوسروں کے تعارف میں ناگزیر ہے۔ انہوں نے خاکہ میں معروضیت کا خیال رکھا ہے۔ وہ خاکوں میں حق دوستی یا حق رفاقت ادا کرنے کی فکر نہیں کرتے ہیں۔ اختصار اور جامعیت ان کے خاکوں کا حسن ہے۔ اختصار کا یہ عمل خاکہ کے جملہ عناصر میں نمایاں ہے۔ انہوں نے غیر ضروری تفصیلات اور مختلف مسائل سے الجھنے کے بجائے ایک کارٹونسٹ کی طرح چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے موضوع شخصیت کی پراثر اور دلچسپ اسکیچ پیش کیا ہے۔ ان کے خاکوں میں عمدہ منظر کشی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے قوتِ اخذ و مشاہدہ اور باریک بینی کے ذریعہ شخصیت کی زندگی سے متعلق متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ سے ایسی منظر کشی کی ہے کہ ان کے خاکوں میں حقیقت کا رنگ شامل ہوگیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خاکے شخصیت کا واحد تاثر پیش کرنے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔

جہاں تک اسلوب وتکنیک کا سوال ہے تو اس اعتبار سے ان کے یہاں تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے خلاقانہ جوہر اور تخلیقی بصیرت سے تکنیک میں جدت اور اسلوب میں نیرنگی پیدا کی ہے۔ افسانوی تکنیک اور سس پینس کی تکنیک کے استعمال سے ان کے خاکے مؤثر اور دلچسپ ہوگئے ہیں۔ ان کے خاکوں میں سادہ، عام فہم اور علمی زبان مستعمل ہے جس کی وجہ سے عبارت میں لطافت، چاشنی اور شیرینی پیدا ہوگئی

ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے خاکے فکروفن کے لحاظ سے قابل اعتنا اور لائق تحسین ہیں۔

عابدؔ سہیل کے ادبی سفر میں ان کی گراں قدر تصنیف ''جو یاد رہا'' (سوانح) بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت ان معنوں میں نمایاں ہے کہ اس میں مصنف کی ذات کم، متعلقہ عہد کے ادبی تحریکات، ادبی رجحانات ومیلانات، قدآور شخصیات کے ادبی معرکے اور بوقلمونیوں کو زیادہ اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متقدمیں معاصرین اور متاخرین کے دلچسپ علمی، ادبی اور سیاسی حالات اس قدر خوش اسلوبی اور متانت کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں کہ یہ ایک اہم ادبی دستاویز بن گئی ہے۔

اس کے علاوہ عابدؔ سہیل کی ایک اہم تصنیف ''ڈاکٹر عبدالعلیم'' (مونوگراف) بھی ہے۔ یہ کتاب علیم شناسی میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم سے موصوف کے تعلقات گہرے اور قریبی رہے ہیں۔ اس لئے عابدؔ سہیل نے نہایت سادگی کے ساتھ ان کی شخصی، سوانحی، علمی فکری، تحریکی اور ادبی کارناموں کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلیم کے جملہ پہلو روشن ہوجاتے ہیں۔ مختصر تحریر کے باوجود علیم شناسی میں یہ کتاب غیر معمولی حیثیت کی حامل ہے۔ عابدؔ سہیل نے اس کے علاوہ دو کتابوں کی ترتیب بھی دی ہیں۔ ان میں ایک ڈاکٹر عبدالعلیم کے مضامین کا انتخاب ہے (علیم شناسی)، تو دوسرا احمد جمال پاشا کے مضامین کا ایک مونوگراف بھی انہوں نے عبدالعلیم پر لکھا ہے۔ علاوہ ازیں ''افسانیات''، ''حرف کائنات''، ''اردو کے ادبی رسائل کے مسائل''، ''رحمٰن رنگ''، ''غیر مرئی انسان'' اور ''باغات'' بھی ان کے ادبی سفر کے ارتقا کی اہم کڑی ہیں۔ بلاشبہ عابدؔ سہیل کی افسانوی، تنقیدی وتاریخی نگارشات اردو زبان وادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں اور ان کی ادبی جہات اور خدمات قابلِ ستائش اور قابلِ رشک ہیں۔

Dr. Md. Motiur Rahman
Asstt. Professor
University Deptt. of Urdu
L.N.Mithila University
Darbhanga (Bihar)
Mob.- 62023 76927

ڈاکٹر مستفیض احد عارفی

میرے نالوں کی گمشدہ آواز: ایک توضیحی مطالعہ

اردو ادب کی تاریخ میں آزادی سے قبل اور اس کے بعد کا فن پارہ اجتہادی اور انقلابی ہے۔ شدت، پیچیدگی اور انحراف کا معاملہ برق رفتاری سے ابھر کر آیا ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ اثر اگر کوئی صنف نے قبول کیا ہے تو وہ ناول ہے۔ ناول زندگی کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ کشادگی اور پھیلاؤ اس کا امتیاز ہے۔ یہ دیگر اصناف کی طرح تنگ دامانی کی شکایت نہیں کرتا اور نہ ہی کائنات اور ذات کے داخلی وخارجی عوامل کو پیش کرنے میں بخیلی سے کام لیتا ہے بلکہ ناول ہر ایک نکتہ اور ہر ایک امور کو فیاضی اور خوش اسلوبی سے پیش کرتا ہے۔ ناول واحد ایک ایسی صنف ہے جس میں خلاؤں اور فضاؤں کی باتیں بالعموم نہیں ہوتیں، بلکہ زمین پر سانس لیتی ہوئی زندگی، شکست و ریخت کا مسئلہ اور مادی وسائل کی باتیں کی جاتی ہیں۔ زندگی زمینی حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا نام ہے اور آنکھیں چار کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ناول ہے کہ اس کی ہو بہو عکاسی کرنا اور اس سے آنکھیں چار کرنا اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ ماورائی کیفیت اور اشاراتی پھسلن سے گریز ہی ناول کی شناخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے وجود اور اپنی اہمیت کے لئے اسے ہمیشہ سنگھرش میں رہنا پڑا ہے۔ ناول میں ادبی قلا بازیاں اور سماجی تصور کی جو تخلیقی کیف گھلی ملتی ہے وہ کسی دوسرے صنف میں نہیں۔ ناول میں انفرادی شعور، اجتماعی شعور اور زندگی کے تضادات کا نکتہ اس انداز میں در آتا ہے کہ یہ سماج کا بہترین اظہار یہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ مصروفیت کے اس بھاگم بھاگ میں اگر ناول پڑھا اور لکھا جاتا ہے تو یہ خوش آئند بات ہے۔ ورنہ ناول کے اوپر ایک دور ایسا بھی آیا کہ ناول نگاری کرائسس کے دور سے گذرنے لگی تھی لیکن کرائسس کے ایوان کو توڑنے میں عبدالصمد، غضنفر اور پیغام آفاقی وغیرہ لوگ اہم ثابت ہوئے۔ یہ لوگ اب بھی رکے رکے اور سہمے سہمے سے تھے لیکن جب ہلچل ہوئی تو پھر ہوتی چلی گئی۔ واضح رہے کہ مرزا ہادی رسوا سے پریم چند اور پھر تقسیم ہند کے زیر اثر لکھنے والوں کی کھیپ کے بعد ۱۹۷۰ء کے آس پاس یہ کرائسس پیدا ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ کرائسس کو توڑنے میں جو لوگ اہم ثابت ہوئے ان کا تعلق بہار سے ہی تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے پہلے بہار میں ناول نگاری نہیں ہوئی بلکہ سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، شین مظفرپوری اور ذکی انور نے بھی ناول لکھے اور رشیدۃ النساء کو تو پہلی

خاتون ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس طرح بہار میں اردو ناول نگاری کی ایک اچھی روایت دیکھنے کو ملتی ہے لیکن مذکورہ ناول نگاروں کے بعد حسین الحق، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، الیاس احمد گدی، شفق، کوثر مظہری، اچاریہ شوکت خلیل وغیرہ وغیرہ ناول نگار منظر عام پر آئے۔ ان لوگوں سے آج بھی بہتر سے بہتر ناول نگاری کی توقع کی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف بہار کے مسائل اور انسانی کرب کی چیختی آوازیں محسوس کیں بلکہ آئے دن رونما ہونے والے واقعات وحادثات اور برقیاتی ذہنوں کی نشاندہی بھی کی ہیں ساتھ ہی سیاسی اتھل پتھل اور فرقہ وارانہ فسادات کی پینٹنگ اس انداز سے کئے ہیں کہ اس میں بیرون بہار کا عکس نظر آتا ہے۔ چنانچہ محمد علیم اس فہرست کی ایک معتبر کڑی تسلیم کئے جا چکے ہیں۔

محمد علیم یوں تو افسانے، ڈرامے اور تراجم وغیرہ میں بھی شناخت رکھتے ہیں لیکن ناول نگاری سے ہی ان کی شہرت اور قدر و منزلت ہے۔ ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' محمد علیم کا مقبول ناول ہے اس سے قبل ''جو اماں ملی تو کہاں ملی'' سے محمد علیم بحیثیت ناول نگار اپنی شناخت متعین کرا چکے تھے لیکن ۲۰۰۲ء میں جب ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' منظر عام پر آیا تو ادب کا غافل طبقہ بھی محمد علیم کو ناول نگار کی حیثیت سے جاننے لگا۔

کہانی کا موضوع، بہار کے سیاسی مسائل، الیکشن کی سرگرمی اور معاشرے کا ٹوٹتا بکھرتا نظام سے عبارت ہے۔ یہ سارا منظر آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی بے اعتدالی، کاہلی اور لاچاری کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے ہم تقسیم ہند کا المیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک طرف ملک کی اقتصادی حالت کمزور تھی تو دوسری طرف مذہب اور ذات پات کی لڑائی نے اسے اور بھی کھوکھلا کر رکھا تھا۔ بعد ازیں بابری مسجد کی شہادت اور رام جنم بھومی کا مسئلہ نہ صرف گجرات اور نواح گجرات سے منسلک تھا بلکہ پورے ہندوستان میں سیاسی جبر وقدر اور فرقہ وارانہ فسادات کے تناظر میں ابھر کر سامنے آیا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈر شطرنج کے بکھرے ہوئے مہروں کی طرح اپنی اپنی چالیں چل رہا تھا۔ اس کا واضح اثر بہار اور اس کے گرد ونواح نے بھی قبول کیا۔ پھر یہ کہ کانگریس کے وقت میں بھاگلپوریوں کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ آج بھی قیامت صغریٰ سے کم نہیں۔ ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' کا ملغوبہ تاریخ کے انہیں جبر سے پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کا دائرہ وسیع ہو کر پورے ہندوستان پر منطبق ہو گیا ہے۔ اگر مدرسہ رحیم العلوم، راجپور گاؤں، نیپال کی سرحد، گنیش پور کی سرحد، لال بگیا ندی وغیرہ وغیرہ مقامات اور لین دین کے مسئلے کو نکال دیا جائے تو یہ ناول پورے ہندوستان کا ترجمان ہو سکتا ہے لیکن جغرافیائی بندشیں ناول کا حسن ہوتی ہیں اسے ہم الگ نہیں کر سکتے ہیں۔ نیک محمد، نجم الدین، کریم الدین، رام نارائن، نذرالحسن، سمیع احمد اور جمیل جیسے لوگ بہار کے باہر بھی مل جائیں گے جو آئے دن سیاسی اُتھل پتھل میں حصہ لیتے ہیں اور الیکشن کے موقع سے فعال نظر

آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا سب کچھ بیچ کر روٹی خریدتے ہیں اور پھر سیاست کی روٹیاں سیکنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں عوام کی آہ وفغاں اور ان کے نالوں کو کون سنتا ہے۔ چنانچہ محمد علیم بہار کے ایسے ہی لوگوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جو مسلم ووٹ کا استحصال، ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپسی رنجش اور وہابی سنی کی لڑائی کرانے میں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ عورتوں کی آزادی، ماں باپ کے فرائض، طلاق اور خاندانی نظام کے تعلق سے جو مسائل بہار میں پیدا ہوتے رہے ہیں اس کا واضح اثر ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' ہے۔ مولوی کی سادہ دلی، تنگ نظری اور قرآن وحدیث کی اندھی پیروی نے مسلمانوں کو وقت کے جبر میں قید کر رکھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد علیم کا دل قوم کے درد سے لبریز ہے۔ ناول میں افسانہ، آمنہ بیگم، شریفہ بیگم اور شبا کا کردار اپنی اپنی جگہ اہم ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

> ''افسانہ نے برآمدے میں آکر جلتی لالٹین کی لو تیز کی، چٹائی بچھائی، ہینڈ پائپ سے پانی بھر کر لائی اور دستر خوان بچھا کر کھانا رکھ دیا پھر اپنی ماں کو پکارتے ہوئے بولی آجاؤ اماں۔ آمنہ بیگم بیٹی کی آواز پر کمرے سے باہر نکل کر آگئی۔ ان کے لئے ساری دنیا تاریک تھی کیا اندر کیا باہر۔ کیا روشنی کیا تاریکی، سب کچھ ایک جیسا۔ ادھر روتے روتے ان کی آنکھوں کی رہی سہی روشنی بھی جاتی رہی تھیں۔ جب دونوں ماں بیٹی رات کے سناٹے میں کھانے کے لئے بیٹھی تو اس وقت سارا گاؤں سو رہا تھا اور دونوں دو سایوں کی طرح اندھیرے اور روشنی میں زندگی کے معنی تلاش کر رہی تھیں۔''

مذکورہ اقتباس نہ صرف ماں بیٹی کے جذبات سے لبریز نفسیاتی حقیقت کی عمدہ مثال ہے بلکہ بہار جیسے صوبہ میں پسماندگی، تنگ نظری اور لاعلمی کی بنیاد پر جو فضائیں ہموار ہوئیں اور اس کی زد میں جو مسئلے پیدا ہوئے اس کی بھی عمدہ مثال ہے۔ آج بھی بہار کے مختلف جگہوں پر اس طرح کے واقعات رونما ہوتے رہے ہیں۔ بہار میں لڑکیوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ شادی، جہیز اور طلاق کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آمنہ بیگم اندھیرے اور روشنی میں زندگی کے معنی تلاش کرتی ہیں۔ محمد علیم نے اسے ناول کے ذریعہ اس کی بنیادی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بہار میں تعلیمی پسماندگی بے پناہ ہے۔ خاص کر مسلمانوں میں اور مسلمان لڑکیوں میں تو اس کا فیصد صفر کے برابر ہے۔ محمد علیم کا ذہنی شعور اس بات کی واضح غمازی کرتا ہے کہ ہندوستان پوری دنیا میں گاؤں کا دیش ہے اور بہار پورے ہندوستان میں گاؤں کا راجیہ ہے۔ اسی لئے بہار کا بیشتر طبقہ کھانا کھا لینے اور کھیتوں میں مزدوری کرنے کو ہی زندگی کا اولین مقصد سمجھتے ہیں۔ پھر یہ کہ بہار کا بعض طبقہ ایسا بھی ہے جو حاکمانہ کردار کا حامل ہے۔ یہ لوگ بہت تھوڑے ہیں لیکن عقل سے بہت مضبوط ہیں۔ یہ جب جس کو چاہے

ISSN : 2582 - 3612

انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ آمنہ اور افسانہ کا معیار، ان کا گھریلو ماحول، میکے اور سسرال کی زندگی اور ان کی سماجی نفسیات پر تعلیمی پسماندگی کا لیبل ہے اس طرح کے لوگ کبھی بھی معاشی اعتبار سے مضبوط نہیں ہو سکتے۔ آرزوؤں اور تمناؤں سے باہر جھانکنا ان کا مقدر نہیں۔ یہ لوگ معاشی، سیاسی اور تعلیمی کرم فرماؤں کی بے توجہی کے شکار ہیں جو صرف اپنا گھر اور اپنا تن دیکھتے ہیں۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے نکتے محمد علیم کی گرفت میں ہیں جو آئے دن بہار میں اجتماعی مسائل کو ہوا دیتے ہیں۔ حقیقت میں نیک محمد کا گھرانہ یہاں کے کھردرے ماحول کی عریاں تصویر پیش کرتا ہے جہاں سے نہ صرف الیکشن کی سرگرمی، فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا پتہ چلتا ہے بلکہ ایک عام زندگی کی آسائش اور رہائش کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ محمد علیم خاموش تماشائی کی طرح انگشت بدنداں ہیں کہ آخر اس سب کے باوجود کرم فرماؤں اور عہدے داروں کو احساس کیوں نہیں ہوتا۔ بار بار محمد علیم نے برہمنوں، بھومیہاروں، کلواروں اور راجپوت جیسے لوگوں کا تذکرہ سیاسی اور سماجی مسئلوں کے درمیان اس طرح کئے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا آج بھی افسر شاہی کے چنگل میں ہے۔ لوگ جب جو چاہے کروا سکتے ہیں۔ سیاسی روٹی سینکنے والے، بھرشٹا چار کی تبلیغ کرنے والے اور تھانیداروں کو کمزور کرنے والے انہیں لوگوں کی مدد سے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں جو آئے دن مذہب اور ذات پات کے نام پر دنگا فساد کرواتے ہیں۔ کبھی مندروں کو نشانہ بناتے ہیں تو کبھی مسجدوں کو..... بہار کے سماجی مسئلوں میں تعلیمی پسماندگی، غریبی، بے بسی اور مفلسی کو امتیاز حاصل ہے۔ یہاں کے لوگوں کو قدم قدم پر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون بہانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھئے :

> ''وہ ہار مان کر ماں کے بے حد اصرار کے بعد غسل خانے چلی گئی۔ غسل خانہ میں تین طرف سے ٹاٹ کھڑی کر دی گئی تھی اور سامنے پٹی سے پردہ کر دیا گیا تھا۔ ہینڈ پائپ سے پانی بھرو اور اندر لے جاؤ پھر چار پانچ اینٹ ڈال کر بنائی گئی فرش پر بیٹھ کر نہالو۔''

کردار نگاری کے تعلق سے محمد علیم کامیاب ہیں۔ وہ اپنے کردار میں ڈوبتے اور ابھرتے رہتے ہیں خواہ وہ نسوانی کردار ہو یا مردانہ کردار یہی وجہ ہے کہ اس کا ناول ایک ایسے ذہن کی غمازی کرتا ہے جو سوچتا ہے، تجزیہ کرتا ہے اور پھر آگے کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ یہ التزام فطری بھی ہے اور ذاتی بھی پھر یہ کہ امیروں اور بڑے بڑوں کی نقالی میں عوام اس قدر آگے ہو چکے ہیں کہ ان کا آنسو پوچھنے والا کوئی بھی نہیں۔ اصل میں محمد علیم کو اس بات کا احساس ہے کہ بہار کے لوگ گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نگاہیں چمکتی اور تبدیل ہوتی ہوئی دنیا سے خیرہ ہیں۔ یہ لوگ پگھلتے ہوئے برف کی طرح پل پل اور لمحہ لمحہ سیاسی سمندر میں قلابازیاں کرتے ہیں اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو خود کو مختلف طبقوں، بولیوں اور رسموں میں محبوس مذہب و

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مسلک اور تہذیب وثقافت کا رونا روتے ہیں۔ بہاری لوگوں کی یہ عجیب وغریب مجبوری ہے جسے محمد علیم جیسا فنکار محسوس کرتے ہیں۔ محمد علیم اپنے کردار کی تشکیل میں اصل سے غافل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کا وہ کردار بھی ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' میں سانس لیتے ہیں جو آبادی کے لحاظ سے پچیس تیس فیصد ہیں۔ لیکن بے روزگاری اور بے یارو مددگاری میں زندگی جئے جا رہے ہیں۔ ان بے روزگاروں کا مداوا سرکاروں سے بھی نہیں ہوتا ایسے میں غیر سماجی لوگ ان کی پرورش کرتے ہیں اور اس کا استحصال کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف روزمرہ کی زندگی اثر انداز ہوتی ہے بلکہ شریف اور معتبر لوگوں پر سے بھی عوام کا اعتبار اٹھتا چلا گیا ہے۔ بے روزگار لوگوں میں کچھ لوگ پڑھے لکھے ہیں اور کچھ لوگ ان پڑھ ہیں۔ باقی کسی گروہ یا کسی سیاسی لیڈر کی چاپلوسی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مثلاً ذیل کے اقتباسات ملاحظہ کریں یہ لوگ پڑھے لکھے بے روزگار لوگوں کی فہرست میں ہیں :

> ''ان تینوں نے گاؤں کے اس مشہور چوک کے کوٹتی ہوئی نام کو اپنے ادبی وقار کے لئے ایک بدنما داغ تصور کیا تھا اور کئی ناموں کی تجویز کے بعد مولانا محمد حسین احمد مدنی صاحب کے نام پر یہ نام تجویز کیا گیا تھا۔ تینوں ہی بے روزگار تھے لہٰذا تینوں نے ہی جیسے تیسے کچھ روپے جمع کر کے یہ بورڈ لگوایا تھا۔''

> ''ڈاکٹر اس وقت چادر اوڑھے اپنے کلینک میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دو تین حواری باتوں میں مشغول تھے ان میں معین اور قاسم شامل تھے۔ قاسم ان کا نیا کمپاؤنڈر تھا۔ وہ محلے کا ہی رہنے والا تھا۔ مولوی تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بے کار تھا اور بال بچوں کے گذارے کے لئے بھی محتاج تھا۔''

یہ سارے کردار محمد علیم کے دیکھے بھالے ہیں۔ جو زندگی کے تضادات کو مہمیز کرتے ہیں۔ یہ تضادات سماج کے لئے رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ محمد علیم اس بات کو مانتے ہیں کہ مسائل کے مدھم لو کو تیز کرنے میں جہاں سیاسی لیڈران اور بڑے بڑے افسران کا ہاتھ ہوتا ہے وہیں بے بس اور لاچار نوجوانوں کی جماعت اس میں شدت پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ بہار میں جے پی آندولن کی گونج مشہور ہے۔ اس کی دھمک آج بھی سنائی دیتی ہے۔ بہر حال محمد علیم کردار نگاری کے عمل سے گذرتے ہوئے ان تضادات کو ''ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی'' کے تناظر میں تسلیم کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناول کا نام بظاہر مبہم اور شاعرانہ طرز کا حامل ہو گیا ہے۔ لیکن یہی طرز قاری کے لئے ایک طلسم ثابت ہوتا ہے جو ناول کو

پڑھوانے کی بھرپور طاقت رکھتا ہے۔ بہر کیف محمد علیم موضوع کی مناسبت سے مسائل کو مجموعی رخ دیتے ہیں اور اردگرد کے فضول میں بہہ جانے سے گریز کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات اور آپسی مطالبات جو ایک سماج کا اہم حصہ ہوتا ہے کو یکے بعد دیگرے ہار میں موتی کی طرح پیش کرتے ہیں اور یہی ناول کا اختصاص ہے۔

جزئیات نگاری میں محمد علیم کو مہارت حاصل ہے۔ مہمان کی آؤ بھگت، تہذیب وثقافت، چولہا چکی، امور خانہ داری اور خرید وفروخت جیسے جیسے لایعنی نکتے بھی محمد علیم کی آنکھوں میں جمے رہتے ہیں۔ حد تو یہ کہ کھانا بناتے وقت چولہے کی دھواں سے اگر لڑکی کا کاجل گیلا ہوتا ہے تو اسے بھی محمد علیم محسوس کرتے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ ان لایعنی نکتوں کے بغیر زندگی کس قدر بامعنی ہیں....؟ بہار میں مسئلوں کی کمی نہیں ہے لیکن محمد علیم کو اس بات کا احساس شدت سے ہے کہ بہار میں مسئلے کی بنیاد چولہے چکی، امور خانہ داری اور گھر میں جوان لڑکیوں کی دستک سے ہے۔ جس کی گونج ایوانوں اور شاہراہوں پر بھی سنائی دیتی ہے۔ یہاں بمبئی، میرٹھ اور سورت کی طرح نہ کوئی کارخانہ ہے اور نہ ہی دہلی، کلکتہ، بنارس اور لکھنو کی طرح کوئی یونیورسیٹی۔ ایسے میں پسماندگی، تنگ نظری، سیاسی الہڑپن اور مزدور طبقے کے لوگ پیدا ہوتے ہیں تو پھر بہاریوں کو رونا نہیں چاہئے۔ بلکہ اس کا مداوا کرنا چاہئے۔ محمد علیم اپنے نالوں کی گمشدہ آواز کی جستجو میں بہت دور نکل آتے ہیں۔ اس طرح ناول کے بعض مقام پر تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس کا مکھوٹا اس قدر پیارا اور دلکش ہے کہ تشنگی کے اثرات کو بھی زائل کر دیتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ اگر محمد علیم منظر کشی میں معتبر ہوتے تو پھر یہ ناول بہار کا امراؤ جان ادا ثابت ہوتا۔

Dr. Mustafiz Ahad Arfi
Assistant Professor
Department of Urdu
L.S.College
Muzaffarpur - 842 001
Mob: 9955722260

ڈاکٹر وصی احمد شمشاد

رضا نقوی واہی کی مزاح نگاری

اردو ادب میں صنف مزاح نگاری کی توسیع میں جس طرح ہندوستان کے قلم کاروں نے اپنی قلمی معاونت دی اسی طرح صوبہ بہار کے قلم کاروں کی بھی اس ضمن میں بیش بہا خدمات رہی ہیں۔اس سلسلے سے رضا نقوی واہی کا نام بھی خاص طور سے اہم ہے۔آپ کی شناخت ادبی حلقے میں بحیثیت مزاح نگار کافی اہمیت کا حامل ہے۔آپ کی مزاحیہ تخلیقات اس طرح ہیں۔واہیات ۱۹۵۰ء، طنز و تبسم ۱۹۶۲ء، نشتر و مرہم ۱۹۶۸ء، کلام نرم و نازک ۱۹۷۱ء، نام بہ نام ۱۹۷۲ء، متاع واہی ۱۹۷۸ء، چٹ پٹی نظمیں ۱۹۷۲ء، شعرستان واہی ۱۹۸۴ء۔ مذکورہ بالا تمام تخلیقات سے آپ کی مزاحیہ نگاری کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔مختصر یہ کہ آپ نے اپنی فطری ذہانت اور طبعی ظرافت سے جو ظریفانہ شاعری کا تحفہ قارئین کو دیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔آپ کی مزاحیہ نگاری کے سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''واہی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ایک ایسے منظر نامے کو پیش کرتی ہے جس میں آج کے محقق، نقاد، تبصرہ نگار، شاعر، ایڈیٹر، لیڈر، پروفیسر، ماہر فن کا مریڈ وغیرہ شدید کیفیت میں ظاہر کئے گئے ہیں۔''

(رضا نقوی واہی آئینہ در آئینہ، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص-۱۵۳)

آپ کی مزاحیہ تحریر کے سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ ان میں آپ کا علمی شعور اور عمیق مطالعہ جلوہ نما ہے۔آپ کی مزاحیہ نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بیشتر اہل قلم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اکبرالٰہ آبادی اور ظریف لکھنوی کے بعد سب سے بڑا نام رضا نقوی واہی کا ہے۔آپ کی ادبی خدمات چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ جہاں سنجیدگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔آپ اس عہد سے تعلق رکھتے تھے جب مزاحیہ ادب کے منظر نامے پر ظریف لکھنوی، شوکت تھانوی، غلام احمد فرقت کاکوروی، مجید لاہوری تخلص بھوپالی اپنی تخلیقات سے قارئین ادب کو کافی متاثر کر رہے تھے۔واہی نے اپنی شاہ راہ الگ نکالی اور اجتمائیت پر مزید توجہ دی۔اس سلسلے سے اختر اورینوی کا یہ قول دیکھئے :

''واہی کی ظریفانہ شاعری کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان

ISSN : 2582 - 3612

کے تجربات کا اظہار شاعرانہ طور پر ہوا ہے۔ان کے حواس بیدار ہیں احساس ذکی، جذبہ جاگا ہوا، مگر متوازن اور تخیل گہرا مشاہدہ اور ذکاوت احساس کی مثالیں مختلف نظموں میں ملتی ہیں۔''

(نشتر و مرحم، اختر اورینوی، ص-۱۳)

آپ کے مزاحیہ کلام میں سوقیانہ پن نہیں بلکہ وقار اور معیار صاف طور سے عیاں ہیں ساتھ ہی حساسیت اور Sensibility بھی یہاں موجود ہے۔آپ نے سماجی ناہمواریوں کو جس طرح پیش کیا ہے اور غور و فکر کی دعوت دی ہے وہ قابل تعریف ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رضا نقوی واہی ہنستے ہنستے سماج کی ناسازگاری کو بیان کر دیتے ہیں۔ناہمواریوں کو بہتر کرنے کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ہر ایک طبقہ پر طنز کے نشتر آپ نے خوب چلائے ہیں، لیکن اعتدال کے ساتھ۔آپ کی مزاحیہ شاعری میں پھکڑپن اور پھوہڑپن بھی نہیں کیوں کہ آپ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مزاحیہ شاعری صرف قارئین ہو ہنسنے ہنسانے کے لئے مخصوص نہیں بلکہ سماج کی فلاح کا ایک اہم ذریعہ ہے۔اسی لئے آپ کے مزاحیہ کلام میں طنز کی گہری کاٹ اور تبسم زیرلب کی خصوصیت دیکھنے کو ملتی ہے۔آپ کے یہاں موضوعات کی ایک وسیع کائنات موجود ہے۔اس سلسلے سے پروگرام، شاعر اور کامریڈ، گویا شاعر، نقاد، محقق، ٹیڈی گرل، ٹیڈی بوائے، حضرت کاتب، عرض کاتب، لیڈری کا نسخہ، ریل کا سفر، انٹرویو، میں اسٹوڈنٹ ہوں، ماہر فن، لال فیتہ، جاگیرداری، یو-این-او، دسترخوان، جنرل اسپتال، مچھروں کا گیت، کارپوریشن میں مشاعرہ، گھریلو منصوبہ، ایڈیٹر کا درد، مولوی اور کامریڈ، رسائل میں چھپنے کی ترکیب، مشاعرہ، مشاعرہ سے پہلے اور بعد اور ٹیوشن وغیرہ آپ کی بہترین مزاحیہ نظمیں ہیں۔آپ کی مزاحیہ نگاری کا جائزہ نظم ''ایم ایل اے'' کے اس بند سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو

رفتہ رفتہ ہاتھیوں کی گرم بازاری گئی — اور اب ان کے عوض ہر گاؤں ہر دیہات میں
ناخدایان سیاست جاتے ہیں بارات میں — آج کل شوبھا بڑھانے کے لئے بارات کی
ہر لگن میں مانگ ہوتی ہے ان ہی حضرات کی — ان کی آمد سے بھی مچ جاتی ہے چاروں سمت دھوم
گھیر لیتا ہے انہیں بھی گاؤں والوں کا ہجوم — میزباں کے گھر کی رونق شان و شوکت رعب و داب
دفعتاً بڑھتے ہیں بے پایاں و بے حد و حساب — ایک ہاتھی پر جو پہلے خرچ ہوتی تھی رقم
ایک نیتا پر وہی ہوتی ہے صرف اب بیش و کم — فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھاتا تھا غلہ یہ پلاؤ
اس کا حصہ تھا ایک من ان کا حصہ ایک پاؤ

جہاں تک آپ کے اسلوب بیان کی بات ہے تو اس سلسلے سے یہ کہا جائے گا کہ آپ کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ظریفانہ کلام کو پڑھ کر یہ کہا جائے گا کہ رضا نقوی واہی کو فن اور زبان پر کچھ ایسا غیر معمولی قابو ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ان کا شعری اسلوب اعلیٰ وارفع ہے۔ان کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت موجود ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔یہ بھی کہا جائے گا کہ واہی زندگی کے تضادات کو نمایاں کر کے تحیر و انبساط کی فضا پیدا کرتے ہیں۔یہ خوبی ان کی نگارشات کی عظمت میں اضافہ کرتی ہے۔آپ کے کلام کے سلسلے سے یہ کہا جائے گا کہ یہاں موجود اچھوتی بندشیں قاری کو لطف اندوز کرتی ہیں۔لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ واہی مکروہات کو بھی نازک ونفیس اور شیریں ولطیف انداز میں پیش کرنے کے ماہر ہیں۔تلخی اور ترشی کو مزاحیہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ان کے ظریفانہ کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے ظرافت کا ستھرا مزاق رکھنا بھی قاری کے لئے از حد ضروری ہے۔اس کی خاص وجہ ہے کہ واہی نے صرف ہنسنے اور ہنسانے کے لئے مزاحیہ شاعری نہیں کی بلکہ زمانے کی ناہمواریوں پر غور وفکر کی دعوت دینے اور اسلوب کے اعتبار سے ظریفانہ ومزاحیہ ادب کو ایک نیا رنگ وآہنگ اور لب ولہجہ عطا کرنے کے لئے کیا۔یہی وجہ ہے کہ واہی کی ظریفانہ شاعری ایک خاص مقام رکھتی ہے۔اس سلسلے سے کوثر چاندپوری فرماتے ہیں :

''آپ کا طنز اور مزاح بے حد باوقار ہے۔لب ولہجہ میں بڑی سنجیدگی ہے۔
اس متانت آمیز مزاح کی نظیر دوسری مشکل ہی سے ملے گی۔زبان اس قدر
حیات اور شگفتہ ہے کہ پڑھتے وقت بے اختیار من سے داد تحسین وآفریں
کے الفاظ نکلتے ہیں۔''

(رضا نقوی واہی آئینہ در آئینہ، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص-۴۰۲)

آپ کی نگارشات ''واہیات''، ''طنز وتبسم''، ''کلام نرم ونازک'' اور ''متاع واہی'' میں شامل نظمیں آپ کے سماجی شعور اور انسان دوستی کی بہترین ترجمانی کرتی ہیں۔آپ نے اپنے تاثرات اور خیالات واحساسات کی آئینہ داری کے لئے جس شعری اسلوب کی تخلیق کی ہے اس میں طنز وتبسم کے عناصر موجود نظر آتے ہیں۔جن سے ہم آپ کے اصلاحی میلان کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔واہی کا یہ اختصاص رہا کہ انہوں نے ان عناصر کا تفریح کی غرض سے استعمال نہیں کیا بلکہ شخصی اور معاشرتی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود کی غرض سے ان عناصر کا استعمال کیا ہے۔آپ کی نظموں سے واہی کا یہ نظریہ صاف عیاں ہے کہ وہ بہتر معاشرہ اور بہتر انسانی زندگی کے خواہاں ہیں۔مختصر یہ کہ بہتر اور خوشگوار اقدار حیات کی جستجو اور سنہرے مستقبل کی خواہش آپ کی نظموں کی تخلیق کا واحد مقصد ہے۔مضمون کے آخر میں یہ اقتباس شامل کرنا چاہوں گا ملاحظہ کیجئے :

''انہوں نے تمسخر اڑانے اور سطحی مضحکہ خیزی کو معیار شاعری تصور نہیں کیا۔
ان کا اصلاحی نقطہ نظر دردمندانہ شعری تصور اور انسان دوستانہ مشرب ومسلک
بہتر سے بہتر انسانی قدروں کے جویا رہے ہیں، جو خلوص واہی صاحب کی
شخصیت میں موجود ہے وہی ان کے شعری اسلوب میں بھی ہے۔انسانی
قدروں نے ایماندارانہ دردمندی اور دردمندانہ ایمانداری کی جو لطیف روشنی
ان کی شخصیت میں ہے وہی ان کے شاعرانہ آہنگ کی تھی اہم ترین اور کشش
انگیز توانائی ہے۔''

(رضا نقوی واہی آئینہ در آئینہ، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص-۱۰۲)

Dr. Wasi Ahmad Shamshad
Assistant Professor (Guest Faculty)
University Deptt. of Urdu
L. N. Mithila University
Darbhanga (Bihar)

محمد ضیاء الحق

احمد سجّاد کی تنقید نگاری

ادبی دنیا میں احمد سجاد کا مقام خاص طور سے اہم ہے۔آپ کی ادبی شخصیت کئی رخ سے جانی اور پہچانی جاتی ہے مختصر یہ کہ آپ نے اپنی تحریروں،تقریروں اور سماجی کاموں سے شناخت بنانے میں کامیابی پائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کو علم ودانش کے درمیان اور فکر ونظر کے خاص حلقہ میں اہمیت حاصل ہے۔آپ کی دیگرادبی صلاحیتوں کی طرح تنقیدی صلاحیت بھی اہمیت کا حامل ہے۔آپ کی تنقیدی صلاحیت کا جائزہ ''داستان سحرالبیان: میر غلام علی عشرت''اور تنقید وتنقیح سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔اس سلسلے سے خود احمد سجاد رقم طراز ہیں:

''اس سلسلے میں محض تاریخ تذکرے اور نظری مباحث پر منحصر نہیں کیا گیا ہے
بلکہ ان کے ایک نمائندہ نثری کارنامہ داستان سحرالبیان ۱۸۱۵ کا متن اور اس
کا مفصل خصوصی تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے تاکہ عشرت کی ادبی صلاحیتوں
اور خصوصیات کا صحیح صحیح اندازہ کیا جاسکے۔ یوں ان کی زندگی شاعری،
نثرنگاری اور داستان نویسی پر تقریباً تمام پہلوؤں سے تحقیقی وتنقیدی روشنی
ڈالی گئی ہے۔''

(داستان سحرالبیان: میر غلام علی عشرت،ڈاکٹر احمد سجاد،ص-۵)

اسی طرح تنقید وتنقیح سے بھی آپ کی تنقیدنگاری کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کتاب میں شامل سارے مضامین تعمیری ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ساتھ ہی شخصیات سے متعلق بھی تنقیدی مضامین ہیں۔اہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ مغرب نے تکنیکی ترقی،عصری قوت،معاشی خوش حالی کے ذریعہ مشرق کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔اردو ادب پر بھی اس کا خاص اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔مطلب یہ کہ اس صورت حال نے زندگی وادب کے تعمیری نقطہ نظر کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے اس سلسلے سے احمد سجاد کا ناقدانہ نظریہ ملاحظہ کیجئے:

''عورت عورت سے اور مرد مرد سے شادی رچا رہے ہیں اس فکر ونظر کا فساد

یہ بھی ہے کہ آج ساری دنیا میں تین بنیادی رشتوں کا بحران پیدا ہوگیا ہے۔
یعنی انسان اور خدا،انسان اور فطرت،انسان اور انسان کے مابین۔''

(تنقید اور تنقیح،پروفیسر احمد سجاد،پیش لفظ)

مغربیت کا اثر کس طرح مشرقی تہذیب وتمدن کے لئے تشفی بخش نہیں ٹھہرا اس جانب احمد سجاد نے بہت ہی بے باکانہ انداز میں ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔یہ تو عالمی حالات پر ان کی تنقیدی نگاہ تھی اسی طرح تنقید وتنقیح میں آپ نے کئی شخصیات پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔مثال کے طور پر مولانا ارتضٰی الدین، حاذق ضیائی سہسرامی مرد قلندر کے عنوان سے آپ کا مضمون اس کتاب میں شامل ہے جس کے حوالے سے آپ نے مولانا ارتضٰی الدین کی شاعری اور شخصی کوائف پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔اسی طرح ابوالمجاہد، زاہد عزی بگھروی،ڈاکر رئیس احمد نعمانی وغیرہ کی ادبی کارکردگی پر روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کے سلسلے سے احمد سجاد فرماتے ہیں :

''فارسی اور اردو میں ان کی کم وبیش سترہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔جن میں
چھ نعتیہ مجموعے ہیں۔شعاع نور اردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد
اور ممتاز مجموعہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی اردو فارسی اور
عربی، زبان سے گہری واقفیت رکھتے تھے اس لئے اپنے فکر وفن کو قرآنی
فکر سے ہم آہنگ ومتوازن رکھا ہے۔''

(تنقید وتنقیح،احمد سجاد،ص-۱۶۱)

اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کا نمایاں مقام ہے۔پروفیسر احمد سجاد نے انہیں فکشن کی ایک منفرد فنکار قرار دیا ہے۔مصنفہ کی حیثیت مختلف الجہات ہے۔وہ اردو اور انگریزی کی صحافی،مترجم اور اردو کی ایک اہم فکشن نگار تھیں۔انہیں بڑے بڑے انعامات اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔ان کی ادبی خدمات پر کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔کئی جلدوں میں ان کی کلیات بھی منظر عام پر آ گئی ہے۔پروفیسر احمد سجاد ان کے فکشن کے بارے میں فرماتے ہیں :

''میرے بھی صنم خانے سے'،'آخری شب کے ہمسفر' اور پت جھڑ کی آواز'
سے' کار جہاں دراز ہے' تک ان کا تخلیقی سفر نئی سے نئی بلندیوں کو چھوتا رہا۔
خاص کر'آگ کا دریا' سے دنیائے ادب میں ان کے نام کی دھوم مچتی رہی۔
ان کے فکر وفن پر درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔انہیں اردو فکشن میں نئے نئے
رجحانات کے بانی اور پریم چند کے بعد عہد آفریں شخصیت تسلیم کرلیا گیا۔''

(قرۃ العین حیدر، اردو فکشن کی ایک منفرد فنکار، مشمولہ ''تنقید و تنقیح''، ص-۱۸۸)

پروفیسر شارب ردولوی کی تنقید نگاری پر بھی احمد سجاد نے پوری روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور سے ''اسرار الحق مجاز'' پر لکھے گئے مونو گراف کو انہوں نے جامع ترین ادبی تعارف کا نمونہ کہا ہے۔ شارب ردولوی کی درجنوں تنقیدی و تحقیقی تصانیف شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ مجاز پر لکھے گئے مونو گراف کو موصوف نے دستاویزی حیثیت کی کتاب بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجاز کی مختلف سیاسی و انقلابی نظموں کو جوش اور دوسرے شاعروں کی نظموں سے تقابلی مطالعہ کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ لفظ کے نبض شناس تھے۔ ان کے الفاظ اور تراکیب میں جو تخلیقی استعمال ہے وہ دوسروں کے یہاں بہت کم ہے۔ انہوں نے بعض نظموں کے اشعار کا حوالہ دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی نظمیں ان کی غزلوں کی توسیع ہیں۔ ان کے اشعار میں نیا پن ہی نہیں اپنا پن بھی ہے۔

پروفیسر ظفر حبیب کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں کہ وہ نظم و نثر دونوں میں خامہ فرسائی کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعہ ''تفہیمات و تنقیدات'' کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی تنقید کو تحقیقی کاوشوں سے مدلل و موثر بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ اپنے اس مجموعہ میں انہوں نے جن لوگوں پر روشنی ڈالی ہے ان کا ایک دوسرے سے جا بجا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''ظفر حبیب کی تنقید نگاری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ استفادہ اور مطالعہ و تحقیق کے معاملہ میں اپنے ذہن و فکر کی کھڑکیوں کو کھلا رکھتے ہیں، مگر کسی قطعی رائے کے اظہار میں اپنے تعمیری و اخلاقی نقطہ نظر اور متوازن و معتدل رویے سے کبھی دامن کش نہیں ہوتے بلکہ رد و قبول کی جھجک سے بے نیاز ہو کر اپنی فکر کو مدلل و مبرہن بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس پر قائم رہتے ہیں۔''

(پروفیسر ظفر حبیب کی تنقید نگاری، مشمولہ ''تنقید و تنقیح''، ص-۲۱۰)

یہ تو ہوئی ادبی شخصیات کے حوالے سے آپ کی ناقدانہ رائے آپ نے ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور تعمیری ادب کے حوالے سے بھی اپنی ناقدانہ رائے دی ہے جس میں نہ ہی جانبدارانہ رویہ ہے اور نہ ہی ابہام ہے بلکہ آپ کا ناقدانہ شعور کافی تشفی بخش ہے۔ مختصر یہ کہ موصوف نے تعمیری ادبی تحریک کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے تعمیری ادبی تحریک کو نہ صرف اردو کی تمام ادبی تحریکات (تحاریک) ور جحانات پر فوقیت دی ہے بلکہ بعض عالمی ادبی تحریکات پر بھی تعمیری ادبی تحریک ہی کو ترجیح دی ہے۔

موصوف کی رائے میں ادب کو ایسا ہونا چاہئے جو انسان دوست اور انسانیت نواز ہو، جو زندگی کی

آرائش و زیبائش پر خاص توجہ دے تا کہ ایک صحت مند و توانا معاشرہ تشکیل پا سکے۔ ایسا معاشرہ جو افراد میں ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس پیدا کرے، جو لوگوں میں خالق کائنات، کائنات، انسان اور زمانے کو جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے، جو خالق کائنات اور کائنات، خالق کائنات اور انسان اور کائنات اور انسان کے تعلق حقیقی کو سمجھنے کی تلقین کرے، جو ہر ایک شے کے روشن پہلو پر نظر ڈالے تا کہ مایوسی اور افسردگی اسے چھو کر نہ گزر سکے۔

جو جمالیاتی و اخلاقی اقدار کی تحسین اور ادب اور زندگی کے باہمی رشتے میں استحکام پیدا کرے۔ اخلاقی اقدار کی بنیاد اسلامی نظریات پر رکھے جو ہر ساعت حسن، خیر اور صداقت کو پیش نظر رکھے۔ قرآن اور سنت کی روشنی ہی میں حسن، خیر اور صداقت کو پرکھے آپ کی رائے میں تعمیری ادب ڈارون کی ارتقائیت، میکیاویلی کی وطنیت، کارل مارکس کی اشتراکیت، فرائیڈ کی جنسیت، ایڈلر کی لاشعوریت، ینگ کی اساطیریت اور ژاں پال سارترے کی وجودیت کی طرح موت سے ہم کنار نہ ہوگا اور نہ ہی ترقی پسندی، جدیدت، مابعد جدیدیت، ساختیات اور پس ساختیات کی طرح تماشہ دکھا کر کھلاڑی گیا والی کیفیت سے دوچار ہوگا۔

تمام باتوں کی روشنی میں ہم احمد سجاد کی تنقید نگاری کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

Md. Ziaul Haque
Asstt. of Professor
Deptt. Urdu
B. L. N. L. Bohra College
Rajmahal, Sahebganj- 816 1408
Mob.- 70509 29150

ڈاکٹر محمد فہیم ربّانی

انتظار حسین کے افسانے اور اساطیری جمالیات

اردو افسانہ اپنے آغاز سے ہی اساطیر کے ساتھ ایک زندہ تخلیقی تعلق استوار کئے ہوئے ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگار شعوری اور لاشعوری ہر دو سطحوں پر اساطیر کو اپنی تخلیق کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری وغیرہ کے یہاں اساطیر کے ساتھ ایک تخلیقی تعلق قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے، لیکن اردو افسانے میں اساطیر کا بھرپور اور بامعنی استعمال جدیدیت کے زیر اثر ہوا جب جدید افسانہ نگاروں نے ترقی پسندوں کی حقیقت نگاری سے تخلیقی بغاوت کی تو بقدر ظرف اپنے لئے علائم کے سرچشمے تلاش کئے۔ انہیں سرچشموں میں ایک اسطورہ بھی ہے۔ جنہیں جدید افسانہ نگاروں نے اپنے عہد سے مربوط کرتے ہوئے ایک نئی معنویت دینے کی کوشش کی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں نے اساطیر سازی کے عمل میں جہاں پہلے سے موجود اساطیر سے فائدہ اٹھایا وہیں دوسری طرف آسمانی صحائف، صوفیا کے ملفوظات، مقدس شخصیات سے تعلق رکھنے والے تاریخی اور نیم تاریخی واقعات، ہندوستانی دیومالا، لوک روایات اور لوک اوہام سے رشتہ استوار کرتے ہوئے نئی اساطیر کی تشکیل بھی کی۔ اردو میں انتظار حسین، سریندر پرکاش، جوگندر پال، دیویندر اسر، بلراج مین را، دیویندر ستیارتھی، محمد منشا یاد، ترنم ریاض، سلام بن رزاق وغیرہ ایسے افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیوں میں اساطیری عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں انتظار حسین ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ہندی دیومالا اور عربی اساطیر (جسے اسلامی اساطیر بھی کہتے ہیں) کے امتزاج سے اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اساطیر و دیومالا کا جس پیمانے پر استعمال کیا ہے اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں اس پیمانے پر اس کا استعمال نہیں ملتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے عہد کی تہذیبی، سیاسی، تمدنی اور خانگی انتشار کے اظہار کے لئے ایک ایسا بیانیہ تخلیق کیا جس کی اساس اساطیر پر استوار ہے جو عوامی حافظے کا جزو جلیل ہے۔ انہوں نے عقائد کی منطقی تاویلات سے گریز کرتے ہوئے اس مقبول عام تصور کو مرکز نگاہ بنایا اور اس کو روحانی تجربے کی اساس ٹھہرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مذہبی طرز احساس رکھنے والے کئی

علائم جیسے امام باڑہ، عَلَم کربلا، دلدل، امام کی سواری وغیرہ آئے ہیں جو اسطورہ کے مافوق البشر عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اساطیر کی گہرائی اور تہہ داری نے انتظار حسین کے فکری تخیل کو ایک ایسی بلندی عطا کیے جو زندگی کے وسیع تر امکانات کا پتہ دیتی ہے۔ انتظار حسین کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اجتماعی حافظے میں مضمر تخلیقی امکانات سے اپنی دنیا منور کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے فن کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

> ''انتظار حسین کا فن اپنی قوت ان تمام سرچشموں سے حال کرتا ہے جو تہذیبی روایات کا منبع ہیں یعنی یادیں، خواب، انبیا کے قصے، دیومالا، توہمات، ایک پوری قوم کا اجتماعی مزاج اور اس کا کردار اور اس کی شخصیت۔''
>
> (انتظار حسین ایک دبستان، از۔ ارتضیٰ کریم ص-۱۴۳)

انتظار حسین نے اسلامی اساطیر سے استفادہ کرتے ہوئے بہت سے افسانے تخلیق کئے ہیں، جن میں، آخری آدمی، زرد کتا، شرم الحرم، کانا دجال، دوسرا گناہ، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے، مچھلی، مکڑی، ملکہ سبا اور حضرت سلیمان، قصہ سکندر ذوالقرنین کا، رات، دیوار، شہر افسوس، انتظار، خواب اور تقدیر، خیمے سے دور، کشتی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے اسلامی اساطیری پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں انتظار حسین کا تخلیقی جوہر اسلامی اساطیر کی تشکیل نو کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

''زرد کتا'' بھی اساطیر عناصر پر انتظار حسین کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں انہوں نے قصص اور حکایات کے توسط سے معاشرہ کی چیرہ دستوں، سماجی انتشار اور سوسائٹی کے انحطاط کو پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کہانی کی اساس صوفیا کی کرامات اور ملفوظات پر رکھی گئی ہے۔ یہ کہانی شیخ عثمان اور ان کے مریدانِ باصفات کی ہے۔ شیخ عثمان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کبوتر کی طرح اڑنے پر قادر ہیں اس لئے ان کا نام ہی شیخ عثمان کبوتر ہے۔ اس خوبی سے ان کی شخصیت میں اساطیری جہات نمایاں ہو جاتی ہیں۔

''شرم الحرم'' اور ''کانا دجال'' میں عالم عرب کے مسائل پر بڑے ہی اچھوتے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ پس منظر میں عرب اسرائیل جنگ، مسلمانوں کی بے بسی اور فلسطینی عوام کی بے چارگی شامل ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ان افسانوں میں عالم عرب اور امت مسلمہ کے شاندار اور تابناک ماضی کے حوالے سے موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا ہے۔ دونوں افسانوں میں مشہور زمانہ کردار ''کانا دجال'' کو اساطیری حوالے کے طور پر اس وقت کے اسرائیل وزیر اعظم کے ساتھ جوڑ کر دیکھایا گیا ہے۔

اسی طرح ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے''، ''رات'' اور ''دیوار'' میں یاجوج ماجوج اور سد سکندری کی اساطیر کو انتظار حسین نے الگ الگ معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کی ہر معنوی جہتوں کا احساس

دلایا ہے۔

''خواب اور تقدیر'' میں کربلا، کوفہ، مکہ، مدینہ، ابن زیاد اور امام زماں کے ذکر سے اساطیری فضا میں ایک ناگزیر کربلائی پس منظر نمود کرتا ہے اور افسانہ ایک اور معنوی جہت سے آشنا ہوتا ہے۔ افسانہ میں اس اسطورہ کو عہد حاضر سے جوڑ کر اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ افسانہ مابعد الطبیعاتی سطح پر تباہی کی عالمگیر قوت کا اشاریہ بن جاتا ہے اور خیر و شر کی ابدی رزم گاہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں :

> ''انتظار حسین کے افسانوں میں حسن، حسین، اما، سواری، شہادت، روضہ، کربلا، امام باڑہ، عزاخانہ، محرم، چہلم، علم پٹکا، تعزیہ، مجلس، جلوس مرثیہ وغیرہ مسلمانوں کی ایک جماعت کی ایسی تہذیبی علامتیں بن کر ابھرتی ہیں جن کی تکرار سے ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی فضا کی تشکیل ہوتی ہے۔''
>
> (انتظار حسین، علامتوں کا زوال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص-۹۰)

''انتظار'' میں بھی اسلامی اسطور سازی کی ایک کامیاب کوشش ملتی ہے۔ اس افسانے میں امام غائب کے انتسار کے عمل کو دکھایا گیا ہے، لیکن بعد میں یہ شکست خواب کے منظر میں ڈھل جاتا ہے۔ جب کہ ''کشتی'' میں قرآن مجید، عہد نامہ، عتیق، توریت، ویدوں، پرانوں اور شاستروں سب کی مذہبی اور اساطیری روایتوں سے مدد لی گئی ہے۔ دنیا کی تمام اساطیر، دیو مالا اور مختلف مذہبی والہامی کتب مقدسہ میں سیلاب عظیم کی روایت ملتی ہے۔ نسل انسانی کی تباہی و بربادی پر مشتمل یہ اساطیری کہانیاں قریباً قریباً ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہیں اور بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ ازمنہ قدیم کے اساطیری ادب میں اس سیلابِ عظیم کی روایت کے سوا اور کوئی ایسی عالم گیر روایت نہیں ملتی ہے۔

''پچھتاوا''، ''نرالا جانور'' اور ''برہمن بکرا'' میں دیو مالا اور جاتکوں کی روشنی میں مہاتما بدھ کے اس تصور کو پیش کیا گیا ہے کہ زندگی دکھوں کی مالا ہے اور دکھ سے نجات پانا اس دنیا میں ناممکن ہے۔ انسان چاہے جتنے جون بدلے، سو بار جنم لے لے خوشی اور مسرت کو اس عارضی دنیا میں حاصل کر ہی نہیں سکتا ہے۔ زندگی دکھوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کے کردار بدلتے رہتے ہیں۔

''پورا گیان'' میں مرد اور عورت کے فطری رشتے کو گیان کی سیڑھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اس فطری رشتے سے منہ مور کر گیان حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ رستے ہی میں رہ جاتے ہیں اسے پورا گیان کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ پھر اسی بات کی مزید تشریح کے لئے تین حکایتیں ''تھوڑی چھایا لمبی دھوپ''، ''ودھوان اور ودیارتھی''، ''تپ میں بھنگ'' بیان کی جاتی ہیں اور آخیر میں اس نصیحت پر کہانی اختتام پذیر ہوتی

ہے کہ انسان جتنا اس رشتے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی اس میں الجھتا اور پھنستا جاتا ہے، بالآخر وہ گیان سے محروم رہ جاتا ہے۔ تیاگ، تپسیا اور کتابوں سے حاصل کیا گیا علم تو ادھورا ہوتا ہے۔ انسان کامل علم اور پورا گیان اسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب اس کا من شانت ہو اور من کی شانتی ناری کے بغیر نہیں مل سکتی ہے۔ یعنی انسان عورت کے بغیر ادھورا ہے اور اس کا علم بھی اس کے بنا ناقص ہے۔

ان کے علاوہ ''دسواں قدم''، ''اجودھیا''، ''جبالا کا پوت''، ''ناگ نامہ'' اور ''مشکند'' میں بھی انتظار حسین نے ہندو فکر و فلسفہ اور ہندو دیو مالا سے خوب کام لیا ہے۔ ''دسواں قدم'' میں مہابھارت کی مشہور رومانی کہانی ''نل اور دمینتی'' کو انتظار حسین نے اپنی فنی مہارت سے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ آج کی کہانی بن گئی ہے۔ اسی طرح ''مشکند'' میں وقت کی تیز گامی کو ایک خوابیدہ سادھو اور اصحابِ کہف کی مڈبھیڑ سے واضح کیا گیا ہے کہ وقت کتنا برق رفتار ہے۔ سادھو کی ملاقات جب اصحاب کہف سے ہوتی ہے تب اسے پتہ چلتا ہے کہ وقت کتنا بیت چکا ہے، اس کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور نئے لوگوں کا زمانہ یا کلجگ شروع ہوچکا ہے، اس کلجگ میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کھوہ اور اس شہر سے دور پربت پر چلنا چاہئے۔ وہی ایک جگہ میرے لئے بچی ہے۔ جب کہ ''جبالا کا پوت'' میں حصول علم اور گیان کی پراپتی کو دیو مالا کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علم اور گیان تو انسان آفاق و انفس میں پھیلی چیزوں پر تدبر و تفکر سے حاصل کرتا ہے اور اس عمل میں جتنی سعی کرتا ہے اتنا ہی اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ استاد، رشی اور گیانی تو بس راہ دکھاتے ہیں۔

انتظار حسین نے زمانۂ قدیم کی مختلف اساطیر کے امتزاج سے ایک ایسا بیانیہ تخلیق کیا ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل سب آپس میں مل کر ایک ہوجاتے ہیں اور کہانی زمینی و زمانی پابندیوں سے آزاد ہوکر ہر زمین اور ہر زمانے کی کہانی بن جاتی ہے۔ انتظار حسین کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ جب کسی پرانے متن کو اپنے افسانوں میں استعمال کرتے ہیں تو اسے اپنے معاشرتی شعور سے اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ وہ متن آج کے عہد کی کہانی کہتا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس طرح اساطیری جمالیات کو انتظار حسین نے کس ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے مذکورہ بالا باتوں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

Dr. Md. Fahim Rabbani
At/P.O.- Mohiuddinpur Pakri
Via- Benipur
Darbhanga- 847103

انور بارہ بنکوی

احساس وآہنگ کا شاعر۔اشرف یعقوبی

عصرِ حاضر میں جن ادبی معماروں نے قلم زنی کے بل پر نثری یا شعری تخلیقات کی تکمیل کی ہے ان میں یہ دیکھنا نہایت ضروری ہے کہ ادب کے معیار کسوٹی پر ایسی **تخلیقیں** کس حد تک پوری اُتری ہیں جن سے شعورِ زیست کو بدلنے والے اثرات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا گیا ہو اور تخلیقی اوصافِ ادب پر تحریکی اساس کے اغراض ومقاصد کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے ایسی فضا استوار کی گئی ہو مگر تخلیق کاروں کے اظہارِ خیالات پر اتفاق یا اختلافات کے جزوی پہلوؤں سے قطع نظر کرتے ہوئے اہلِ زبان وادب کے نقد ونظر کی روایات کو برقرار رکھ کر جزئیات نگاری کے تحت فن کی بلندی کو ان تخلیقات نے کس حد تک چھونے کی سعی کی ہے یا نہیں ادبی معماروں نے اپنے بحرِ فکر میں ہچکولے کھا کر واقعات وسانحات کے مدِ نظر ان منظر ناموں کی عکاسی کے لئے اپنے حسنِ انتخاب میں احساس کی تازگی کو کس اوسان خطا پر موقوف کیا اور اپنے خیالات کی بنیادوں کو شعوری عینک کے ذریعہ زندگی کے میلانات پر اپنے علوم کی وابستگی کے پیشِ نظر غیر معیاری واقفیت یا معیاری واقفیت کے تحت تغیراتی افکار وتصورات کا جائزہ کن ادوار پر معمور ہو کر لیا جس سے زبان وبیان کے پرکھنے والوں پر کیسے اثرات مرتسم ہوں گے ایسے ہی نقطۂ نظر پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے چونکہ ان ہی کوائف میں زبان وادب کی بقا اور ترقی وترویج کے رموز پنہاں ہیں۔

گزشتہ سال 2009ء میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کے لائبریری ہال میں شعری مجموعہ بعنوان ''سرخ آبی پرندہ'' جس کے خالق اشرف یعقوبی ہیں اس مجموعہ کی رسم اجراء کی تقریب میں شرکت کا موقع ملا گرچہ مجموعہ کی رسم رونمائی بحسن وخوبی عمل پذیر تو ہوئی مگر اس تقریب میں شرکت کرنے والے مغربی بنگال، بہار اور جھارکھنڈ سے تشریف لانے والے ادبی میناروں نے **سطحیتی** کی راہ اپنا کر منطبق تقاریری اظہار خیال نے ایسا سماں باندھا جس کے تئیں یہ اندازہ ہوا کہ جتنی جانکاری تھی اپنی معلومات کی بنا پر متضاد اوصاف نے سیمینار کی حیثیت قائم کر دی ہو یقیناً گلہائے بصیرت افروزی کا جواز تو پیش ہوا مگر مجموعہ سرخ آبی پرندہ کے خالق اشرف یعقوبی کی ادبی لیاقت، صلاحیت، زندگی کرنے کے تجربات، عقیدہ وایمان کے کوائف کی بہتر پاسداری جسے فطری الفاظ میں مناظر کی ترجمانی اور قلم کے جواہر پاروں کی رمق اس کی

ISSN : 2582 - 3612

اہمیت کے حامل تقاضوں پر روشنی ڈالی یہ امر یقینی طور پر ایک معمہ بن کر رہ گیا جس سے مجموعہ سرخ آبی پرندہ کے اشعار اور اس کے تاثراتی ذروں کی تب وتاب کے مدھم ہونے کا اعلامیہ پیش ہوتا ہے، سامعین، معاصرین اور نقد ونظر والے اپنے ذہنوں میں وقتی انبساطی گل کی خوشبو سے سرشاری حاصل کر کے رخصت ہو گئے مگر اہمیت کے حامل جواز کے گہرے نقوش کے اثرات کی ادبی چاشنی کے ذائقے نہ لے سکے۔اس امر کا کسی شرکائے ادب نے ایسا جامع نقش نہیں چھوڑا یہ فعل فن وادب کے لئے جذبۂ ناشکری کا مقام ہے۔اس کے علاوہ مجموعہ میں شامل ادب کے قابلِ قدر افکار وتقریظ میں ایک جانب معروف شاعر جیسے جملے کا استعمال اور دوسری جانب گمنام شاعر کا کہنا ایک مضحکہ خیز جملے کا ادا ہونا یہ ادبی ریشہ دوانیوں سے کم نہیں ہے۔

فن وادب کی حسین وادیوں میں جب فنکار اپنی فنکارانہ صلاحیت کی بنیاد پر اپنے فن کی جھلکیاں پیش کرتا ہے اس وقت کے نقد ونظر کے ادبی تجربات کو ایمائے تقدس کا سفرنامہ بصورت تخلیق برائے تنقید جیسے سفرنامے کا مسودہ تیار ہوتا ہے، اس سفرنامے کی حتمی ترجیحی آگہی کی عبارت در آتی ہے جس سے فن وادب کے حاشیے میں شک وشبہ، غیر اصطلاحی ادوار، لایعنی معنویتی افکار اور مہمل محل کا شاخسانہ کی کہیں آویزش کا گھیرانہ ثابت ہو جو افہام وتفہیم کے کھانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں اور تخلیق اپنی آب وتاب کے ماسوا فن وادب کی دلکشی کو ماند کر دے جو قارئین کے ذہنوں پر بوجھ بن جائے، مزاج اور ماحول کی دھڑکنیں نزاعی صورت اختیار کر لے۔جب نئی نسل کی پود ایسی تخلیق پر اپنی عصری تعلیم بنیاد کے بوتے سے تجزیاتی نگاہ ڈالے تو امکانی صورتوں میں ایسے آویزشی ادبار وضع ہوتی نظر آئیں جسے اہل زبان وادب اس قسم کی تخلیق کو غیر مستند کا سرمایہ کہیں، ایسی تخلیق کا وجود میں آنا غیر فعالی عمل کی دلیل کہلائے گی۔آمدم برسر مطلب اشرف یعقوبی جن کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع نالندہ کے ایک گاؤں ملناڈیہہ یعنی مولاناڈیہہ دراصل لفظ ڈیہہ جو زبان فارسی سے مشتق ہے اور اس کا صحیح متن دیہہ یعنی گاؤں اس کا جمع دیہات ہے، اگر لفظ ڈیہہ سے اس کو مشق کریں تو شاید ڈیوڑھی جو زبان ہندی سے مشتق ہے، اس کے معنی مکان میں داخل ہونے کا صدر دروازہ، پرانی دہلیز، آستانہ، دخل باریابی، آمد ورفت کی جگہ وغیرہ ہوتا ہے۔اس گاؤں سے قبل اسی ضلع نالندہ کے غیر مسلم آبادی والے گاؤں میں ان کے آبا واجداد کی رہائش تھی جو 1947ء بمطابق 1368ھ میں ملناڈیہہ یعنی مولاناڈیہہ میں نقل مکانی کے بعد رہائش پذیر ہوئے۔ان کا گھرانہ بہت مہذب، تعلیم یافتہ، علم وعمل کا خاصہ چلن، تہذیب وتمدن کی راہ پر زندگی کے وتیرے ان میں شامل رہے۔اسی غیر مسلم آبادی والے گاؤں 1951ء مطابق 1372ھ میں ان کی پیدائش ہوئی۔عصری تعلیم لارن پور مڈل اسکول، ہائی اسکول انڈھوس اور اورینٹل کالج پٹنہ سے مکمل کی۔غربتی نے اس قدر مجبور کیا کہ گاؤں سے جزوقتی طور پر رشتہ توڑ کر شہرِ نشاط یعنی کلکتہ کی جانب پیش قدمی کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے ایسا قدم اٹھایا۔اسی دوران کلکتہ میں

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

فارماسسٹ کی ڈگری سے سرفرازی بھی حاصل کی۔ اشرف یعقوبی کو عصری تعلیم کے دوران ہی صنفِ سخن سے گہرا شغف ہونے کی وجہ سے شعر کہنے کی جسارت در آئی۔ اس رجحان کی بدولت چچا عبدالرشید کے ماتحت شعر گوئی کی منزلیں طے کرتے گئے۔ اصل نام تو والدین کا عطا کردہ محمد اشرف تھا ہی اس میں لفظ محمد حذف کیا چونکہ والد محترم محمد یعقوب اس وجہ سے لفظ یعقوبی کا اضافہ کر کے اپنا تخلص اشرف یعقوبی کیا اور شہر نشاط کے ادبی حلقوں کے مشاعرے کی محفلوں میں حصہ لینے لگے۔ اشرف یعقوبی نے اپنے صنف سخن میں فنی اعتبار سے ربودگی، خود یافتگی اور گم شدگی جیسے توازن کا میلان نہیں اپنایا مگر احساس تو جذبات کے پہلو میں خلوص کو بڑی سنجیدگی سے ضبط و اعتدال کے جامے میں ضرور رکھا۔ ایسے ہی اسلوب کے دائرے میں رہ کر اشرف یعقوبی اس مقام پر پہنچے جہاں ہر فنکار پہنچنے کی خواہش کرتا ہے جو ایک مجموعہ ''سرخ آبی پرندہ'' کی شکل میں ہے۔

ادب و فن کے موجودہ سیاق میں جب جائزے کی ضرورت پڑی ہے تو ارتقائی تاریخ اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کی نصف دہائی میں انجمن ترقی پسند تحریک اردو اور اس کے مصنفین کے اس عہد کی یادیں تازہ ہوتی ہیں جس نے ادبی زندگی کرنے کے لئے ایسے بھی التزام کئے جس میں دو حرفی یا چار حرفی یادوں کی یکجائیت پسندی کی بنیاد پر مرکزی وساطت سے ایک ٹھوس شکل نمایاں ہوتی ہے اور فن اصطلاح کے تاب پر وجہ قدر معنی کا جرأت اظہار ہوتا ہے۔ اس کا سوتا اشتراکیت کے خانوادے سے پھوٹتا ہے۔ اسی قبیل سے وابستہ اشرف یعقوبی کے مجموعے کا عنوان ''سرخ آبی پرندہ'' ہے۔ دراصل سرخا جس کے معنی ایک قسم کا کبوتر، ایک قسم کا گھوڑا اس کے علاوہ کمیونسٹ جو اشتراکیت کا مرکزی محور ہے آب بمعنی پانی، پسینہ، آنسو، عرق، خالص شراب، پھولوں کا قدرتی رس، رونق، چمک، عزت، قدر اور جوہر یہ سبھی جانتے ہیں کہ پرندہ بمعنی اڑنے والا جانور۔ ان تمام حرفوں کے مرکبات سے کون سا مقصد اخذ ہوتا ہے اس اہم نقطے پر قارئین کو غور کرنے کی دعوت ملتی ہے لہٰذا اہلِ نظر اور قارئین اس کے اصطلاحی معنی پر توجہ فرمائیں۔ اشترا کی قدروں کا پرندہ ہی اس مجموعہ کا عنوان ''سرخ آبی پرندہ'' کس درجہ مناسبت کا حامل ہے۔

جہاں تک ذہن کے گوشے سے یہ بات وضع ہوتی ہے جو قطعی اختراعی نہیں ہے۔ ہمارے درمیان عقیدت اور بصیرت کے کھانچے میں سجنے والا روشن دان ایک شیشے کی مثال ہے۔ اس شیشے میں حقیقت کو دیکھ کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں اس وقت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم حسین خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔ اس شیشے کے حاشیے میں عقیدت اور بصیرت ہی حقیقت کے محرکات کے درمیان حامل ہیں جو دیوارِ ہستی میں چھپائے راز سکوت ہے۔ اس کے نزدیک زر اور جواہر جیسے گراں قدر پاروں نے ہستی کو رہن کر رکھا ہے جبکہ ہستی کے گلستاں میں غم اور شادو خرمی کے گل اپنا رنگ الاپنے میں لگے ہوئے ہیں، انہیں کسی طرح

سے کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ ہستی کا عمل ہمیشہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ملتا ہے اس کے باوجود ذہن و دل الفاظوں کی موجوں میں ہر وقت ڈوبے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر سچ اور جھوٹ کی کیفیات ایک دوسرے کے محتاج بھی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان اس بات کا تضاد اس لئے قائم ہے کہ ایک فریق سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی سعی میں لگا ہوا ہے اور دوسرا صرف ایک ہی امر کو ماننے پر قانع ہے اس وجہ سے جو دل میں چھپا راز اس کو ڈھونڈنا بہت دشوار امر ہے۔ اس وجوہ کی بنیاد پر دل میں کچھ کہنے یا لکھنے کا جذبہ امنڈتا ہے اسی جذبے کے تحت دیوارِ ہستی میں چھپا راز سکوت جس کا تعلق صرف پاک روح کے سوا کسی سے قطعی نہیں ہے اس کی روشنی میں انسان کو جان لینا چاہئے کہ دنیائے حقیقی میں اگنے والے درخت سب کے سب کسی شاعر کے اشعار سے کم نہیں اور یہ زمیں یعنی نوک قلم جس سے صفحہ آسمانی پر اپنی شاعری لکھتی ہے ایسی شاعری کو کوئی کاٹ نہیں سکتا مگر عقل کا غریب اس صفحہ آسمانی پر اپنے احمقانہ خیالات کا اظہار ضرور کرتا ہے جبکہ حقیقت آفرینی کی گوش میں دقت طلب امور ضرور وارد ہوتے ہیں اس کے پیچھے نہیں پڑنا ہی دانش مندی کا ثبوت ہے۔

شاعری کی فکر اور بچھو کا ڈنک یہ دونوں ہی اپنی عظمت کا گمان لئے ایک ہی سرزمین پر بود و باش اختیار کرتے ہیں۔ اگر شاعر اپنے ذہن و دل میں تین خوبیاں رکھتا ہے تو یقینی طور پر یہ حقیقی شاعر ہے۔ وہ تین خوبیاں یہ ہیں۔ پہلی سحر آفرینی، دوسری فنکارانہ صلاحیت، زبان و بیان پر خود اعتمادی کے ساتھ حق گوئی کی خوبی اور تیسری خوبی معرفت کی گہری معلومات، جس شاعر نے ان خوبیوں پر ملکہ پالیا اس شاعر نے کامیابی کی منزل پالی۔

اشرف یعقوبی نے تنقید حیات کے ان اوصاف پر گہری نظر ڈالی جس سے احساس کی تازگی کو بہ نفس نفیس جلا ملتی ہے۔ یہ کہنا قطعی تنگ نظری کی دلیل ہے کہ اشرف یعقوبی نے عصری کیفیات اور زندگی کی تند و تلخ دستور العمل کے وقائع پر اپنی شعری فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا جہاں تک فن کے تقاضوں کا سوال اٹھتا ہے شاعر کا قلب اپنے شعور و افکار سے خود ہی پوچھتا ہے کہ تنقید حیات کے اوصاف کو کس طرح زبان شاعری سے ادا کرے جس سے غنائیت کے ساتھ گہرائی و گیرائی کے ہمراہ آگہی کی فضا راس آئے۔ ان کوائف کے اظہار کو ہی اساسِ تازگی کا نام دیتے ہیں بایں ہمہ ان کی بیشتر غزلوں میں انتقاد کے لب و لہجے اپنی جدت پسندی کے اسلوب سے اظہار خیال اور جذبات کے منفرد پیرائے سے منفرجہ زاویے کے دائرے میں رہ کر اشعار کی بساط لئے اپنی ذات کو اس کے اندر سنجیدگی کے ساتھ داخل کرنے کی ہمہ وقت سعی کی ہے اور شعری معیار کو بڑے لطیف پہلو سے سہل الفاظوں کے ذریعہ عوام و خواص تک پہنچانے کی جسارت کی جس سے نئی نسل کی پود ان کے منفرد خیالات اور اظہار کے میلان کی نشاندہی کرانے میں بڑی سادگی کے ساتھ

شعری وفنی اعتبار سے وقعت اور وزن کے تقاضوں کا آئینہ پیش کیا۔اس کی زندہ نظیر ان کے اشعار اس امر کے ترجمان ثابت ہوتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں ؎

گرداب پل رہا ہے سفینے کی گود میں — الزام رکھ رہی ہے ہوا بادبان پر
مصیبت آئی تو سیلاب نے چھت پر اسے دیکھا — کئی آوارہ موجوں نے بدن چھوکر اسے دیکھا
جہاں کی پرورش سے وہ کنول کے پھول جیسا ہے — اسی کیچڑ سے اب جاتے ہوئے بچ کر اسے دیکھا
میں ضد کرتے ہوئے بچوں کو آخر کیسے سمجھاؤں — مرے کمرے کا جگنو سے اندھیرا کم نہیں ہوتا
کسی کی دُکھتی رگ پر ہاتھ بڑھ کر رکھ دیا ہوگا — سمندر ایسی ویسی بات پر برہم نہیں ہوتا
ہے ایک ٹکڑا جو پتھر کا دستِ آزر میں — تڑپ رہا ہے تراشیدہ اک بدن کے لئے
بے ہاتھ پاؤں کی ہم شاعری نہیں کرتے — بدن ضروری ہے اشرفؔ لباسِ فن کے لئے

کہتے ہیں کہ جدیدیت کی اساس کے سیلاب کی ہر تہیں نقد ونظر کی آنکھوں میں چبھنے والے کنکر یہ ثابت کرتے ہیں کہ تخلیق برائے تنقید بھی مستند تخلیقی سنگ بنیاد کا جواز رکھتی ہے لہٰذا اس ضمن میں اشرف یعقوبی کا مجموعہ ''سرخ آبی پرندہ'' میں شامل ایک شعر ؎

میں ضد کرتے ہوئے بچے کو آخر کیسے سمجھاؤں — مرے کمرے کا جگنو سے اندھیرا کم نہیں ہوتا

جگنو ایک اُڑنے والا کیڑا ہے۔اس کے جسم سے رات کے وقت روشنی نکلتی ہے۔یہ سچ ہے کہ جگنو سے ملنے والی روشنی سے اندھیرے کا دور ہونا قطعی ناممکنات میں سے ہے۔اس کے باوجود چھوٹی حیثیت رکھنے والے کیڑے سے روشنی کی امید وابستہ کرلینا سوائے کورچشمی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔اس کے علاوہ فطرت نے اس حقیر کیڑے میں اپنی قدرت کا کرشمہ سمو دیا ہے جس کی وجہ سے اس میں روشنی کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔جگنو کی پیداوار نباتاتی روئیدگی یعنی سبزہ زاری کی مناسبت سے ہوتی ہے لیکن جگنو جیسے کیڑے کی گذر کسی پختہ عمارت یا گھاس پھوس کے جھونپڑے میں نہیں ہوتی تاوقتیکہ مٹی کے جھونپڑے والے کمرے کو اگر سبزہ، پیڑ پودے کی قربت نہ ہو اس کی کوئی صورت نہیں کہ جگنو جیسا کیڑا جس کی آمد ہو سکے تو پھر بچوں کی ضد کا تعلق اس امر میں مہمل عمل کا طشت پیش کرتا ہے اور اسی تنقیدی اسلوب سے پہلوتہی کے مدنظر اشرف یعقوبی نے ایسا شعر بھی اپنے مجموعہ میں شامل کیا ہے۔قارئین ملاحظہ فرمائیں ؎

جب اپنے گھر میں آیا نکتہ چینوں سے نپٹ کر میں — کئی تنقید کے پتھر مری چھت سے نکل آئے

جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ 1957ء بمطابق 1348ھ کی دہائی میں انجمن ترقی پسند اردو تحریک کی لطیف شاخ جدیدیت نے نثری وشعری تخلیقات کے لئے زبان وادب اور افکار وتصورات کو ہندستانی تہذیبی زندگی میں مغربی روح پھونکنے کے لئے انگریزی زبان وادب اور وافکار وتصورات کو

زمان ومکان سے ارتناع کرنے کی حتی الوسع سعی کی علم الیقین ،عین الیقین اور حق الیقین کے تناسبی حقیقت کو اسی زمان ومکان کا اسیر کردیا جس سے زندگی کی خلاقانہ وسعت اور بیکراں آفاقیت کا نقطہ زادیہ اپنے حصول سے محروم ہوگیا۔ایسے منصوبہ بند وقوع کے پس منظر جدیدیت کی تخلیقی جدید اردو زبان وادب کا مقدر بن گئی۔ اس وجہ سے نثری وشعری تخلیقی اثرات انگیزی انگریزی کی اصل ماہئیت سے دور نظر آتی ہے جو اردو زبان وادب کے لئے المیہ ثابت ہوتا ہے۔زبان وادب اور افکار وتصورات بالخصوص ہندستانی تہذیب کی جو قدریں تھیں وہ آہستہ آہستہ اپنے محور سے پھسلتی جارہی ہیں اور معاملے کی ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے جسے دنیائے ادب ان ساری وجوہات کو اچھی طرح دیکھ بھی رہی ہے کہ عصر جدید کی ادبی دنیا نے اپنا رنگ کس طرح سے بدل لیا جس کی وجہ سے مشرقی ادب کے تمام اجزا اپنی کلاسیکی پہلو سے خالی ہوگئے ہیں۔زبان و بیان میں نزاعی کیفیت طاری ہوچکی ہے۔اس امر میں ادب کی صرف حقیر سی زندگی رہ گئی ہے اور اس ادب کی حقیر زندگی میں ہولناکی نے اپنا احاطہ کرلیا ہے۔صد حیف کہ اہل زبان وادب نے حق پرستی کو پس پشت ڈال کر باطل ادب کے افکار وتصورات کو زبان ومکان پر اعلانیہ عمل کرنے کا فیصلہ صادر کیا ہوا ہے۔کوئی بھی دنیائے ادب کا ایسا جیالا نہیں جو اس کے مثبت اقدام اٹھائے۔ سچی اور اچھی زبان وادب کی رہنمائی کا خواہش مند ہو ورنہ دورحاضر کے تمام اہل زبان وادب ایسے ظالم محرکات کو اپنی ادبی تخلیقات میں جگہ دے کر اس جرم کی ارتکابی حصول کو اپناتے ہی رہیں گے۔یہ بھی ہماری زبان وادب کے لئے مسئلے کا سبب ہے۔

اس ضمن میں راقم الحروف کی حتمی رائے ہے کہ علم کی دولت خواہ وہ کسی بھی زبان وادب سے مشترک ہوکر حصولیابی کی منزل طے کرے جس سے انسان اپنی زبان وادب اور اس کے قواعد کے ہمراہ تہذیب وتمدن، ثقافتی امور، فکر وافکار کے رموز، ملکی وسماجی فلاحی کے منصوبوں پر بار نہ ہو ایسے علم کا اپنے اندر جذب کرلینا دانش مندی ہے اس لئے بلاشبہ اشرف یعقوبی ایک زندہ دل خوش فکر شاعر ہیں مگر مطالعہ کی فراوانی کے تحت ایسے بھی شعر مجموعہ سرخ آبی پرندہ میں شامل کئے۔قارئین ملاحظہ فرمائیں ؎

پیڑ تھا تلسی کا آنگن میں مگر پتا نہ تھا — اس قدر ویران ہوجائے گا گھر سوچا نہ تھا
مجھ کو اک شعلہ بدن کا قرب حاصل کیا ہوا — آگ پی لیتا ہوں میں پہلے کبھی چھوتا نہ تھا
چل رہا تھا مجھ سے بچ بچ کر جو اپنی راہ پر — زندگی اچھی تھی اس کی راستہ اچھا نہ تھا
یہ کاروبارِ زمانہ ازل سے چلتا ہے — جو ہے بہار کا موسم خزاں سے لپٹے گا
لپٹے جائیں گے جب دو جہان کے قصے — تو فرشِ خاک اسی آسماں سے لپٹے گا
پھر اُس کے جسم سے پھوٹیں گے سچ کے فوارے — جب اُس کا جھوٹ بھی اس کی زباں سے لپٹے گا

اشرف یعقوبی نے ہمیشہ شعری زبان کی وساطت سے لوگوں کو اپنے احساس آہنگ سے بہرہ ور

کرانے کی جستجو کی ہے اور اس اہمیت کے حامل نکتے کو ظاہر کیا کہ زندگی ایک سین چیلنج ہے۔ اس کا میدانِ عمل میں آ کر سامنا ہی کرنا کامیاب زندگی گزارنے کے لئے احساس حوصلہ کے گلزاروں کی سیر کرنا ثابت ہوتا ہے۔ ہر شخص یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہمارے دماغوں اور عقلوں میں اتنا فرق ہے جتنا کہ ہمارے چہروں سے ظاہر ہوتا ہے، اس لئے تمام انسانوں کو لازم ہے کہ مشکلات کا مقابلہ کرنے کا نام ہی اصل زندگی ہے اور ان مشکلات پر اگر انسان غالب ہو جائے تو اس کی کامیابی قدم چومے گی۔ اس قسم کی قدروں کو اجاگر کرنے کے لئے اشرف یعقوبی نے ایسے بھی اشعار کہے۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں۔

قافلے کے لوگوں کو کون اتنا سمجھائے
منزلیں نہیں ملتیں تھک کے بیٹھ جانے سے

کون حال پوچھے گا کس کو اتنی فرصت ہے
اڑ گئے پرندے سب پیڑ سوکھ جانے سے

ایک ایسا موسم بھی آنے والا ہے جس میں
زہر پھیل جائے گا گل کے مسکرانے سے

صبح پا کے خوش تھے ہم جانتے نہ تھے اشرف
صبح کا تعلق ہے رات کے گھرانے سے

گنوا دی جان جس میں ڈوب کر نادان لوگوں نے
اسی اندھے کنویں میں جھانکنے کی بات کرتے ہیں

جو پتے سوکھ جاتے ہیں درختوں سے جدا ہو کر
وہی پتے ہوا میں ناچنے کی بات کرتے ہیں

تمہارے شہر کا دستور یہ ہم نے عجب دیکھا
جو پستہ قد ہیں وہ قد ناپنے کی بات کرتے ہیں

ہر دن کی طرح آج بھی کھلنے لگی ہے شام
پھر بوند بوند زہر اگلنے لگی ہے شام

وہ چھت کہ جس پہ خوف سے اتری کبھی نہ رات
اس چھت پہ دوپہر سے ٹپکنے لگی ہے شام

ویرانیوں کی سمت وہ اب جھانکتی نہیں
آبادیوں میں پھولنے پھلنے لگی ہے شام

تھا زور بازوؤں میں تو وہ دسترس میں تھی
مٹھی سے آج میری پھسلنے لگی ہے شام

اشرف یعقوبی نے اپنے اشعار کے ذریعہ ان نکتوں پر بھی خاص و عام انسانوں کو توجہ دینے کی دعوت دی ہے کہ زندگی اس پھول کی مانند ہے جو اپنی خوبصورتی کو ایک مدت تک برقرار رکھ سکتی ہے مگر مشروط پہلوؤں پر اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ زندگی کا کبھی شکوہ نہ کریں کیونکہ زندگی نے اپنی کوکھ سے آزمائش جیسی شئے کو جنم دیا ہے۔ گرچہ زندگی ایک کھیل ضرور ہے مگر اس زندگی کے کھیل میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہوتی ہے کیونکہ زندگی ایک گہرا سمندر بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور اس زندگی کے سمندر میں مختلف انواع و اقسام کی مخلوقات کا بسیرا ہے۔ اسی بنیاد پر زندگی نے شرط رکھی ہے۔ اس کی شرط میں پہلے محنت و لگن کے ساتھ ہمت کا دخل ہونا ضروری ہے۔ ان دونوں کے توسل سے زندگی خود ایک زندگی بننے کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ اگر زندگی میں محنت نام کی شئے نہیں حاصل کر سکتی ہے تو یہی زندگی عذاب کی دہلیز پر نظر آتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے اگر پانی میں کوئی لہر کی رمق نہیں تو عقل مندوں کو یہ جان لینا چاہئے کہ اس پانی کی تہہ میں

مگرمچھ ضرور ہے اسی لئے زندگی کی حقیقی کامیابی میں لگاتار محنت و مشقت کی کارفرمائیوں کی شمولیت لازمی ہوتی ہے۔ اہلِ دانش کو اس اہمیت کے حامل نکتے سے دوچار کرنے کی اشرف یعقوبی کی سعی رہی کہ انسان کی زندگی اس شمع کی مانند ہے جو ہوا کے جھونکوں میں بھی روشن ہے بالکل اسی طرح جیسے کانٹوں بھری شجر کی ٹہنی پر ایک پھول اس شجر کی ٹہنی کو کس حد تک پُرکشش و جاذب بنائے رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا کوائف کی روشنی میں راقم الحروف یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ اشرف یعقوبی نہ صرف مشاعرے کے شاعر ہیں بلکہ اپنے اندر قوم و ملت کا جذبہ اور اُن کے مسائل کے حل کی صورت نکالنے والے امکانات کی تلاش میں سرگرداں ہو کر شاعری کی اس سطح سے عوام الناس کو صدا دیتے ہیں جو زندگی کے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں لہٰذا عصری معنویت کے حوالے سے اشرف یعقوبی ہی شغف میں انفرادیت کے حامل ہیں اور مستقبل میں توقعات کی جاتی ہے کہ اپنی شعری تخلیقات نہ صرف تنقیدِ حیات کے زمرے تک محدود رکھیں بلکہ اخلاص و جذبات، زبان و بیان میں مزید دلکشی کے اوصاف میں رنگ بھریں گے۔

Anwar Barabankwi
Dhar Bagan
National Library
Raja Bazar
Kolkata-9
(W.B.)

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن

فرقہ وارانہ فسادات کا ترجمان ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے''

صنف ناول کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک ہر عہد میں اردو ناول نے اپنی اہمیت کا لوہا منوایا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی ہے کہ اس صنف نے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کی پیشکش پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ہر عہد میں انسانی ومعاشرتی مسائل کو ناول نگاروں نے ناول کا حصہ بنایا اس پر اضافہ یہ کہ جیتے جاگتے کرداروں کو خلق کرنے پر بھی خصوصی توجہ رہی۔ جہاں تک عہد حاضر کی بات ہے تو اس عہد میں بھی ناول نگاروں کی بڑی تعداد موجود ہے اور سبھوں نے اس ضمن میں خود کو فعال رکھتے ہوئے بہترین ناول تحریر کیا ہے۔ اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' سے قبل میں اس صنف سے متعلق یہ اقتباس شامل باب کرنا چاہوں گا ملاحظہ کیجئے :

> ''ناول قصے کہانی سے قدرے مختلف ہے کہانی انسان کے ساتھ وجود میں آئی۔ ناول کا صحیح معنی میں آغاز اس وقت ہوا جب سماج نے ایک خاص منزل تک ترقی کر لی۔ انگریزی لفظ ناول کے معنی نئے کے ہیں اور انگریزی میں قصہ نگاری کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس کا انداز پرانی داستان یا قصہ نگاروں کے مقابلے میں بنا تھا۔ ناول اس نثر صنف کو کہا جاتا ہے جس میں ایسا قصہ بیان کیا گیا ہو جو زندگی کی ترجمانی تسلسل کے ساتھ کرتا ہو۔ ناول کا فن دراصل معاشرتی یا انفرادی زندگی کی ترجمانی اور تصویر کشی کا فن ہے۔ ناول نگار اپنے فکر وخیال سے ایک نئی حقیقت کو خلق کرتا ہے جو دراصل زندگی کی حقیقت سے ماخوذ ہوتی ہے۔''

(اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر، ص-۱۵)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ انسانی زندگی جس شکست وریخت سے دوچار ہوتی ہے اس کا صحیح ترجمان اردو ناول ہے۔ اس لئے ہر دور میں اس صنف کی مقبولیت قائم رہی ہے۔ اردو ناول

ہر عہد میں زندگی کے ہر شیڈس کی ترجمانی کرتا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ترقی پسند تحریک اور تقسیم ہند کے زیر اثر ناول نگاروں نے اردو ناول نگاری کو موضوع اور اظہار دونوں سطحوں پر نئی جہتوں سے آشنا کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول میں متنوع موضوعات کی پیشکش ہوتی رہی ہے جن میں فرقہ وارانہ فسادات بھی ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اس ضمن میں جوگندر پال، علی امام نقوی، صلاح الدین پرویز، عشرت ظفر، حسین الحق، عبدالصمد، غضنفر، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، الیاس احمد گدی، گیان سنگھ شاطر، اقبال مجید، ترنم ریاض، محمد علیم، انیس ناگی، شاہد اختر، آچاریہ شوکت خلیل اور کوثر مظہری کے نام زیادہ اہم ہیں جنھوں نے اردو ناول میں فرقہ وارانہ فسادات کو خاص مرکزیت عطا کی ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات نے کس طرح ہجرت اور ناسٹالجیا کو ضم دیا اس جانب کوثر مظہری نے اپنے ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' میں اپنے تجربات ونظریات کی پیشکش کی ہے۔

یہ پورا ناول آج کی انسانی زندگی کس طرح نامساعد حالات کا شکار ہے اس جانب ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ فرقہ وارانہ فسادات نے کوثر مظہری کو خاص طور سے متاثر کیا ہے آج کے عہد کا تحریر کردہ یہ ناول اپنے موضوع اور اسلوب ہر اعتبار سے دیگر ناولوں پر سبقت لے جاتا ہے۔

اردو ناول نگاروں نے متنوع موضوعات کی پیشکش پر خصوصی توجہ دی ہے۔ انہی موضوعات میں سے فرقہ وارانہ فسادات بھی ایک ہے۔ یہ موضوع بھی کسی ایک خطے سے جڑا ہوا نہیں بلکہ عالمی سطح پر دیکھا جائے تو اس کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہر ملک اور ہر گوشے میں قتل وغارت گری کا سلسلہ قائم ہے۔ ذات کے نام پر خونی کھیل کھیلنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مختصر یہ کہ کوثر مظہری نے بھی مشرف عالم ذوقی، سلام بن رزاق، غضنفر اور دیگر فنکاروں کی طرح فرقہ وارانہ فسادات کو موضوع خاص عطا کیا ہے۔ ناول آنکھ جو سوچتی ہے اس سلسلے سے کوثر مظہری کے مشاہداتی قوت کا بہترین اشاریہ تسلیم کیا جائے گا۔

کوثر مظہری چوں کہ آج کے فنکاروں میں شامل ہیں، لیکن ان کی تحریریں بیش بہا اس لئے بھی ہیں کہ وہ گہرے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر تخلیقی سرمایہ پیش کرتے ہیں۔ زود نویسی کے وہ قائل نہیں۔ آپ کا فنی اختصاص یہ بھی ہے کہ آپ جس طرح کا موضوع پیش کرتے ہیں اسی طرح کی فضا آفرینی بھی پیش کرتے ہیں وجہ یہ ہے کہ یہ ناول پڑھ کر قارئین کو اس سانحہ کا بھرپور مشاہدہ ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے منفی اثرات کیا ہیں اور انسانی زندگی پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں اس سلسلے سے اس ناول کے تمام کردار وبہترین رول ادا کرتے ہیں۔ یہ تمام کردار، ناول کی مقصدیت پر حرف نہیں آنے دیتے ہیں لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ کوثر مظہری کو جس طرح موضوع کی پیشکش کا ہنر معلوم ہے

ٹھیک اسی طرح فن کردار نگاری سے بھی بھرپور واقفیت ہے۔ آپ کے سبھی کردار خواہ مرکزی ہوں یا ذیلی ناول کے مقصد کو عیاں کرنے میں معاون و مددگار نظر آتے ہیں۔ یہ تمام کردار جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں اس پر اضافہ یہ کہ ان سے عجیب سی کا اُنسیت سی بھی ہو جاتی ہے۔

رضوان اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ ایک ایسا نوجوان ہے جو تعلیم یافتہ تو ضرور ہے، لیکن ملازمت کی خواہش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو رضوان ایک ایسے صالح معاشرہ کا خواہاں بھی نظر آتا ہے جس میں ذات پات اعلیٰ ادنیٰ کی تفریق قطعی نہ ہو۔ بلکہ آپسی بھائی چارگی کی بنیاد پر ہر فرد زندگی جینے کو ترجیح دیتا ہو۔ کوثر مظہری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے رضوان کی زبانی سماج میں پھیلے تعصب پسندی کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ساتھ ہی تعصب پسندی نے کس طرح سماج میں ناہمواریاں پیدا کی ہیں اس جانب بھی ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ یہ ناول ایک طور سے عبرت بھی دیتا ہے اور ہمیں سماجی ناہمواریوں کے اسباب کیا ہیں اس سے متنبہ بھی کرتا ہے۔ اس سلسلے سے ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے'' اس کا اقتباس دیکھئے :

> ''جب تک اس ملک میں سید سلام الدین، پی۔ ایل۔ مٹکانی، گھوش منگل، پریما بھارتی، صیف اللہ، اعظمی امام، سعید اللہ ہزاری لوگ رہیں گے ہمیشہ یہاں اتھل پتھل ہوتی رہے گی۔ حالاں کہ یہ سب کے سب مذہب کی آڑ میں سیاسی سطح پر کرسیاں ہتھیانے کی دھن میں رہتے ہیں۔ مذہب اسلام یا ہندو مذہب سے انہیں دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگوں کو گندم نما فروش کہتے ہیں یا پھر شیر کی کھال میں بھیڑیا۔''

(آنکھ جو سوچتی ہے، کوثر مظہری، ص-۵۵)

آج جس طرح معاشرے میں تشدد کا شکار لوگ ہو رہے ہیں اس حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے کوثر مظہری نے درگا جی جیسا کردار کو بھی خلق کیا ہے اور بتانے کی کوشش کی ہے کہ درگا اپنے اہل عیال کی پرورش گانا بجا کر کرتا ہے، لیکن جب فساد ہوتا ہے تب وہ مسلم اکثریت جیسی جگہ میں پناہ لینے کو ترجیح دیتا ہے، لیکن اس کا المیہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت ہی اس کی گونگی بیٹی کی عصمت لوٹ لیتے ہیں۔ اس طرح مصنف نے سیتامڑھی میں ہونے والے فساد کی حقیقی تصویر پیش کر کے اپنے تجربے اور مشاہدے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ کوثر مظہری کا یہ ماننا ہے کہ جس طرح آج قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے اس کے لئے کوئی ایک قوم یا فرقہ ذمہ دار نہیں بلکہ دونوں قوم ہندو اور مسلمان اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ آپ نے اپنے نظریے کی پیشکش رضوان کی زبانی اس طرح کی ہے ملاحظہ کیجئے :

> ''اس دنیا میں جو جنگ اور تصادم ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ جیسے فساد تو ہندوستان کا مقدر بن گیا ہے انسان کا خون دیکھ کر طبیعت اُکتا چکی ہے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔''

(آنکھ جو سوچتی ہے، کوثر مظہری، ص-۶۸)

ایسا بھی نہیں کہ کوثر مظہری نے صرف مسائل کی پیشکش تک اپنا قلم محدود رکھا ہے بلکہ انہوں نے بہت ہی چابک دستی سے اس جانب بھی ہماری توجہ مبذول کرائی ہے کہ یہ تشدد کا ماحول اور قتل و غارت گری کا سلسلہ بھی ختم ہو سکتا ہے اس کے لئے دونوں قوموں کو آپسی بھائی چارگی کی اہمیت و افادیت کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے ناول میں آپ نے سیکولرزم اور انسانی بھائی چارگی کے سلسلے سے کئی اہم نکتے پیش کئے ہیں۔ مطلب یہ کہ کوثر مظہری آج کی اس تعصب پسندی اور نااتفاقی سے الگ ہٹ کر محبت کا پرچم بلند کرنے کے خواہاں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے ناول لکھ کر اپنے نظریات اور خیالات سے قاری کو بہرہ ور کیا ہے۔

سیکولرزم آج کے لئے ایک سوالیہ نشان بن چکا ہے۔ لہٰذا ہر ماہر فن اور تخلیق کار اس سلسلے سے کافی غور و فکر کرنے پر مجبور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوثر مظہری کے قلم سے اس طرز کا ناول قلم بند ہوا ہے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ آپ نے اس ناول کے توسط سے جس حد تک مسرت عطا کی ہے اسی طرح بصیرت بھی عطا کی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے بہترین ردعمل کی دعوت بھی دی ہے۔ کوثر مظہری چوں کہ اس ناول میں صرف موضوع کی پیشکش تک اپنے قلم کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی آپ داد کے مستحق ہیں کہ آپ نے زمانے کے نامساعد تعمیر کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے اس کے لئے ہر ایک فرد کو دو دو ہاتھ ہونے کی دعوت بھی دی ہے۔ اس سلسلے سے یہ ناول اپنے موضوع اور فن کی پیشکش کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے۔ زبان و بیان ہو یا کرداروں کی پیشکش ہر لحاظ سے یہ ناول اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ کوثر مظہری کا تجربہ پورے ناول میں جلوہ نما ہے اس پر اضافہ یہ کہ آپ کا فنی اختصاص بھی پڑھنے والوں کو کافی مرعوب کرتا ہے۔

Dr. Md. Fazlur Rahman
Asstt. Professor
Deptt. of Urdu
J. L. N. M. College
Sursand (Sitamarhi)
Bihar

ڈاکٹر سید محمد حبان الحق

داستان مہر افروز ودلبر اور دہلوی معاشرت

داستان کا فن انسانی معاشرت میں سب سے قدیم ہے۔ ہر زبان میں داستان کے قدیم نمونے باز یافت کئے گئے ہیں۔ سنسکرت، عربی اور فارسی سے اس صنف کی منتقلیت اردو زبان میں ہوئی ہے۔ اردو میں سب سے پہلی داستان ''سب رس'' ہے۔ اس کے مصنف ملا وجہی ہیں۔ انہوں نے اسے ۱۶۳۵ء میں تخلیق کیا۔ جو دکنی زبان کی شاہکار داستان ہے۔ اس کے بعد دکنی ادب میں تقریباً سو سال کے بعد داستان طوطی نامہ یا طوطا کہانی کی تخلیق ہوئی۔ شمالی ہند کی پہلی طبع زاد داستان قصہ مہر افروز دلبر ہے جو عیسیٰ خاں یا عیسوی خاں بہادر کی تصنیف مانی جاتی ہے۔ لیکن تخلیق میں اس کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں ہو سکا ہے۔ اس سلسلے میں آج بھی تحقیق کا دروازہ کھلا نظر آتا ہے۔ اس داستان کو سب سے پہلے مسعود حسین خان نے ترتیب دیکر شائع کرایا۔ تب جا کر دنیا کو اس بات کا علم ہوا کہ یہ داستان اٹھارہویں صدی میں لکھی گئی۔ اس کا سال تخلیق ۱۷۰۷ء قرار پایا ہے۔ اس داستان کے مرتب نے پیش نامہ میں داستان کے مصنف کے تعلق سے جو وضاحت کی ہے ملاحظہ فرمائیں :

> ''قصہ مہر افروز دلبر کے مصنف کے بارے میں اور کسی قسم کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس کا تعین بھی مشکل ہے کہ اس خاندان کے کس عیسیٰ (عیسوی خان؟) نے اس قصہ کو تصنیف کیا ہے۔ سرورق پر مصنف کا نام عیسوی خان بہادر، بظاہر کاتب قصہ کا لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ مزید یہ کہ بے ترتیب طور پر ایک طرف حاشیہ پر لکھا ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعد کو کسی دوسرے شخص نے تحریر کیا ہے۔ سرورق دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ غالباً کسی یوروپین کے قبضے رہا ہے۔ جس نے ایک جگہ مالک اس کتاب کا نائب صاحب اور کچھ غیر متعلقہ خامہ فرمائی کی ہے۔
>
> عہد شاہ جہانی سے لیکر شاہ عالم ثانی کے عہد تک عیسیٰ خان، موسیٰ خان، موسوی خان ایک سے زائد امراء ، رؤساء کے نام ملتے ہیں لیکن اس میں سے کسی کا نام عیسوی خان نہیں ملتا اور ان میں سے کوئی اردو کا صاحب تصنیف نہیں بتایا گیا

ISSN : 2582 - 3612

> ہے۔ غرض اس نادر داستان کے نہ تو منصف یا کتابت کی تصدیق موجود ہے۔''
>
> (قصہ مہر افروز ودلبر : مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ص۔۴)

بہر کیف اس قصے کو عیسوی خان بہادر کے نام ہی سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی ایک کاپی جو آغا حیدر حسن صاحب (حیدر آباد) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے اس پر عیسوی خان بہادر کا نام بحیثیت مصنف درج کیا ہوا ہے۔ مسعود حسین خان کے اس دعوے اور اشاعتِ قصہ مہر افروز ودلبر، کے بعد ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنے تحقیقی مقالے ''اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر'' میں جو انکشاف کیا ہے ملاحظہ فرمائیں :

> ''اہل اردو کے لئے عیسوی خان بھلے ہی چیستانی شخصیت ہوں لیکن ہندی میں وہ ایک جانے مانے ادیب ہیں۔ اس میں، ذرا شک نہیں کہ ہندی کا ادیب نواب عیسوی خان ہی قصہ مہر افروز و دلبر کا مصنف ہے۔ یہ ''بہاری ست سی'' کے دوہوں کی ایک ٹیکا (شرح) رس چندر کا مصنف ہے۔''
>
> (اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر : ڈاکٹر پرکاش مونس، ص۔۳۳۲)

واضح رہے کہ ڈاکٹر پرکاش مونس نے جو دعویٰ کیا ہے اس کی تصدیق کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا ہے اور جس حوالے کی بات کہی ہے وہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس لئے یہ موضوع آج بھی تحقیق کا طالب ہے لیکن ''قصہ مہر افروز ودلبر'' کے متن کے مطالعے سے ایک بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ اس داستان کا مصنف دبستان دہلی سے تعلق رکھتا ہے اور اس داستان کو شمالی ہند کی داستان قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر پرکاش مونس نے اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ اس داستان میں برج بھاشا کے نقوش ملتے ہیں اس لئے یہ داستان لکھنؤ کے خطۂ ارض سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن مسعود حسین خان نے اس دعویٰ کی تردید پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس داستان کی بولی ، الفاظ ، تہذیب و معاشرت ، محلات اور باغات سب دہلوی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار ہیں۔ اس لئے صرف چند الفاظ برج بھاشا کے موجود ہونے سے اسے کسی دوسرے خطۂ ارض کی تصنیف قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس داستان کے زبان و بیان میں دہلوی معاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ داستان میں جو منظر طرازی کی گئی ہے جن محلوں کے نقش و نگار ابھارے گئے ہیں، جس بول چال اور زبان کا استعمال مصنف نے کیا ہے۔ اس سے دہلوی معاشرت کے واضح اور واقعاتی رنگ خود بہ خود بروئے کار آجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسعود حسین خان کا بیان ملاحظہ فرمائیں :

> ''قصہ مہر افروز کی پوری فضا لال قلعہ دہلی کی جھلکیوں سے بھری پڑی ہے۔ گل و گلزار، فوّارے، آبشار، پانی کی چادریں، نہریں، حوض، دالان در دالان، نشمنے، پچی کاری غرض ہر ہر رخ سے قلعہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ لال قلعہ وہ مادی بنیاد

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہے جس پر عیسوی خان بہادر کا تخیل طلسم آرائی کرتا نظر آتا ہے۔تفصیلات و
جزیات کا مطالعہ اس بات کا ثبوت ہر ہر صفحے پر فراہم کرتا ہے کہ یہ مصنف کے
لئے دیدہ تھیں نہ کہ شنیدہ اور مصنف قلعہ و دربار سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔''
(قصہ مہر افروز و دلبر : مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ص۔۷)

اس داستان کے مصنف نے پوری داستان میں دہلوی معاشرت کا نقشہ سامنے رکھ دیا ہے۔باغات میں جس باغ کا ذکر ہوا ہے اس کے نقوش صفحہ قرطاس پر مختلف تخلیقات میں آج بھی تلاشے جا سکتے ہیں۔اس داستان میں جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی دہائیوں کا احاطہ کرتے ہیں جو بنیادی طور پر مغلیہ سلطنت کے زوال آمادہ تہذیب وثقافت کا نگار خانہ معلوم ہوتا ہے۔اس میں مصنف نے رزم اور بزم دونوں کا نقشہ کھینچا ہے۔اس کی زبان بھی اس دور کی ٹھیٹھ زبان ہے جس میں بہت سی خامیاں تھیں۔چونکہ اردو نثر ابھی تک اپنی کوئی حتمی صورت اختیار نہیں کر پائی تھی اس کے باوجود مصنف نے تخیل سے نہایت عمدہ کام لیا ہے۔اس اعتبار سے مصنف نے ایک اسلوبِ نو کی بناڈالنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور اپنی ندرت فکر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس داستان میں مصنف نے فنی تقاضوں کو بیشتر جگہوں پر نظر انداز کر دیا ہے جیسے پلاٹ سازی اور کردار نگاری وغیرہ۔اس کے برعکس کچھ جگہوں پر مصنف نے اپنے ہنر کا کمال بھی دکھایا ہے جیسے سراپا نگاری اور منظر تراشی وغیرہ۔پوری داستان میں قدامت سے باہر نکلنے کی چھٹپٹاہٹ نظر آتی ہے۔

قصہ مہر افروز و دلبر میں مصنف نے شادی کا جو منظر پیش کیا ہے جیسے براتی کی شان وشوکت، اس کا استقبال وغیرہ مناظر کے بیان میں نہایت تفصیل اور ایک ایک جزیات کا گہرائی سے شمار کیا ہے۔جس سے موصوف کی منظر نگاری میں مہارت کا علم ہوتا ہے۔اسی طرح جب باغ کا ذکر کرتے ہیں تو یہاں بھی ایسا نایاب باغ کا نقشہ کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصور کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ یہ باغ ایسا ہے جس میں پھولوں کے ساتھ ساتھ میوے اور پھلوں کی بھی بھرمار ہے۔اس باغ کا ایسا نقشہ ہے جو کسی بہشت کی کیاریوں سے مماثلت رکھتا معلوم ہوتا ہے۔داستان کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''اقسام اقسام کے پھل ایسے تھے کہ انہوں نے نہ دیکھے تھے۔میوہ انہوں
نے توڑتے ھیں ، کچھ ایک کھاتے ھیں ، دیکھتے ھیں ،بعضی بعضی عمارتیں
انہوں میں ایسی ہی ھیں کہ درختوں کے بیچ میں چھپ رہی ھیں ، بعضی
ڈالیاں درختوں کی ایسی طری نَو آئیں ھیں ، سو بنگلے کی شکل بنی ھیں ، اور
بیلیں جو پھولوں کی انھوں کے اوپر چڑھائیں ھیں سو پھولوں نے انھوں
کے تائیں چھائے لیا ہے۔آ گو چل کے ایک عمارت کے اندر جو بسے بیٹھے

ھیں ، دیکھتے ھیں کہ ایک بڑا حوض ہے اور فوّارے اس میں اچھلتے ہیں۔''
(قصہ مہر افروز و دلبر، ص۔۲۱۔۲۰)

اس طرح عیسوی خان بہادر نے باغ کا نقشہ کھینچنے میں صفحے کے صفحے خرچ کر دئے ہیں۔اس طرح یہ داستان اپنے جملہ اوصاف اور داستان کی روایت کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔اس میں تمام داستان کے فنی لوازمات موجود ہیں۔ یہ داستان اس دور کے مروجہ داستانوں سے یکسانیت بھی رکھتی ہے۔ بلکہ اس داستان کا قصہ مثنوی سحر البیان سے بھی ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے۔زبان کے اعتبار سے یہ قصہ اردو اور ہندی کا مجموعہ بھی کہا جاسکتا ہے۔اس داستان کی انفرادیت یہ ہے کہ اس داستان میں دیگر داستانوں کی طرح جگہ جگہ پر عربی، فارسی یا برج بھاشا کے اشعار کا استعمال بالکل نہیں ہوا ہے۔پوری داستان میں کہیں بھی کسی بھی زبان کا ایک بھی شعر درج نہیں کیا گیا ہے بلکہ امیر خسرو کے ایک شعر کا ترجمہ اردو میں اس وقت ضرور ملتا ہے جب لال قلعہ کے متعلق مصنف اس عمارت کے خدو خال واضح کرتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ قصہ مہر افروز و دلبر داستان کی روایت میں اپنی اولیت، ندرت فکر اور لسانی اسلوب کے اعتبار سے قابلِ قدر بھی ہے اور لائق تحسین بھی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ داستان مہر افروز دلبر دہلوی معاشرت کی آئینہ دار ہے۔اس قصے میں لسانی تجربوں کی بنیاد پر بھی دہلوی دبستان کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بہت کم الفاظ وتراکیب لکھنوی زبان و معاشرت کی آئینہ داری کرتے نظر آتے ہیں۔اس کا بیشتر حصہ دہلوی لسانی خصوصیات کا حامل ہے۔واقعہ اور قصہ نگاری اور منظر طرازی کے اعتبار سے تو یہ مکمل طور پر دہلوی تہذیب و معاشرت کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔اس داستان میں لال قلعہ کے نقش ونگار اس بات کی دلیل ہیں جس سے کوئی بھی ناقد یا قاری انکار نہیں کر سکتا کہ یہ داستان ابتداء تا انتہا دہلوی رنگ ونوعیت کی حامل ہے اور یہ داستان شمالی ہند کی پہلی داستان ہے۔جس میں زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کے نقش ونگار کو ابھارا گیا ہے۔اس داستان میں باغات، محلات، شادی بیاہ کے رسم ورواج سب خصوصی طور پر شمالی ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔محض چند مماثلتوں کی بنیاد پر اسے دوسرے دبستان سے یا دوسری تہذیب وثقافت سے جوڑا تو جاسکتا ہے لیکن اس کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔اس لئے یہ داستان دہلوی تہذیب و معاشرت کا نمائندہ قرار پاتا ہے۔

Dr. S.M. H. Haque
At.P.O.- Chainpur Bangra
Via.- Silout
Distt.- Muzaffarpur - 843119
Mob.- 98521 07610

ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ

کلیم عاجز کی شاعری: ایک جائزہ

بہار کے نامور شعرا میں کلیم عاجز کا نام بھی شامل ہے، جن کی شاعری نے اردو شاعری کو ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ اپنی غزلوں میں وہ ایسی بات پیش کرنے کے قائل ہیں جو پڑھنے والے کے دل کو چھو لے۔ مختصر یہ کہ کلیم عاجز ان مایہ ناز شاعروں میں ہیں جن کے دل پر چوٹ لگی اور انہوں نے اس چوٹ کو اپنے شاعرانہ کلام کے آئینہ میں خوبی اور کامیابی کے ساتھ ظاہر کیا اور اس کے سوز کو اپنے سامعین کلام اور قارئین دیوان کے دلوں میں اتار دیا۔ ان کے کلام میں جو صداقت و سوز ہے اس کو ہر حساس دل محسوس کرتا ہے۔ اس سلسلے سے آپ کا شعری مجموعہ ''وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' کافی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ کو شعری خدمات کے سلسلے سے کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں میرا کادمی، لکھنؤ نے ''میر ایوارڈ'' سے نواز۔ ۱۹۸۹ء میں حکومت ہند نے ان کی ادبی خدمات کے سلسلے سے پدم شری کے خطاب سے نوازا۔

یہ حقیقت ہے کہ شاعری اسی وقت قارئین ادب کو متاثر کرتی ہے جب موضوع بھی انوکھا ہو اور پیشکش بھی انوکھا ہو۔ مختصر یہ کہ بہترین شاعری کے لئے فنی تربیت، طرز ادا، ذہنی و فکری ساخت، مشاہداتی قوت ساری چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔ جس طرح میر تقی میر کا درد و غم اور ان کے عہد کا آشوب ان کی شاعری میں موجود نظر آتا ہے اسی طرح کلیم عاجز کی شاعری بھی اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ صرف عہد ہی نہیں دل کی پوری کیفیت یہاں موجود ہے۔ اس سلسلے سے کلیم عاجز خود فرماتے ہیں ؎

میری شاعری میں نہ رقص جام نہ مئے کی رنگ فشانیاں   وہی دکھ بھروں کی شکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں
یہ جو آہ و نالہ ہیں کسی بے وفائی کی نشانیاں   یہی میرے دن کی رفیق ہیں یہیں میری رات کی رانیاں

مختصر یہ کہ کلیم عاجز کی شاعری اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ وہ آشفتہ بیانی کے قائل ہیں اور مضمون آرائی کی ان کے آگے کوئی اہمیت نہیں۔ بیشتر اشعار ایسے ہیں جن سے ایسے شخص کی شبیہہ ابھرتی ہے جو زمانے کے صدمات کو سہتا ہے اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس سلسلے سے یہ اشعار دیکھئے ؎

لہو دلوں کا چراغوں میں کل جلتا تھا   اور آج بھی ہے وہی کاروبار دیکھو تو
دریا میں طوفان اٹھا ہے دریا والے جھیلیں گے   تم تو دور کھڑے ہو پیارے تم کاہے گھبراؤ ہو
کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے   جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا

آپ کی غزلیں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی بہترین ترجمان بھی ہیں۔ یہاں اعلیٰ اخلاقی اقدار پر خصوصی توجہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سلسلے سے یہ اشعار دیکھئے ؎

چراغ سر رہ گزر تیز رکھیو   مسافر پس کارواں اور بھی ہیں
شکایت کا حاصل یہاں کچھ نہیں   جو غم بھی اٹھا مسکرا کر اٹھا

انہوں نے اپنی غزلوں میں طاقت و جبریت کے خلاف آوازیں بھی بلند کی ہیں۔ یہ آواز ان کے دل سے نکلی ہے اور پڑھنے والوں کے دل تک اتری ہے۔ ان کے یہاں تہہ داری بھی ہے اور فکری بالیدگی بھی۔ اس سلسلے سے ان اشعار کو دیکھئے جہاں ظاہری طور پر لگتا ہے کہ کلیم عاجز معشوق کی اداؤں کا ذکر کر رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلیم عاجز برطانیہ حکومت کے ظلم و جبر سے آشنا کر رہے ہیں ملاحظہ کیجئے ؎

اس ناز اس انداز سے تم ہائے چلو ہو   روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں   چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو
ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا   تم کیا ہو تمہیں سب سے کہلوائے چلو ہو

آپ کی غزلیہ شاعری میں اعلیٰ درجہ کا تغزل اور غزل کا وہ دلکش پیرایہ موجود ہے جو اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ آپ کی غزلوں میں جو تپش ہے، سوز و گداز ہے، وہ آپ کی شخصیت کا ثمرہ ہے۔ آپ نے زندگی میں کئی حادثات و سانحات کو دیکھا، لیکن ان سب کے باوجود یہاں خود اعتمادی موجود رہتی ہے۔ زندگی جینے کا سلیقہ جس طرح ہونا چاہئے اس پر کسی طرح کا حرف نہیں آتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ ان کی شاعری آندھی میں بھی چراغ روشن رکھنے کا ہنر سکھاتی ہے اور تاریکی سے لڑنے کا سبق دیتی ہے۔ کلیم عاجز اپنی شاعری کو اپنے زخم جگر اور غم بیکراں کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

کہاں فرصت خواب شیریں ہمیں   اٹھا فصل گل اپنا بستر اٹھا
ساون کی گھٹا آئی میخانہ کے نزدیک   ہونٹوں سے مگر فاصلہ جام بہت ہے
ساز دل سے ٹوٹنے کے بعد بھی   ہلکی ہلکی سی صدا آتی رہی
یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی   میرے آشیاں سے دھواں اٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

آپ کا انداز بیان حقیقت میں جدا تھا۔ شاعروں کے اس بڑے جم غفیر میں آپ کا طرز اظہار کافی منفرد نظر آتا ہے۔ اس سلسلے سے خود کلیم عاجز فرماتے ہیں دیکھئے ؎

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا   جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا
کلیم آئے بھی اپنا ہنر دکھا بھی گئے   الاپ بھی گئے رُو بھی گئے رُلا بھی گئے
وہ چوٹ کھائی جگر پر کہ تلملا بھی گئے   مگر تھے وضع کے پابند مسکرا بھی گئے

آپ کی غزلیں اس بات کا اعتراف کراتی ہیں کہ یہاں انسانی احساسات کے ان گنت پہلو پوری دلکشی کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں دلکشی بھی ہے اور بے تکلفی بھی۔ ساتھ ہی یہاں ترتیب خیال اور تسلسل بھی دیکھنے کوملتا ہے۔

کلیم عاجز کی غزلیہ شاعری کی اہمیت وافادیت عیاں ہو سکے اس سلسلے سے میں یہاں چند اہل قلم کی آرا کونقل کرنا چاہوں گا ملاحظہ کیجئے۔ بقول کلیم الدین احمد :

''ان کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی۔ ان کے شعروں میں پھول بھی ہیں پتھر بھی اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں اس کام کے لئے بھی سلیقے کی ضرورت ہے۔''

(وہ جو شاعری کا سبب ہوا، کلیم عاجز، ص-۲۴)

بقول جمیل مظہری :

''انداز فکر میں جدت اور انداز بیان میں قدامت کلیم عاجز کے تغزل کا مخصوص آرٹ ہے۔ جو سینکڑوں شعرا کے ہزاروں اشعار کے ہجوم میں جانا اور پہچانا جاسکتا ہے۔''

(زبان وادب، بہار اردو اکادمی، مارچ ۲۰۱۵ء، ص-۵)

بقول کنہیا لال کپور :

''کلیم عاجز نے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے اور ایک نئے دبستان کی داغ بیل ڈالی ہے۔''

(ایضاً)

آپ کی غزلیں زندگی جینے کا شعور عطا کرتی ہیں۔ یہاں کسی طرح کا ابہام اور پیچیدگی نہیں بلکہ خوبصورت انداز میں دعوت فکر دی گئی ہے۔ زندگی کے سارے راز ونیاز سے قارئین کو بہرہ ور کرایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کلیم عاجز کی شاعری مسرت اور بصیرت عطا کرتی ہیں۔ آخر میں یہاں چند اشعار پیش کرنا چاہوں گا۔ جن سے کلیم عاجز کے نظریہ فکر کا بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

زمانہ سنگ سہی آئینہ کی خو رکھیو — جو دل میں رکھیو وہی سب کے روبرو رکھیو
چراغ گھر میں میسر نہیں رہے نہ رہے — جلائے دل میں مگر شمع آرزو رکھیو
اڑانہ دیجیو سب غم کی رنگ رلیوں میں — بچا کے دل کے پیالے میں کچھ لہو رکھیو

Dr. Mirza Saba Alam Baig
C./o. Mirza Noorain Baig
Dal Colony, Mohalla - Shahsupan
P.O. - Lal Bagh, Darbhanga

ڈاکٹر نسرین بانو

شموئل احمد کا ناول ''ندی'' فن کے آئینے میں

اردو ناول نگاری کے فروغ میں جس طرح صوبہ بہار کے بیشتر ناول نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے اسی طرح شموئل احمد کی قلمی معاونت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آپ کا فنی اختصاص ہی ہے کہ ناول نگاروں کی جم غفیر میں آپ کا مقام انفرادیت کا حامل ہے۔ آپ نے جس طرح اپنے ناول ''ندی'' میں موضوع کا انتخاب کیا ہے اور اسی مناسبت سے طرز اسلوب کا استعمال کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ جہاں تک اس ناول میں پیش کردہ موضوع کی بات ہے تو وہ بہت ہی اچھوتا اور نایاب ہے وہ اس لئے کہ پہلی بار شموئل احمد نے مرد اور عورت کے تعلق کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو مرکزیت عطا کی ہے۔ آپ نے گنے چنے کرداروں کے حوالے سے عورت اور مرد کے ذہنی رویے اور نفسیاتی گتھیوں سے قارئین ادب کو روشناس کرایا ہے جو کہ قابل اعتنا ہے۔

ناول کے کردار مرد کے ذریعہ مصنف نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ مرد کی دنیا میں اصول بندش قاعدہ وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں جب کہ عورت کی دنیا بالکل اس کے برعکس ہوتی ہے۔ عورت کی ایک رومانی دنیا ہوتی ہے۔ جس میں تصور کو خاص دخل حاصل ہوتا ہے۔ اسی تصوراتی دنیا میں وہ اپنے خوابوں کی دنیا سجاتی رہتی ہے، لیکن شموئل احمد کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس پہلو کو بھی سامنے لایا ہے کہ تصوراتی دنیا میں جینے والی ایک عورت یا لڑکی حقیقی زندگی کے ہر موڑ پر بالکل فٹ معلوم ہوا کرتی ہے۔ اس میں تمام تر خوبیاں ہوتی ہیں جو ایک کامیاب زندگی کے لئے ضروری ہوتی ہے، لیکن ناول کے نسوانی کردار کے ذریعہ شموئل احمد نے عورت کی ذہنی، جسمانی آزادی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ناول نگار نے مرد اور عورت کے رشتے کی آویزشوں، ذہنی جذباتی اور جسمانی تصادموں کے درمیان احساس زیاں اور احساس مرگ کے طویل سائے میں زندگی کے اثبات واقرار کا وہ پیکر تخلیق کیا ہے جو صرف اسیر جسم ہی نہیں بلکہ حدود جسم سے آزاد ہے۔ شموئل احمد نے عورت اور مرد کے اس رشتے کو ندی کی طرح رواں دواں اور شفاف دکھایا ہے جسے قابل تعریف کہا جائے گا۔ اس سلسلے سے یہ

اقتباس دیکھئے:

''ناول میں شموئل احمد نے دو مختلف اور متضاد کرداروں کو ایک ساتھ جمع کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دو مختلف اجناس کے باہمی تعلقات آپسی ہم آہنگی، ایثار و قربانی، محبت و خودسپردگی اور جذبہ خلوص کے ساتھ ہی مربوط و مکمل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ازدواجی زندگی کا ایک بنیادی اور ضروری عمل مباشرت بھی زنا بالجبر بن جاتا ہے۔ انسان کی فطری خواہشات فطری تبدیلیوں اور نفسیاتی احتجاج و اختلاف کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے ناول نگار نے خوبصورت جذبات نگاری، حسین فضا بندی کی ہے اور زندگی کی آزاد، لطیف اور فطری ضرورتوں کی جو علامتی و اشاراتی تعبیر و تفسیر کی ہے وہ مصنف کے دلچسپ تجربے، زندگی کے گہرے مطالعے اور سنجیدہ فکر کا ثبوت دیتی ہے جسے ناول کے ہر موڑ پر شروع سے آخر تک دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔''

(بہار میں ناول نگاری ۱۹۸۰ء کے بعد، رئیس انور ص ۲۵-۱۲۴)

شموئل احمد کا یہ ناول علامتی اور استعاراتی ہے کیوں کہ لفظ ندی علامت اور استعارہ دونوں حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ مصنف نے بہت ہی ہنرمندی کے ساتھ ندی کو زندگی کی روانی اور عورت کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ صرف ندی ہی نہیں بہت ساری اشیا کو آپ نے علامت کی شکل میں سامنے لایا ہے، لیکن آپ کا فنی اختصاص یہ رہا ہے کہ ناول میں کہیں بھی ابہام پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ بلکہ پورا ناول شاعرانہ انداز میں قاری کو متاثر کراتا ہوا اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس سلسلے سے ناول کا یہ اقتباس دیکھئے :

''چاند شباب پر تھا کہ یکایک اس نے آواز دی کہ اب وہ سونا چاہتا ہے اور دلکش رنگین تصویر پر قطرہ قطرہ پانی ٹپکنے لگا تھا۔''

''پہاڑ ہنسنے لگا آسمان کے وسط میں مہکتا ہوا چاند کسی پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔''

''اس کو لگا اس کے ارد گرد خشک پتوں کا ڈھیر ہے اور اس کے اندر کوئی چیز جیسے پڑی پڑی مرجھانے سی لگی ہے۔''

(ناول ندی، شموئل احمد، ص-۵۱)

یہ تو صاف شفاف نثری خوبیاں ہیں جو شموئل احمد کی انفرادیت کو بیاں کر رہا ہے۔ اس پر اضافہ یہ

کہ آپ کو دیومالائی اور اساطیری زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ آپ کا کمال فن یہ ہے کہ آپ نے دیومالائی قصے کو پیش کر کے اختصار نویسی کو ترجیح دیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ کیوں کہ اختصار کے باوجود ایک قاری پورے ناول کی داخلی کیفیات اور واردات سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔ کیوں کہ شموئل احمد اس پہلو سے شناسا ہیں کہ ناول میں ہر بات وضاحت کے ساتھ بیان کرنا فنکاری نہیں بلکہ علامت اور کنائے کے پردے میں پیش کردہ باتیں زیادہ جاذب اور ہر اثر ہوا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیہوں، استعاروں، علامتوں اور اساطیر سے مل کر شموئل احمد کا نثری اسلوب خالص شاعرانہ ہو گیا ہے جس کی شیرینی پورے ناول میں موجود ہے۔ اس سلسلے سے ناول کا یہ اقتباس دیکھئے :

''وہاں تنہائی جیسے کم خواب میں لپٹی ہوئی تھی نرم اور گداز سی جس کی مخملی لمس کو اس نے روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا تھا۔ وہاں تنہائی ایک موسیقی تھی۔ آہستہ آہستہ زینہ زینہ روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی تاروں کی روشنی میں جھلملاتا ہوا ندی کا پانی ہوا میں آہستہ آہستہ ہلتی ہوئی برگد کی شاخ سڑک پر موٹروں کا شور یہ سب اسی مخملی تنہائی کا حصہ تھے۔ اس کو لگا یہ خامشی کا کائنات سے پہلے کی خامشی ہے عدم وجود کی کامشی ہے جس میں وجود آہستہ آہستہ ضم ہو رہا ہے۔ وہ بے خودسی ہو گئی۔''

(ناول ندی، شموئل احمد، ص-۵۴)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ مصنف نے کتنے خوبصورت انداز میں عورت کے جذبات و احساسات کی تصویر کشی کی ہے۔ فطرت کی رنگینی انسانی زندگی کو کس طرح اپنی گرویدہ بناتی ہے اور انسان کا دل اس سے کتنا متاثر ہوتا ہے مذکورہ بالا اقتباس اس کی بھرپور وضاحت کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ آپ نے جس طرح شاعرانہ اسلوب کا استعمال کیا ہے وہ کافی قابل تعریف ہے۔ اس سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ نے جس طرح عنوان ندی کا انتخاب کیا ہے اس کے مناسبت سے شاعرانہ اور لطیف طرز اظہار کا استعمال کر کے اپنے کمال فن کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

سچویشن اور موضوع نے شموئل احمد کو کھلی ہوئی بے باک زبان استعمال کرنے پر بھی مجبور کیا ہے۔ ''ندی'' چوں کہ جنس کے رشتے کو نفسیاتی اور فلسفیانہ منظر میں پیش کرتا ہے اور عورت کے کردار کو حقیقی طور پر نئی حسیت کا حامل بناتا ہے اس لئے ایسا ممکن ہی نہیں کہ مصنف مرد و عورت کے مخصوص جذبات اور آپسی تعلقات کے ان گوشوں سے سرسری طور پر گزر جائے جو اس رشتے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ شموئل احمد کے سامنے بھی ایسے گوشے آئے ہیں اور ان گوشوں کی ترسیل کے لئے وہ مجبور ہوئے ہیں کہ برجستہ اور حقیقی زبان کا رویہ

اپنائیں جو کھلا ہوا اور عریاں کہلاتا ہے۔ زبان کا یہ کھلا پن معاملے کی تفہیم میں مدد پہنچاتا ہے اور اظہاریت کے لئے برجستگی کی ایک فطری صورت بھی بنتا ہے۔ کیوں کہ جس جذبے سے عورت گزر رہی ہے، اس جذبے کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار صرف اسی زبان اور اسی اسلوب سے ممکن ہے۔

شموئل احمد کا مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور اسلوب و اظہار کی مختلف تکنیکوں سے بخوبی واقف ہیں اور ''ندی'' کو ان تکنیکوں سے انہوں نے خوبصورت اور رنگین بنایا ہے۔ اس کی یہ رنگینی اسے شعری اسلوب تو عطا کرتی ہے، مگر ایک باشعور فنکار کی طرح انہوں نے خود کو رنگینی میں کہیں ملبوث نہیں کیا ورنہ موضوع کی تہہ میں موجود عریانیت میں پوشیدہ لذت انہیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ناول کے لئے یہی اسلوب مناسب ہے؟ اگر ایسا ہے تو شموئل احمد نے ''مہاماری'' میں اسے کیوں نہیں برتا؟ میرا خیال یہ ہے کہ شموئل احمد ندی کی اشاعت سے پہلے ہی علامت نگاری، تجریدیت اور بیانیہ کی مختلف تکنیکوں سے واقف رہے ہیں اور اپنے تخلیقی سفر میں انہوں نے تمام اسالیب تحریر کو اپنایا اور برتا بھی ہے، اس لئے ندی کے لئے ایک مخصوص شاعرانہ اور لطیف طرز اظہار کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے اس ناول کے لئے شعوری طور پر یہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ موضوع، طرز اور اسلوب کی بنیاد ہوتا ہے۔ ''مہاماری'' اس اسلوب میں نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ عہدوں کی سیاست، سماج کے کھردرے حقائق، افسر شاہی کا پرفریب سسٹم، سڑا گلا کرپشن زدہ نظام، ذات پات کا کھیل اور سیاست کے داؤں پیچ جیسے موضوعات اس کا تقاضا کر رہے تھے کہ حقائق کی ننگی اور سچی عکاسی کی جائے یہاں ''ندی'' کا شاعرانہ اور لطیف اسلوب مضحکہ خیز ہو سکتا تھا اس لئے مصنف نے خوبصورت اور شاعرانہ اسلوب پر قدرت رکھتے ہوئے بھی ''مہاماری'' میں سادہ، سلیس اور حقیقتوں کو بے پردہ پیش کرنے والا شفاف اور کھردرا بیانیہ استعمال کیا ہے۔ جب کہ ''ندی'' میں عورت اور مرد کے رشتے کی دائمی کشش ہے۔ عورت کے نرم نرم احساسات کی پھوار ہے جو قاری کو اندر تک بھگو ڈالتی ہے۔ دل کی بے سود تڑپ اور جسم کی مایوس پکار کا استعارہ ہے جو قاری کو بار بار پڑھنے اور پڑھ کر استعارے کی تفہیم و تعبیر کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے ''ندی'' شاعرانہ اسلوب میں لکھا ہوا ایک جامع ناول ہے جس میں غزل کی سی ایمائیت اور لطافت ہے اور جو اپنی زبان، اپنے استعارے اور اپنی روانی سے قاری کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا کہ ناول ندی اپنے فن کی بنیاد پر انفرادیت کا حامل ہے۔ صرف موضوع ہی نہیں کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور اسلوب نگارش تمام تر تقی و عناصر کے حوالے سے یہ ایک عمدہ اور کارآمد ناول ہے۔ جس کی دلچسپی کل بھی قائم تھی اور آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

مضمون کے آخر میں میں یہ اقتباس شامل کرنا چاہوں گی ملاحظہ کیجئے :

''شموئل احمد کا ناولٹ 'ندی' عام ارضی اور جانی پہچانی تفصیلات کی زبان میں گفتگو کرنے کے باوجود انسانی کرداروں، فطرت کے مظاہر اور شہرنا معلوم کی جسمانی اور غیر جسمانی تعمیرات کے توسط سے کچھ اس انداز میں منزل ترسیل پر پہنچا ہے کہ لمحہ تکمیل میں سراسر شاعرانہ نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ مرد اور عورت کے رشتے کی آویزشوں، ذہنی جذباتی اور جسمانی تصادموں کے درمیان شموئل احمد نے احساس زیاں، احساس مرگ کے طویل اور ناگزیر سایے میں زندگی کے اثبات و اقرار کا وہ پیکر تخلیق کیا ہے جو اسیر جسم ہونے کے باوجود حدودِ جسم سے آزاد ہے اور ندی کی طرح رواں دواں اور قائم و برقرار ہے۔ شموئل احمد بیانیہ، واقعہ، مکالمہ اور ڈرامائی طریقہ کار کا استعمال کرتے ہوئے نہ تو دخیل راوی کی طرح فلسفیانہ موشگافیاں کرتے ہیں نہ حشو و زوائد کا شکار ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر صورت حال میں ان کا فنکارانہ سفر ایک روشن تجسس اور مضطرب افسردگی کی سرشاریوں کا سفر رہتا ہے۔''

(بہار میں اردو ناول نگاری ۱۹۸۰ء کے بعد، رئیس انور، ص-۱۳۶)

Dr. Nasreen Bano
W/o.- Md. Murtaza Khan
C 10/10 Ziapura
Naya Pandariba
Chetganj
Varanasi-221010
(U.P.)

ڈاکٹر اعجاز کاظمی

تنقید، اس کی ماہیئت، افادیت اور اہمیت

تنقید سے مراد ادبی تنقید ہے۔ ادبی تنقید ایک باضابطہ اور ترقی یافتہ صنف ادب ہے۔ لفظ تنقید عربی لفظ ''نقد'' سے مشتق ہے جو یونانی لفظ "Krites'' یا لاطینی لفظ Critcus سے بنا ہے۔ بقول نیاز فتحپوری :

''جسے انگریزی میں Criticus کہتے ہیں اس کا ماخذ یونانی لفظ ہے جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ اردو میں عام طور پر اس کا ترجمہ تنقید کیا جاتا ہے لیکن زیادہ صحیح لفظ ''نقد'' یا انتقاد ہے جس کا مفہوم پرکھنا یا جانچنا ہے۔''

تنقید اپنی اصطلاحی معنوں میں بہت زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ خوب سے خوب تر کی تمنا و تلاش ہی درحقیقت انسان کی تمام تر ترقیوں کی بنیاد ہے۔ انسان اپنی موجودہ حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ خامیوں کو دور کر کے خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ وہ کسی شئے کو جانچتا پرکھتا ہے اور بہتر بنانے کی جتن کرتا ہے یہ فطرت۔ انسان کی خون میں شامل ہے۔ جو تہذیب وتمدن اور نئے علوم وفنون کو جنم دیتا ہے جس پر انسان نازاں ہوتا ہے۔ یہی جانچ پرکھ اور خوب تر کی تلاش تنقید ہے۔

مختلف اہل علم نے تنقید کی تعریفیں اپنے اپنے انداز میں الگ الگ کی ہیں لیکن اس بات پر سب یکساں متفق ہیں کہ تنقید ہی وہ آلہ ہے جس کے ذریعے ہم کسی ادب پارہ کو جانچ سکتے ہیں اور اس کی پرکھ ممکن ہے۔ تنقید کی رہنمائی کے بغیر ہم کسی ادبی تخلیقات کی خوبی وخامی، اہمیت افادیت اور مقصدیت کے اندرونی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے ادبی مطالعہ میں اس کی ناگزیری کا کم وبیش بیشتر نقادوں نے اعتراف کیا ہے۔ اس کے برعکس کچھ ایسے نقاد بھی ہیں جو فن پارے کے لئے تنقید کو مضر گردانتے ہیں جس میں ڈرائڈن، ایمرسن، بائرن، ٹینی سن، فلابیر پیش پیش ہیں۔ تنقید کے وجود کو مضر جاننے والے یہ حضرات دراصل اس تنقید کی مذمت کرتے ہیں جو اردو ادب میں سودا نے میر پر کی تھی۔ انشا نے مصحفی پر، اودھ پنچ نے حالی پر، سرور نے میر امن پر۔ دراصل یہ اعتراضات نظریاتی نہیں تھے بلکہ ذاتی چشمک اور تعصب پرستی کا نتیجہ تھا۔ اسے صحت مند تنقید خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ سنجیدہ تنقید کی بنیاد کبھی چشمک اور تعصب پسندی پر نہیں

ہوسکتی۔ اس لئے ٹی ایس۔ ایلیٹ کا یہ کہنا ہے :

''تنقید ہماری زندگی کے لئے اتنا ہی ناگزیر ہے جتنی سانس۔''

روز اوّل سے جو چیز انسان کو متحرک، حسن پسند، بہتر سے بہتر اور خوشگوار بناتی رہی ہے وہ تنقیدی بصیرت ہی ہے۔ اگر تنقیدی شعور کا وجود نہ ہوتا تو آج ہمارا آفاقی اور اعلیٰ درجے کا ادب اقلیدس کا خیالی نکتہ یا معشوق کی موہوم کمر سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔ یہ تنقید ہی ہے جس کی بدولت نقاد، فنکار اور قارئین کے درمیان رابطہ قائم ہوتا ہے۔ تخلیقات اور قارئین کے درمیان ادبی افتہام کے مرحلے کو آسان سے آسان تر بنانے کی سعی تنقید ہی ادا کرسکتی ہے۔ ادبی مطالعہ میں تنقید کی ناگزیری کا اندازہ اس سے بھی لگا جاسکتا ہے کہ آج جس ادب پر ہم ناز وفخر کرتے ہیں اسے اس مقام تک پہچانے کا سہرا صرف اور صرف ادبی تنقید ہی کے سر ہے۔

تنقید کی ماہیئت :تنقید کا لغوی معنی کھرے اور کھوٹے کی پرکھ، اچھے اور بُرے کی تمیز اور شائستہ اور ناشائستہ کی پہچان ہے۔ یہ زندگی کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے۔ تہذیب وتمدن کی بلند عمارتیں اسی بنیاد پر قائم ہیں۔ ترقی اسی تنقید سے وابستہ ہے۔ ادبیات کی دنیا بھی اس سے جدا نہیں ہے۔ اردو ادب میں تنقید کا وجود ادب کے وجود کے ساتھ ہے۔ کیا کہا جائے اور کیسے کہا جائے تخلیق کی بنیاد ہوتی ہے گویا تنقید کی بنیاد پر تخلیق ہوتی ہے اور تخلیق کی بنیاد میں تنقیدی شعور نظر آتا ہے۔ اس لئے تخلیق وتنقید لازم وملزوم ہیں۔ اردو میں تنقید کے یہ ابتدائی نقوش شاعروں کے تصانیف کی تقریظوں، اساتذہ کی اصلاحوں اور شعرا کے تذکروں میں موجود ہیں۔ البتہ اب ان ابتدائی نقوش پر غائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اور تنقید نے ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ نقد ونظر کے بہت سارے پہلو رونما ہوئے ہیں۔ اردو ادب پر مغربی اثرات کا تنقیدی ترقی میں اہم حصہ ہے۔ اس لئے فن تنقید کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے مغربی افکار وآرا سے استفادہ ناگزیر ہے۔

اس ضمن میں تنقید کی تعریف پہلی بات ہے۔ تنقید کی کوئی جامع اور مکمل تعریف سخت مشکل ہے۔ مفکرین کے خیالات اور تنقید کے مفہوم کے پیش نظر چند اقتباسات دیکھے جاسکتے ہیں :

۱۔ تنقید ادب وفن کے حسن وقبح کو علم وصحت کے ساتھ جانچنے اور پرکھنے کے فن کا نام ہے۔

۲۔ تنقید ایک فن ہے جس کے ذریعے کسی ادب پارہ یا فنون لطیفہ میں جمالیاتی اوصاف کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔

۳۔ فن تنقید کسی مخصوص کارنامہ کے محاسن ومعائب کا مطالعہ ہے۔

۴۔ انسانی ذہن کا ہر وہ فعل یا عمل تنقید ہے جو کسی مخصوص
شئے کی وقیع خصوصیات کو اس کی غیر وقیع خصوصیات سے
ممیّز کردے۔

۵۔ تنقید کا معنی فنی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔

ان کے علاوہ مفکرین نے اپنے اپنے طور پر تنقید کی تعریفی حدیں قائم کی ہیں۔ میتھو آرنلڈ نے کہا ہے :

'' دنیا میں جو بہتر سے بہتر بات معلوم ہے یا سوچی گئی ہیں انہیں غیر
جانبدارانہ طور پر جاننے اور عام کرنے کی لگن کو تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔''

اس خیال کی روشنی میں خوب سے خوب تر کی تلاش، اس کا انکشاف اور اس کی اشاعت کا نام تنقید ہے بشرطیکہ ان تمام مراحل میں غیر جانبداری ملحوظ رہے۔ اس میں اعلیٰ قدروں کی چھان بین اور ان کے تعین کا پہلو نمایاں ہے۔

تنقید میں غیر جانبداری اہم شرط ہے۔ اس میں اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو خلل انداز نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ذاتی پسند و ناپسند کے خلل سے الگ کسی چیز کو اس کی صحیح صحیح شکل و صورت میں دیکھنے کی کوشش کا نام تنقید ہے۔

محاسن و معائب کی تمیز موازنہ اور ترجیح کا تعلق فیصلہ اور معیار سے ہے اس لئے تنقید کا کچھ نہ کچھ معیار ہونا ضروری ہے۔ ڈرائڈن نے ارسطو کی تنقید کی روشنی میں تنقید کو اچھی طرح فیصلہ کرنے کا معیار قرار دیا ہے۔ جو ادب و فن کے سرمائے سے قائم ہوتا ہے۔ اب فیصلہ سے انکار بھی کیا جاسکتا ہے۔ تنقید فن کی وضاحت اور فنکاری کی ترجمانی ہے۔ جہاں تک پہنچنے کا رتبہ تجزیہ ہوسکتا ہے۔ تنقید فیصلہ ہے یا ترجمانی یہ اختلاف آج تک کسی حد تک باقی ہے۔ یہ ضرور مسلم ہے کہ ترجمانی فیصلہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور تنقید کا ایک پہلو ہے۔ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے دونوں سے تنقید کا تعلق ہے۔ اس لئے ترجمانی اور فیصلہ دونوں تنقید میں شامل ہے۔

ڈاکٹر عبارت بریلوی نے اردو تنقید کا ارتقا میں ہڈسن Hudsan کے حوالے سے لکھا ہے :

'' تنقید ادب کے تمام اصناف یعنی شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نویسی اور
خود تنقید نگاری سے سرور کار رکھتی ہے۔ اگر ادب کی ان اصناف کو زندگی کا
ترجمان کہا جاسکتا ہے تو ان اصناف نے زندگی کی جو ترجمانی کی ہے ان کی
ترجمانی تنقید ہے۔''

پھر موصوف نے اپنے طور پر لکھا ہے :

ISSN : 2582 - 3612

'' عدل، انصاف، رائے دینا یا حکم لگانا ہی تنقید نہیں ہے بلکہ وہ تمام ادب تنقید
کے تحت شمار کیا جاسکتا ہے جو ادب کی دوسری اصناف کے متعلق لکھا گیا ہے
خواہ وہ ان اصناف ادب کی تشریح کرے، تجزیہ کرے، ان کی قدر و قیمت
متعین کرے یا اس تحریر میں بیک وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں ہوں۔''

تنقید کی افادیت: تنقید کی ماہیئت ہی اس کی اہمیت و افادیت ظاہر کر دیتی ہے۔ ماہیئت، افادیت اور اہمیت ایک دوسرے کے لئے اجزائے ترکیبی لاینفک ہیں۔ تخلیق میں تنقیدی شعور کارفرما ہوتا ہے تو فنکار خود نقد و نظر سے آگاہ ہے۔ اس کے فن کو پرکھنے کے لئے کسی دوسرے نقاد کی کیا ضرورت ہے؟ اور تنقید کا کیا فائدہ ہے۔ فنکار و نقاد کے متعلق بدگمانیاں بھی ہیں۔

۱۔ ڈرائڈن جو فنکار اور نقاد بھی تھا کہا ہے کہ نقادوں میں فنکار کے متعلق نفرت کا جذبۂ شدید ہوتا ہے اس لئے نقاد فنکار کی خوبیوں سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔

۲۔ ایمرسن کا خیال ہے کہ نقاد وہ ہوتا ہے جس کو شعر گوئی میں ناکامی ہوتی ہے اور وہ جھنجھلا کر تنقید نگاری اختیار کر لیتا ہے۔

۳۔ بائرن کا قول ہے کہ نقاد پر بھروسہ کرنے سے پہلے ہر ناممکن بات یقین کرلو۔

۴۔ سید احتشام حسین نے اپنے مضمون تنقید اور عملی تنقید میں کہا ہے :
چیخوف نے کہا ہے کہ نقاد وہ مکھی ہے جو گھوڑا کو ہل چلانے سے روکتی ہے۔

۵۔ ٹینی سن نے کہا ہے کہ نقاد ادبیات کے گیسوؤں کا جوں ہے۔

۶۔ فلابیر نے تنقید کو ادب کے جسم پر کوڑھ سے تعبیر کیا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود تنقید نے فنکار کو حوصلہ شکن فضا میں کھڑا کر دیا ہے۔ تنقید کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہے۔ فنون لطیف سے آگاہی اور اس کا منظم و مربوط اظہار بجائے خود ادبی تخلیق ہے۔ اس طرح تنقید کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ادب تنقید کا موضوع ہے اور زندگی اس کی بیکراں وسعت، ادب کا موضوع ہے۔ اس طرح تنقید کا تعلق زندگی سے بھی ہے۔

تنقید کی اہمیت: تنقید کی اہمیت اس کے فوائد سے قطع نظر اس لئے بھی ہے کہ :

۱۔ یہ بھی ایک صنف ادب ہے۔ ادب زندگی کے لئے مفید ہے تو تنقید بھی افادیت سے خالی نہیں اور اس کی اہمیت کم نہیں۔

۲۔ کلیم الدین احمد کے مطابق تنقید کی قدر و قیمت سے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

انکارزندگی کی قدر و قیمت کا انکار ہے۔

۳۔ تنقید سے مراد ادبی تنقید ہی ہوتی ہے۔تنقیدی عمل کئی مراحل سے ہوکر گذرتا ہے اور کئی پہلو رکھتا ہے۔تجزیہ و تنقیح، ترجمانی و تشریح، تحسین و تخمین، یعنی فنی کارناموں کو اچھی طرح سمجھنا اور سمجھانا اس کا فرض منصبی ہے۔

ڈاکٹر عبارت بریلوی کے مطابق تنقید بڑے بڑے فنکاروں اور ادیبوں کے کارناموں کو سمجھاتی ہے، ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتی ہے۔ان کے مطالب کی وضاحت کرتی ہے، ان کی خوبیوں کو عوام کے سامنے لاتی ہے۔یعنی تنقید کا ایک بڑا کام ایک ادبی و فنی فضا پیدا کر کے عوام کے ذوق میں نکھار پیدا کرنا اور فن و ادب کے معیار کو بلند کرنا بھی ہے۔جب فضا پیدا ہو جاتی ہے تو اعلیٰ تخلیقات کی طرف میلان بڑھتا ہے۔تنقید کی یہی اہمیت اپنی جگہ مہتم بالشان ہے۔

۴۔ یہ فنکار اپنے جذبات میں مستغرق ہوتا ہے اور اس پر جذبہ کا غلبہ شدید رہتا ہے۔اگرچہ تخلیقی عمل تنقیدی صلاحیت سے بے نیاز نہیں ہوتا لیکن فنکار اپنے فن کا شیدا ہوتا ہے اور اپنے فن پارہ کا گرویدہ۔وہ اپنی تخلیق میں کمی یا تبدیلی کو پسند نہیں کرتا۔نقاد پر صرف ادب کی صحت اور اس کے معیار کا اثر ہوتا ہے۔اسی لئے فنکار اور نقاد کے مابین تفاوت قائم ہوتا ہے اور وہ بیداری کا مظہر و ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔نقاد کے خلاف جو آواز ملتے ہیں ان میں یہی فرق کارفرما ہے لیکن تنقید کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

Dr. Ajaz Ahmad
Vill. Moohanpur Boaria
P.O. Mirapur, Dholi
Muzaffarpur, Bihar

امتیاز عالم

اردو فکشن میں ہندوستانیت

اردو فکشن میں بھی ہندوستانیت کی روایت کی پاسداری نظر آتی ہے۔ نئے اردو فکشن کا رنگ و آہنگ بھی اب اس نکتہ سے باخبر معلوم ہوتا ہے کہ خال سیہ چہرہ گل رد کیلئے ہوتا ہے تیرگی بد سہی لیکن گیسوؤں کے لئے نیک ہوتی ہے چنانچہ اردو ناول نئے جہات اور امکانات کے ساتھ کلاسیکی روایات کا امین و پاسدار آج بھی ہے۔

نثر کی دنیا میں افسانے اور ناول پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیبی جڑوں کی تلاش ان کا محبوب موضوع ہے۔'' آگ کا دریا ہو یا ایوان غزل'' بارش سنگ ہو یا چہرہ بہ چہرہ روبرو، سب میں ایک ہی آواز ابھرتی ہے جو ہندوستانی تہذیب کی جھلک پیش کرتی ہے۔ ہماری تہذیب، ہماری اقدار حیات یہ تھی اور یہ ہے مثلا راجا گدہ، میں رزق حلال وحرام کی بحث، گدھ کی نحوست اور دوسرے روحانی اقدار کی بازیافت ہے، دشت ہوس، میں منصور حلاج اور چہرہ بہ چہرہ رد برد، میں قرۃ العین طاہرہ سے خصوصی انداز میں ملاقات ہوتی ہے،، دوگز زمین میں تقسیم کے کرب کی یاد ہے''خواب رو'' پڑھتے ہوئے تو ایسا لگا تھا جیسے کراچی میں لکھنؤ آباد ہے۔مرزا نہیں لکھنوی تہذیب کا متحرک آئینہ ہے۔

ناولوں میں کہیں ہماری تاریخ ہے اور کہیں تاریخ کے نازک موڑ کا تذکرہ ہے کہیں نو آبادیاتی نظام کی علامت اس اجنبی سفید ہاتھ کا تذکرہ ہے جس نے تہذیبی بہاؤ کے دھارے میں سیاسی دیواریں بنا دیں اور کہیں وہ المیہ بھی ہے جس میں ناخون گوشت سے جدا دکھائی دیا۔اور وحدت کو تثلیث بنا دیا گیا تقسیم کا المیہ اسی کا کرب، اسی کا درد ہماری روایات کا جزو بن چکا ہے وہ ناولوں میں بھی نظر آیا۔

اس طرح انسانوں میں'' زرد کتا ہو یا،، نمک،، سوا نیزے پر سورج ''ہو یا اسی طرح کے اور افسانے سب میں تہذیبی روایت کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔طرز تحریر میں بھی داستانوں اور اساطیری قصوں کے بیانیہ پر اب زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔کلاسیکی روایت کی بازیافت کا صرصر اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ

دوسری زبانوں میں بھی ہوگا ان زبانوں کے ادب سے اپنی کم علمی کی بنا پر آگاہی اور واقفیت نہیں ہے البتہ جس طرح اردو میں گیت، دوہے کہے جارہے ہیں اسی طرح تلگو میں بھی نرائن ریڈی غزل لکھ رہے ہیں اور ڈیگمیر شاعری اپنی انقلاب آفرینی کی وجہ سے کلاسیکی روایت کی طرف متوجہ ہے جہاں تک شعری جمالیات کا سوال ہے ہندی اردو سے قریب ہے وہاں غزل اور رباعی لکھ کر مشترکہ شعری روایات کی بازیافت ہورہی ہے۔

آج بھی زندہ وتابندہ ہیں ان کی بازیافت کی ضرورت پیش نہیں آئی ایک ہی آرزو یا تمنا ہے کہ کچھ ایسے ہی روایات ہیں جن کی بازیافت کا تذکرہ نہ ہو تو بہتر ہے اس لئے کہ بازیافت اس کی ہوتی ہے جو ماضی کی چیز بنا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ میں باہمی احترام، وسیع النظری، مذہبی رواداری، کثرت میں وحدت اور رنگارنگی میں یک رنگی، اگر کبھی ماضی کی تاریخ بن کر رہ گئی اور وقت کے کسی موڑ پر ہندوستانی کو ان کی بازیافت کی فکر ہوئی تو شاید پھر یہ کبھی نہیں کہا جاسکے گا کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا!

اردو ناول میں ہندوستانیت

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اردو ناول کو جس ڈھب سے ثروت مند کیا یہ اعزاز کسی اور کے حصے میں آیا ہی نہیں ہے اور ہاں میں یہ بات اس کے باوجود کہہ رہا ہوں نے قرۃ العین کے قلم نے تراشے ''کس نے اتنے مقامات اور اتنے مناظر کو لکھا ہے جتنے اس جادوگر بی بی نے لکھ ڈالے ہیں۔ اور کون ہے جس نے ہماری فکشن کو مجہول فکری کے طعنے سے بچایا اسے جذباتیت نکالا' تاریخ کے ایک بڑے دائرے اور زندگی کے وسیع تناظر میں لاکر اس پر ایک نئی تخلیقی فضا کا در باز کیا۔

قرۃ العین حیدر کے تخلیقی قرینے اور مزاج کو سمجھنے کی نیت ہو تو میرے بھی صنم خانے کے آغاز ہی میں وہ ہمارے لیے اشارے فراہم کرنا شروع کردیتی ہے۔ اس اولین ناول کے ابتدائی صفحات میں اقبال کی ایک معروف رباعی سے یہ تین الفاظ ملتے ہیں :

''تراشیدم' پرستیدم' شکستم''

اور اس کے ساتھ ہی میرانیس کا یہ شعر بھی موجود ہے: انیس دم بھر کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ گیا جس میں فاروقی کی شاعرانہ نثر کی چاشنی میں قاری کھو جاتا ہے۔

معاصر ناولوں کے سرمائے پر جب نظر پڑتی ہے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ان ناولوں میں اردو کے

فکشن کے دامن کو مالامال کیا ہے۔ لیکن مجھے اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ قرۃ العین کے فن کی عظمت کے سامنے ہمارے یہ ناول نگار ٹھہر نہیں پاتے ہیں۔ جابر حسین نے سن اے کاتب، حبیب حق نے جسے میر کہتے ہیں۔

صاحبو بھی ناول اردو کو دیے جوگندر پال، اقبال مجید، عبدالصمد پیغام آفاقی، غضنفر، مشرف عالم ذوقی نے اور دیگر ناول نگاروں نے متعدد اہم ناول اردو کے دامن میں لاکر جمع کردئے رفتار یقیناً تیز ہے۔ نئے نئے موضوعات پر نئے نئے ناول بھی لکھے گئے لیکن ان کے فنی معیار سے ابھی بحث باقی ہے۔ ہمارے ان ناولوں میں ہندوستان کی مختلف رنگوں، تہذیبی جہتوں اور تاریخی حقائق کو دیکھا جاسکتا ہے یہ ناول ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان ناولوں میں تہذیبی و معاشرتی زندگیاں پنہاں ہیں۔ ان ناولوں میں ہمارے عہد اور سماج کی حقیقی تصویروں کو دیکھا جاسکتا ہے ہمارے عہد میں ناولوں کے موضوعات محض ہجرت، فساد اور ذات پات نہیں ہیں۔ ہمارے تخلیقی فنکاروں بالخصوص ناول نگاروں کا پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے صحافیوں سے زبردست مقابلہ ہے۔ گلوبلائزیشن کے اس عہد میں میڈیا کے افراد جدید سائنس کے نمائندے کے طور پر ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ ہمارے صحافی زندگی کی حقیقتوں اور مسائل کی تہہ میں جاکر خبروں کے موتی بکھیر دیتے ہیں جن کی روشنی کی چمک کے آگے ہماری آنکھیں نہیں ٹھہر پاتیں۔ ہمارا ناول نگار اسی وقت کامیاب ہوگا جب وہ جدید آلات وتکنیک سے لیس صحافیوں سے دو قدم آگے بڑھ کر سماج کی حقیقتوں کو تعصب اور ہر طرح کی برائیوں کو بے نقاب کرے۔ ناول ہمارے عہد کا ایک اہم ترجمان ہے۔ ہمارے ناول نگاروں کو دو قدم آگے بڑھ کے سوچنا اور لکھنا ہوگا محض موضوع کے اعتبار سے نہیں بلکہ فن اور تکنیک کے اعتبار سے بھی ہمیں نئی دنیا سے موتی چن کر لانے کی ضرورت ہے۔

معاصر ناولوں میں مستقبل میں کس ناول کو اعتبار واستناد کا درجہ حاصل ہوگا فی الوقت کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ ہندوستان میں قرۃ العین حیدر کے بعد کے لکھے گئے ناولوں کو سنجیدگی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی ناول اشاعت کے چند برسوں کے بعد ہی سند کا درجہ مشکل سے ہی حاصل کر پاتا ہے۔ آگ کا دریا، خدا کی بستی، علی پور کا ایلی، اداس نسلیں، آنگن کے سامنے ممکن ہے چند برسوں کے بعد ہم افتخار کے ساتھ دو گز زمین، مکان، فائر ایریا، کئی چاند تھے سر آسماں، پانی اور لے سانس بھی آہستہ رکھ سکیں۔ مگر مجھے اب بھی نئے اور بڑے ناول کی تلاش ہے۔ ساتھ ساتھ ناول بھی لکھے ان کے ناولوں میں ''سڑک''، ''غدار''،

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

''جب کھیت جاگ اٹھے''۔ان کے ہاں خوبصورت انداز بیان تو موجود ہے لیکن کہانیاں زیادہ تر فلمی قسم کی ہیں۔جس پر ترقی پسند سوچ کا غلبہ ہے۔

عزیز احمد نے بھی کئی ناول لکھے مثلاً''خون''،''مرمر''،''گریز''،''آگ''اور''شبنم''وغیرہ شامل ہیں۔ان کے ناولوں میں جدید انسان کے ذہن کے اندر جو انتشار ہے اس کی عکاسی ملتی ہے۔اس کے بعد عصمت چغتائی جنسی اور نفسیاتی حوالے سے بہت مشہور ہیں۔انہوں نے''معصومہ''،''ضدی''،''ٹیڑھی لکیر''اور''سودائی''جیسے ناول لکھے۔ان کے یہاں جنسی حوالے ضرور ہیں لیکن ان کے پس منظر میں ہمیشہ نفسیاتی اور اشترا کی نقطہ نظر کارفرما رہتا ہے۔

Imteyaz Alam
M.M. Colony
Siwan (Bihar)

ISSN : 2582 - 3612

ڈاکٹر تبسم جہاں

شین مظفر پوری کی ناول نگاری

شین مظفر پوری کا اصلی نام ولی الرحمٰن شیداؔ اور قلمی نام شینؔ مظفر پوری تھا۔۱۹۲۰ء میں سیتامڑھی ضلع کے ایک گاؤں باتھ اصلی میں ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مرحوم حافظ عین الحق کلکتہ کے قصائی گلی کی ایک مسجد میں امام کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

شینؔ مظفر پوری ابھی ایک سال کے تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔لہٰذا ان کی پھوپھی بی بی ولیہ نے انہیں گود لے کر ان کی پرورش کی۔ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہی حاصل کی۔کچھ بڑے ہوئے تو والد کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور کلکتہ ہی میں ان کا داخلہ ایک اسکول میں کرا دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں انہیں میٹرک کا امتحان دینا تھا،لیکن بعض گھریلو مسائل کے باعث انہیں گھر آنا پڑ گیا۔جس کی وجہ سے وہ اس سال میٹرک کے امتحان میں شامل نہ ہو سکے۔۱۹۳۷ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

میٹرک کے امتحان دینے کے بعد فرصت کے لمحات میں وہ ہمیشہ کچھ لکھتے پڑھتے تھے۔اس زمانے میں انہوں نے نثری نظمیں بھی لکھنے کی کوشش کی ساتھ ہی تقریباً آٹھ انگریزی افسانوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جو اشاعت کے مرحلے سے بھی گذرا۔شینؔ مظفر پوری کے نامساعد حالات انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے روکتے رہے۔تعلیمی دور سے فراغت کے بعد انہوں نے مستقلاً وعملاً اپنا وقت تخلیقی کاموں میں لگانا شروع کیا۔شینؔ مظفر پوری کی زندگی چونکہ پریشان حال رہی لہٰذا ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

جس طرح ڈراما کا فن انگریزی ادب میں یونان سے آیا ہے۔اسی طرح اردو ادب میں ناول کا فن انگریزی ادب کے اثرات سے پیدا ہوا۔شین مظفر پوری اصلاً افسانے کے آدمی ہیں تاہم انہوں نے چار ناول''''ہزار راتیں''۱۹۵۵ء''چاند کا داغ''۱۹۵۶ء''کھوٹا سکہ''۱۹۶۱ء اور''گرم راکھ''(غیر مطبوعہ) لکھے۔ان ناولوں کے علاوہ ان کا ایک ناولٹ''تین لڑکیاں ایک کہانی''بھی ہے۔

شینؔ مظفر پوری کے چار ناولوں میں''کھوٹا سکہ''ان کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے اردو کے فن کاروں اور صحافیوں کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔بقیہ تین ناول کم وبیش ایک ہی موضوع اور مواد

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

کوذرا مختلف واقعات اور کردار کے ذریعے پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔اس ناول سے متعلق طلحہ رضوی برق کے خیالات ملاحظہ ہوں :

''میرزا رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو ڈاکٹر خورشید الاسلام نے خاصے کی چیز کہا ہے ۔ جو بقول علی عباس حسینی ایک رنڈی کی کہانی اسی کی زبانی ہے۔اس وقت میرے سامنے شین مظفرپوری کا ناول ''کھوٹا سکہ'' ہے ۔ خورشید الاسلام کے الفاظ میں مستعار لے کر اگر میں اس ناول کو بھی خاصے کی چیز کہوں تو ایک بڑا دعویٰ ہوگا۔مگر دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔''

(نقد و سنجش ۔طلحہ رضوی برق۔ص ۱۶۵)

ناول ''گرم راکھ'' میں فلمی دنیا کی آوارگی اور جنسی بے راہ روی کو ہیروئن بینا کی زبانی پیش کیا گیا ہے ۔ ''چاند کا داغ'' ایک رومانی ناول ہے ۔جس میں سلطانہ کی ایک جنسی لغزش اور بے سہارا لڑکی کی عصمت فروشی کی دردناک داستان ہے ۔جو سماج کے مختلف طبقوں کی جنسی بے راہ روی اور عیاشی کو بے نقاب کرتی ہے۔ناول کی عظمت وافادیت کے سلسلے میں ٹریلنگ کہتا ہے:

''ناول کی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ قاری کو اخلاقی زندگی پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ حقیقت صرف وہی نہیں ہے جس کو اس کی رواجی اور رسمی تعلیم نے پیش کیا ہے ۔ بلکہ حقیقت کے اور بھی روپ ہیں۔''

(The Liberal imagination,p 222)

اس سلسے میں جی۔ایس۔فریسر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''ماضی کے عظیم ناولوں کے پیچھے جو بات انہیں عظمت دینے کے لئے کام کررہی ہے وہ اس زمانے کے ناول نگاروں کی اس وقت کے نظام سے آگہی تھی خواہ وہ نظام اچھا ہو یا برا،لیکن ایک نظام ضرور ان کے پیش نظر تھا، جس کی تائید یا تردید انھوں نے بھرپور انداز سے کی۔''

(بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست،ص۔۲۳۱)

اس پہلو سے اگر شین مظفرپوری کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں موجودہ نظام سے بے اطمینانی کا جذبہ بھرپور مقدار میں پایا جاتا ہے۔''ہزار راتیں'' ناول میں واضح طور پر ایک نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اس ناول کا مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لئے جو قوانین بنائے جاتے ہیں، اخلاقی

ISSN : 2582 - 3612

وعظ کہے جاتے ہیں، کمیشن بیٹھایا جاتا ہے، یہ ساری باتیں ریاکاری میں شامل ہیں۔اخلاص کے ساتھ معاشرے کو ان جرائم سے پاک کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ۔ بلکہ اس کاروبار کو جاری رکھنے میں قانون بنانے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے سب یکساں ملوث ہیں البتہ شین مظفرپوری کے یہاں کسی ایک نظم کی پُر زور تائید نہیں ملتی۔بقول آل احمد سرور :

''ناول زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی، جوانی کی تعبیر بھی ہے اور سب سے بڑھ کر تنقید بھی، مضمون نگار زندگی سے متعلق اظہار خیال کرتا ہے، ڈراما زندگی کو شعلے کی لپک اور لہو کی دھارا بنا کر پیش کرتا ہے مگر ناولٹ زندگی کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔زندگی کو دیکھنے کے بعد اسے دوسروں کو دکھانا بھی ناول نگار کا فرض ہے۔''

(تنقیدی اشارے۔ص ۱۰)

شین مظفرپوری نے زندگی کا بھرپور مشاہدہ کیا ہے،لیکن ان کا مطالعہ گہرا نہیں ہے۔اس لئے ان کے ناولوں میں زندگی کی پوری تصویر تو ہے لیکن بھرپور تنقید نہیں۔ ان کی ناول نگاری Rexwarner کے لفظوں میں پوری طرح ایک فلسفیانہ مشغلہ نہیں بن پاتا۔''چاند کا داغ'' ہو یا ''گرم راکھ''''ہزار راتیں'' ہو یا ''کھوٹا سکہ'' ان سبھی ناولوں میں ایک دلچسپ رومان ہے۔اس کو مزے لے کر پڑھا جاسکتا ہے،اس میں موجود نظام اخلاق سے ایک بے اطمینانی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔لیکن یہ سب افکار و نظریات، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں ڈھل کر فن کا روپ اختیار کرلیں پھر بھی ان میں اتنی بلندی اور گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔

شین مظفرپوری کے ناولوں میں زبان کی ناہمواری کی شکایت نہیں کی جاسکتی۔ان کے طرز تحریر میں پوری ادبی چاشنی پائی جاتی ہے۔کامیاب ماجرا نگاری ہوتی ہے۔لیکن واقعات سماج میں مضمر اقدار کی عکاسی کے لئے استعمال نہیں ہوتے،اس کے لئے جس فنی پختگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ شین مظفرپوری کے پاس نہیں ہے۔اختر اورینوی کے خیال میں بڑا ناول ایک فنکار سے انسانی زندگی کو وسیع طور پر پیش کرنے کی صلاحیت کا مطالبہ کرتا ہے۔لکھتے ہیں :

''نثری ادب میں ناول کی وہی اہمیت ہے جو شعری ادب میں رزمیہ کی ہے۔ناول ان معنوں میں رزمیہ نہیں کہ اس میں خصوصی طور پر لشکروں کی بزم آرائی ہو بلکہ ان معنوں میں رزمیہ کی مثل ہے کہ اس میں فنکار بڑے ارضیہ پر جیتی جاگتی، گونجتی گرجتی ، بولتی چالتی ،ہنستی روتی ،سوچتی بچارتی ،

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

چولے بدلتی، نئی نئی قماشیں بناتی اور بگاڑتی نیرنگ سامان زندگی کی تخلیق پیش
کرتا ہے۔''

(اختر اورینوی، تخلیق و تنقید، ص۔۱۲۹)

''ہزار راتیں'' کی ''منی''، ''گرم راکھ'' کی ''بینا'' اور ''چاند کا داغ'' کی ''سلطانہ'' ایک کامیاب نسوانی کردار ضرور ہیں۔ کیونکہ ان میں بلا شبہہ محض جنسی بے راہ روی اور کوٹھے کی داستان ہی نہیں بلکہ معاشرے کا سوز بھی ہے۔ فقط پائل کا جھنکار ہی نہیں، روح کی کسک بھی ہے۔ اس کے باوجود کردار نگاری میں میرزا رسواؔ کے امراؤ جان ادا والی بات پیدا نہیں ہوسکی۔

جہاں تک کرداروں کے طبقہ کا تعلق ہے، شیںؔ کے ناولوں میں بنیادی کردار پست طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ''ہزار راتیں'' کی ہیروئن منیؔ ایک ایسی لڑکی ہے جو فقیروں کی ٹولی میں فٹ پاتھ پر پلی ہے۔ ''گرم راکھ'' کی ہیروئن ایک معمولی گانے والی کی لڑکی ہے۔ ''کھوٹا سکہ'' کا ہیرو، مسعودؔ ایک غریب کسان کا لڑکا ہے۔ ان کے ناولوں کے ذیلی کردار ہر طبقے کی نمائندگی کرنے والے ہوتے ہیں۔ شیںؔ نسوانی کردار کو پیش کرتے ہوئے ان کے مزاج اور مخصوص نفسیات کی رعایت رکھتے ہیں۔ البتہ کرداروں کے مکالمے کی زبان میں کچھ زیادہ امتیاز قائم نہیں رکھتے۔

''کھوٹا سکہ'' شیںؔ کا آپ بیتی ناول ہے اور مسعودؔ کا کردار فنکار کی شخصیت کا بھرپور عکاس ہے اس لئے اس کی قنوطیت ایک گونہ فطرتی ہے۔ کیونکہ شیںؔ کی زندگی بھی کم وبیش اسی انداز سے گذری ہے اور فنکار کی زندگی کے شب و روز کا اثر اس کی تخلیق پر پڑنا ضروری ہے۔ شیںؔ کے ناول ''کھوٹا سکہ'' ہی نہیں بلکہ تمام ناولوں کا اختتامیہ المیہ ہے۔ ''ہزار راتیں'' کی ہیروئن کوڑا خانے پر ایڑی رگڑ رگڑ کر دم توڑتی ہے۔۔ ''چاند کا داغ'' کی ہیروئن کا انجام بھی المناک ہوتا ہے۔ ''گرم راکھ'' کی بیناؔ خودکشی کر لیتی ہے اور ''کھوٹا سکہ'' میں مسعودؔ اگرچہ زندہ ہے لیکن وہ اپنی زندگی کی لاش کاندھے پر ڈھوئے پھرتا ہے۔ ''کھوٹا سکہ'' کا اختتامیہ ملاحظہ ہو:

''اس کا وقت سے پہلے بوڑھا ہونے والا جفاکش باپ انگنائی کے کونے
میں کھڑے مسعود کے مرجھائے ہوئے چہرے پر موت کی پرچھائیں کانپتے
ہوئے دیکھ رہا تھا۔''

(W. Hazlitt.Prefeace Character, shakes pear's plays. page 198)

شیکسپیرؔ کے کرداروں کے بارے میں ہیزلٹ W. Hazlitt نے لکھا ہے:

''یہ صرف عہدوں، جنس، عمر اور محبت کے راز و نیاز کے پہلوؤں کی کردار

ISSN : 2582 - 3612

نگاری نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے یہاں بادشاہ سے لے کر فقیر تک، ہیرو سے
لے کر جیب کترے تک، دانشور سے لے کر احمق تک اپنی پوری حقیقت کے
ساتھ سامنے آتے ہیں۔''

یہ بات شیںؔ کے کرداروں پر بھی ایک حد تک منطبق ہوتی ہے۔ البتہ شیںؔ کے ناولوں کے پلاٹ میں تنوع نہیں ہوتا۔ پورے ناول میں ایک ہی پلاٹ ہوتا ہے جو ایک شخص کے واردات زندگی کو مفصل طور پر بیان کرنے کے لئے مرتب کیا جاتا ہے۔ ایک اچھے ناول میں ذیلی پلاٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ پلاٹ ایسے واقعات سے ترتیب دیا جاتا ہے جو بظاہر غیر اہم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے مرکزی قصے کو آگے بڑھانے اور اس کی پیچیدگی میں شدت پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

شیں کے ناولوں میں مرکزی پلاٹ ابتداء سے انجام تک مربوط اور مسلسل ہوتا ہے۔ کسی مقام پر اس کی رفتار میں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہ کمزوری پریم چندؔ کے بھی بعض ناولوں کے پلاٹ میں پائی جاتی ہے۔ ناول کے پلاٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اختر اورینوی رقمطراز ہیں:

''پلاٹ دراصل قصے کی ترتیب و تنظیم کو کہتے ہیں......صرف چند قصہ، اس
کا ربط و بے ربط اور بُرا بھلا انجام ہی پلاٹ نہیں۔ پلاٹ قصے سے زیادہ
شعوری، سلیقہ مندانہ، بالیدہ اور اعلیٰ چیز ہے۔ قصہ کچا مال ہے اور پلاٹ
بنا ہوا پکا مال۔''

(ماخوذ از مقالہ فن ناول نگاری اور نذیر احمد دہلوی، مطبوعہ معاصر، دسمبر ۱۹۵۷ء)

''ان کے قصوں سے جہاں ان کے یہاں قوت قصہ گوئی کا وجود ظاہر کرتا
ہے، وہاں سلیقۂ قصہ گوئی کی کمی معلوم ہوتا ہے۔''

(اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص۔۴۲)

شیںؔ کے ناولوں کے پلاٹ کا جائزہ لینے کے بعد فاروقی کا یہ تبصرہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے سارے ناولوں میں قصہ گوئی اکہری سطح پر پیش کی جاتی ہے۔ وہ کئی قصوں کو باہم پیوستہ کر کے پلاٹ کی تعمیر نہیں کر پاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصلاً افسانہ کے آدمی ہیں۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ بڑا نک سک سے درست ہوتا ہے۔ لیکن ناول کے پلاٹ کی تعمیر کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

مختصر یہ کہ شیںؔ مظفر پوری اپنے ناولوں میں مختلف قسم کی تکنیک کے استعمال کے طریقے بھی نہیں جانتے چنانچہ ان کے ناولوں میں زیادہ تر بیانیہ انداز ہی ملتا ہے۔ کہیں کہیں مکتوباتی ناول کے طرز پر خطوں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن جدید تکنیک یعنی شعور کی رو کا استعمال نہیں کرتے حالانکہ کردار کے شعور کی تہوں اور

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

لاشعور کی پرتوں کا مؤثر اظہار اسی تکنیک کے ذریعہ ہوتا ہے۔جیمس جوائس اپنے ناول میں اس تکنیک کو بڑی عمدگی اور فنکاری کے ساتھ برتتا ہے۔ اردو ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر بھی اس تکنیک کے استعمال میں مہارت رکھتی ہیں۔

شین مظفر پوری کے ناول میں جو چیز روح ڈالتی ہے وہ ان کا خلوص اور اسلوب ہے۔اپنے ناولوں میں انہوں نے اس زندگی کو پیش کیا ہے جس کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ بلکہ اس کے دکھ درد میں شریک رہے ہیں۔اسی چیز نے ان کے دل میں ایک کسک پیدا کی اور انہیں ایک تڑپ عطا کی۔اسی تڑپ اور کسک کی کارفرمائی ان کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔

جو زندگی ان کے حصے میں آئی وہ سماج کے متوسط طبقے کی زندگی ہے۔اس پر غور وفکر کرنے کے لئے قدرت نے جو ذہن عطا کیا وہ اوسط درجے کا ہے۔البتہ قلب بڑا حساس اور دل بڑا نازک ملا ہے اس لئے وہ اپنے ناول میں کوئی نیا تجربہ، کوئی چونکا دینے والا خیال، کوئی لازوال کردار نہ تراش سکے۔لیکن ان میں احساس کی نزاکت، ٹوٹے ہوئے دل کی کسک اور تجربے کی تلخی ضرور پائی جاتی ہے۔

انہوں نے جو کچھ پیش کیا بھرپور اخلاص کے ساتھ اسلوب کی پختگی کے ساتھ کیا جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔یہی چیز ان کے فن میں زندگی کا خون دوڑانے کے لئے کافی ہے۔

Dr. Tabassum Jahan
C./o.- Md. Islam
Zakaria Colony
Moh.- Sadpura
P.O.- Ramna
Muzaffarpur
Bihar

محمد شمیم عالم

افسانے کی صنفی خصوصیات : ایک جائزہ

افسانے کی صنفی خصوصیات کے ذکر کے پہلے میں افسانہ کیا ہے اس سلسلے سے مختصراً گفتگو کرنا چاہوں گا تاکہ اس صنف کے متعلق مزید معلومات فراہم ہوسکے۔ یہ حقیقت ہے کہ افسانہ انسانی زندگی کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ کیوں کہ انسان کے لئے کہانی کہنا اور سننا ابتدا سے ہی محبوب مشغلہ رہا ہے۔اس صنف کو مشرق اور مغرب میں مختلف ناموں سے جانا گیا۔مثلاً......کہانی، داستان، حکایت اور روایت وغیرہ۔

اردو افسانہ زندگی کے نامساعد حالات، معاشرتی افراط وتفریط جیسے مختلف پہلوؤں کی اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی دلچسپی سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔خواہ موضوع کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو افسانے کی اہمیت باقی رہتی ہے۔مختصر افسانہ کے حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں :

> ''ناول کی مانند مختصر قصے بھی پلاٹ، اشخاص، قصہ اور ماحول کی آمیزش سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن چوں کہ آخر الذکر قصوں کا وجود عدم صرف منٹوں پر موقوف ہوتا ہے اس لئے اختصار ان کا ضروری مقتضا ہے۔یہی سبب ہے کہ مختصر قصوں کے پلاٹ محض ایک موقع کا نقشہ ہوتے ہیں اور اشخاص قصہ مصنف کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں۔جن کو وہ جیسا چاہے نچا سکتا ہے۔مصنف کو قصہ لکھنے پر جو چیز ابھارتی ہے وہ صرف ایک مخصوص موقع کا اثر ہوتا ہے۔''

(دنیائے افسانہ، پروفیسر عبدالقادر سروری، ص-۱۳۲)

اختصار

جہاں تک ہمیں اس بات سے واقفیت ہے کہ اردو افسانے کی سب سے اہم خصوصیت اس کا اختصار ہے۔اس کی خاص وجہ ہے کہ مصروفیت بھری زندگی میں وقت کی عدم موجودگی کے سبب ضخیم کتابوں یا طویل کہانیوں کے مطالعہ کا وقت نہیں مل پاتا ہے۔اس لئے یہ کہا جائے گا کہ اس کی سب سے اہم خصوصیت اس کی اختصار نویسی ہے۔کیوں کہ ایک افسانہ کو مصروفیت بھری زندگی کے باوجود آدھ گھنٹے اور

ایک گھنٹے میں پڑھنے میں قارئین کامیاب ہوجاتا ہے اس پر اضافہ یہ کہ ایک افسانہ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے، لیکن اختصار نویسی کو افسانہ نگار ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ اس کی اختصار نویسی کے سلسلے سے عبدالمغنی فرماتے ہیں :

''مختصر افسانہ کہانی کے اختصار اور ارتکاز کا فن ہے۔ یہ قطرہ میں دجلہ یا جُز میں کل کا مشاہدہ ہے۔ زندگی کا ایک جلوہ معاملات کا کوئی ایک پہلو ماحول کا کوئی ایک منظر شخصیت کی کوئی ایک ادا مختصر افسانے کا موضوع ہے۔ اس کے ذریعہ کثرت میں وحدت کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ کسی ایک خیال یا مقصد کا اظہار ایک کہانی میں واضح اور درست طریقے پر کردیا جاتا ہے۔''

(تشکیل افسانہ عبدالمغنی، زبان وادب، اپریل تا جون ۱۹۸۸ء، ص-۱۷)

پلاٹ

افسانے کی اہم خصوصیت کے حوالے سے پلاٹ کے متعلق بھی گفتگو کرنی ضروری ہے۔

''پلاٹ کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ زندگی سے قریب ہوتا ہے۔ عام طور پر وہ واقعات جو ہماری زندگی میں آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں انہیں کو افسانے کا پلاٹ بنایا جاتا ہے۔ افسانے کے پلاٹ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے واقعے میں کہیں نہ کہیں کوئی رکاوٹ ضرور پیدا ہو۔ افسانے میں ہیجان اور کشش و پیچ کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اس میں کچھ مسائل کو سامنے لایا جاتا ہے۔ دراصل کشمکش ہی کی منزل میں افسانے کے کرداروں کو دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے کہ انہوں نے ان حالات و کیفیات میں اپنے آپ کو کس طرح سچا اور وفادار ثابت کیا یا کس طرح وہ ریاکاری اور بدنیت بن گئے۔ کشمکش کی یہ منزل طے ہونے کے بعد کہانی نقطہ عروج یا منتہا (Climex) تک پہنچ جاتی ہے ہر اچھے پلاٹ میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ واقعات کا ابتدا سے لے کر نقطہ عروج تک پہنچنا اور اس کے بعد موزوں اور موثر نتیجے پر ختم ہونا اسی ترتیب و تنظیم کا نام پلاٹ ہے۔''

(بہار میں اردو افسانہ نگاری، ڈاکٹر قیام نیر، ص-۳۹)

اسلوب

اردو افسانے کے لئے اسلوب کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے کیوں کہ سادہ، سلیس اسلوب بیان

ایک کامیاب افسانے کی اہمیت کا ضامن ہوتا ہے۔ اسلوب کو ابہام سے پاک ہونا بھی لازمی ہے۔ اس میں شائستگی، سلاست روانی اور شگفتگی بھی ہونا ضروری ہے۔ اس طرح بہترین اسلوب بہترین کہانی کی تعمیر کرتا ہے۔

کردار نگاری

جس طرح قصہ اور پلاٹ کی اہمیت افسانے کے لئے ضروری ہے اسی طرح کردار نگاری کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے سے اختر اورینوی فرماتے ہیں :

''صاحب نظر افسانہ نویس زندگی کی خاکستر میں چنگاریاں تلاش کرتے ہیں اور سنگ ریزوں میں گہر کی جستجو.................وہ اپنی قوت نفوذ و صلاحیت تعمیر سے انہیں سنگ و سنعاں سے فن کے شاہکار کی تشکیل کرتے ہیں۔''

(ماہنامہ پاسباں چنڈی گڑھ، افسانہ نمبر، ستمبر ۱۹۸۶ء، ص-۸۹)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ کردار نگاری افسانے کا ایک اہم جز ہے۔ کیوں کہ ایک افسانے کے ارتقائی سفر کے لئے کردار کی اشد ضرورت ہوتی ہے اور کرداروں کے حوالے سے ہی افسانہ نگار افسانے کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ جہاں تک افسانوی کردار کی بات ہے تو ایک افسانہ میں مرکزی کردار کا ہونا لازمی ہے۔ یہ مرکزی کردار مرد اور عورت دونوں شکل میں ہوسکتے ہیں۔ اس طرح مرکزی کردار کی اہمیت اس پہلو میں بھی مضمر ہے کہ اسی کردار کے گرد سارا قصہ گردش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ مرکزی کردار کی کامیابی پر افسانہ کی بقا کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کردار انسانی زندگی کی حقیقی تصویر کشی کرنے میں بھی کافی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مرکزی کردار کے علاوہ ذیلی کردار ہوتے ہیں۔ ان کرداروں کا اہم رول واقعات کی تکمیل میں ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان ذیلی کرداروں کے ذریعہ ہی مرکزی کردار اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ ذیلی کردار پورے افسانے میں تھوڑے وقفے کے لئے ہی آتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں خیال کیا جائے گا تو مرکزی کردار کی اہمیت میں رخنہ پیدا ہونے کی گنجائش زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے آسان لفظوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ ذیلی کردار مرکزی کردار کے تابع ہوتے ہیں۔

مکالمہ

اردو افسانے میں کرداروں کے جذبات یا یوں کہیں کہ افسانہ نگار اپنے نظریات و احساسات کی پیشکش کے لئے مکالمے کا سہارا لیتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کردار اپنا ارتقائی سفر اسی مکالمے کے ذریعہ طے کرتا ہے۔ کیوں کہ کرداروں کے عادات و خصائل پر مکالمہ کے ذریعہ ہی روشنی پڑتی ہے۔ واقعات کو

آگے بڑھانے میں بھی مکالمے کا اہم رول ہوتا ہے۔مختصر یہ کہ کرداروں کی خصوصیات اور ان کی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے مکالمے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔مکالمہ کا فطری ہونا بھی لازمی ہے۔کیوں کہ اس کا فطری پن قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔گھٹن سی محسوس نہیں ہوتی ہے۔اس لئے مکالمے میں سادگی اور برجستگی کا ہونا لازمی ہے۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکالمے کو بے ربط نہیں ہونا چاہئے۔بات سے بات اس طرح پیدا کی جائے کہ مختلف کڑیاں آپس میں ملی ہوئی معلوم ہوں۔ اس سلسلے سے ڈاکٹر سلام سندیلوی رقم طراز ہیں :

''مکالموں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ موقع محل کے مطابق ہو۔یعنی خوشی کے وقت پُرمسرت الفاظ منھ سے نکلے۔غم کے وقت لب ولہجہ غمگین ہو۔غصہ کے وقت غیض وغضب میں ڈوبے ہوئے کلمے نکلیں۔''

(ادب کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی،ص-۲۹۳)

مکالمہ کے لئے یہ ایک اہم شرط ہے کہ وہ جس کردار سے ادا ہو وہ اس کی شخصیت کو سامنے لانے میں معاون ومددگار رہو۔

منظر نگاری

افسانے کے لئے منظر نگاری خاص اہمیت رکھتی ہے۔اس سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ منظر نگاری کی خصوصیت افسانے کی اہمیت کو بڑھانے میں معاون و مددگار رہتی ہے۔مختصر یہ کہ ہر دور میں تحریر کردہ افسانے کا جب ہم مطالعہ کریں گے تب یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ منظر نگاری کے بغیر ایک بھی افسانہ نہیں تحریر کیا گیا ہے۔ اس بات سے منظر نگاری کی اہمیت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جائے گا کہ منظر نگاری نے افسانوں میں فن کی ایک ایسی خصوصیت پیدا کی ہے جس کی وجہ سے قارئین اس کی طرف خصوصی طور سے متوجہ ہوتے ہیں۔منظر نگاری کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ اس میں حقیقت کی چاشنی ہو مطلب یہ کہ اس منظر نگاری کی اہمیت باقی رہتی ہے جس میں افسانہ نگار کا مشاہدہ کارفرما ہوتا ہے۔سنی سنائی باتوں اوراَن دیکھے پہلوؤں پر منظر نگاری کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی ہے۔اس لئے بعض افسانوں میں ہمیں مقامیت کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے اس طرح ایسے افسانوں کی فضا آفرینی یا یوں کہیں کہ منظر نگاری زیادہ دلکش اور دلچسپی سے بھرپور ہوتی ہے۔

فنی ترتیب

فنی ترتیب افسانے کی خاص خصوصیت ہے۔اس کی بنیاد پر افسانہ نگار تمام اجزائے ترکیبی میں ربط وتوازن رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔اس فنی ترتیب کی بنیاد پر ہی ایک افسانہ موثر وکامیاب ہوتا ہے۔

ISSN : 2582 - 3612

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک افسانہ نگار فنی ترتیب کے وسیلے سے تمہید سے لے کر منظر نگاری تک ترتیب وتنظیم کو بنائے رکھتا ہے۔

وحدت تاثر

مختصر افسانے میں وحدت تاثر کی خاص اہمیت رہی ہے۔اس کی یہی خصوصیت اسے دوسری افسانوی صنف سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔منٹو نے بھی ایک تاثر کو ہی افسانہ تسلیم کیا ہے۔آپ نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ''ایک تاثر خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کر کے اس انداز سے بیان کردینا کہ وہ سننے والے پر وہی تاثر پیدا کرے وہ افسانہ ہے۔'' اسی لئے جب ہم افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ مختصر افسانے میں کوئی غیر متعلق بات بیان نہیں کی جاسکتی ہے۔کیوں کہ غیر متعلق بات افسانے کے تاثر کو مفقود کرنے کا ضامن بن جاتی ہے۔اس لئے بعض اہل قلم کا یہ نظریہ ہے کہ کہانی لکھنا گویا دیاسلائی کے تنکوں سے عمارت کھڑی کرنا ہے۔اس سلسلے سے راجندر سنگھ بیدی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے۔ایک افسانے میں ریاضت کی اشد ضرورت ہوتی ہے اس کی خاص وجہ ہے کہ غیر متعلق بات وحدت تاثر کو مجروح کردیتی ہے۔

خاتمہ

اردو افسانہ خواہ کوئی بھی موضوع پر تحریر کیا گیا ہو،لیکن اس میں دلچسپی کا عنصر غالب ہونا لازمی ہے، کیوں کہ افسانے کی تحریر کا بنیادی مقصد دلچسپی ہی ہوتا ہے۔اس سلسلے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

''سرخی تمہید اور تحریک کی طرح خاتمے کو بھی دلچسپ ہونا چاہئے تاکہ افسانے کی دلکشی جو سرخی سے تحریک تک قائم رہی ہے اس میں کمی نہ آجائے۔عام طور پر منتہا اور خاتمہ بالکل قریب قریب ہوتا ہے۔اگر منتہا اور خاتمہ کے درمیان زیادہ فاصلہ ہوگا تو افسانے کی دلچسپی ختم ہوجائے گی۔بعض افسانہ منتہا تک پہنچ کر بھی قارئین کے اشتیاق کو نہیں بڑھاتا ہے۔ایسے افسانے میں منتہا کے کچھ دیر بعد خاتمے کو لانا چاہئے تاکہ قارئین کو پوری طرح تشفی اور اطمینان ہوجائے۔پریم چند نے اپنے بعض افسانوں میں ایسا ہی کیا ہے۔اس لئے ان کے کچھ افسانے بے اثر ہونے کے باوجود قارئین کو پوری طرح مایوس نہیں کرتے۔افسانے کے خاتمے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہونی چاہئے کہ اس کو منتہا کے بعد ذرا بھی طویل بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔اگر ایسا ہوگا تو اس کے اثر میں بہت حد تک کمی آجائے گی۔بعض

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مصنف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ افسانے کا انجام مختصر اور سادہ ہونا
چاہئے، لیکن بعض مصنف اس بات کے خلاف اپنی رائے دیتے ہیں۔''
(بہار میں اردو افسانہ نگاری، ڈاکٹر قیام نیر، ص-٦٧)

تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جائے گا کہ اردو فسانے کی صنفی خصوصیات کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اس کے بغیر کامیاب افسانے کا تصور ممکن نہیں۔

Md. Shamim Alam
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur

عرفان اللہ خان

"ملاقاتیں" ایک جائزہ

"ملاقاتیں" ندؔا فاضلی کی نثر نگاری کا نادر نمونہ ہے۔ اس تصنیف سے انھوں نے اردو ادب کے قاری کو ایک نئے اسلوب نگارش اور انداز بیان سے آشنا کیا۔ ملاقاتیں 1986ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس تصنیف میں ندؔا فاضلی نے اہم شخصیات کے انٹرویو منفرد اور بے باک انداز میں قلم بند کیا ہے۔ وہ اپنی نوعیت کے انوکھے انسان اور ادیب تھے۔ اسی طرح ان کی تخلیقات بھی انوکھی ہیں۔

"ملاقاتیں" میں ندؔا فاضلی نے اردو کے مشہور ادبا و شعراء فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، کیفی اعظمی، ساحؔر لدھیانوی، باقر مہدی اور قاضی سلیم کا خاکہ کھینچا ہے۔ مذکورہ ادبی ہستیاں فلمی سطح پر بھی ندؔا فاضلی سے منسلک رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ سے انھیں دلی انسیت تھی تو کچھ سے ان کے رشتہ خوشگوار نہیں تھے۔ ان حضرات سے ہوئی ملاقاتوں کا عمدہ نقشہ اس تصنیف میں پیش کیا ہے۔

زندگی اُچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی	نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی

"ملاقاتیں" کا پہلا انٹرویو اردو کے مشہور شاعر رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھپوری کا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی پر کہے گئے مذکورہ شعر سے ندؔا فاضلی از حد متاثر ہیں۔ چنانچہ اسے مدنظر رکھتے ہوئے فراؔق کے شعری اوصاف پر وہ فرماتے ہیں :

"فراؔق نے زبان کو اپنے اظہار کے لئے ایک وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ خود زبان نے فراق کی تہہ در تہہ شخصیت کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ فراؔق کی شعری زبان کے ہر لفظ کی اوٹ میں ہندوستان کا تہذیبی مزاج کروٹیں لیتا محسوس ہوتا ہے۔ سوا روپے گز کے موٹے چوخانے کی قمیص، گریباں کا دوسرا بٹن ٹوٹا ہوا، سلا ہوا ڈھیلا پاجامہ، بکھرے ہوئے چھوٹے بال، قینچی کی سگریٹ....... اور دو آنکھیں ابھری ابھری، گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی................ آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم

عصرو!

جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراقؔ کو دیکھا تھا

(ملاقاتیں از ندؔا فاضلی، صفحہ 14)

فراقؔ صاحب نے دوران گفتگو ندؔا سے اختر الایمان سے متعلق اپنی رائے پیش کی تھی جسے انھوں نے اس انٹرویو میں شامل کیا ہے۔ جو ان کی بے باک رائے کا بین ثبوت ہے۔ ندا لکھتے ہیں :

"اختر الایمان کے یہاں ادبیت کی کمی ہے۔ ان کے ڈکشن میں ادبیت نہیں ملتی۔ ان کی آواز میں گہرائی نہیں ہے۔ میں ادبیت کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ ادب میں مزا ملنا ضروری ہے۔ اتنے ٹھس مصرعے اردو ادب میں کم ملیں گے۔ لیکن میں ان کی ادبی دیانت پر شک نہیں کر رہا ہوں۔ ان کے خیالات، انداز بیان سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو قابل قدر ہیں"

(ملاقاتیں از ندا فاضلی، صفحہ نمبر 17)

ندؔا فاضلی نے فراقؔ صاحب کی شعری خوبیوں اور اعلیٰ فکری خیالات کی بھی وضاحت اور تعریف اس انٹرویو میں کی ہے۔

علی سردار جعفری سے کسی دور میں ندؔا فاضلی کی ملاقات تقریباً ہر روز ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ ہر روز اسی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے تحریری کام انجام دیا کرتے تھے جس جگہ انھیں پہلی دفع بیٹھ کر لکھتے دیکھا تھا۔ علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اپنی تخلیقات بھی قلم بند کیں جن میں ترقی پسند ادب کا ذکر ندؔا نے یہاں کیا ہے۔ اس تصنیف میں علی سردار جعفری نے مواد کی اہمیت پر جس طرح زور دیا ہے اس بات پر بھی وہ معترض ہیں۔ ترقی پسند ادب کے دیباچے میں علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"ہم عصر ادیبوں پر تنقید کرنے سے زیادہ مشکل کوئی دوسرا کام نہیں ہے اور اگر مصنف خود بھی ادیب ہے تو مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے"۔

(ملاقاتیں از ندا فاضلی صفحہ نمبر 31)

علی سردار جعفری کے لب ولہجہ سے ندؔا فاضلی بہت متاثر تھے۔ ان کا حلیہ ہو یا سراپا ندؔا کے لیے باعث کشش تھا۔ اس انٹرویو میں ایک مقام پر رقم طراز ہیں :

"سردار جعفری بنار کے بولتے رہتے ہیں۔ وہ گفتگو کے دوران ہی کچھ لفظوں کو روک لیتے ہیں۔ کہیں کہیں جملے کم زیادہ کر دیتے ہیں۔ کبھی آواز کی ہلکی تبدیلی سے معنی میں خاطر خواہ تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر یہ عمل در پردہ ان

کے ذہن میں ہی چلتا رہتا ہے۔ سننے والے کو نہ باتوں کا بہاؤ ٹوٹتا نظر آتا ہے اور نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بولتے وقت اتر، دکھن، پورب، پچھّم چاروں دشاؤں کو ٹٹول رہے ہیں۔"

(ملاقاتیں از ندؔا فاضلی، صفحہ نمبر 31)

اختر الایمانؔ کے انٹرویو کا آغاز ندؔا فاضلی نے بہت ہی انوکھے انداز میں کیا ہے۔ ندؔا صاحب کا تصور انھیں اختر الایمان کے فلیٹ سے سیدھے ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ انٹرویو کا تمہید یہ ملاحظہ فرمائیے :

"اسٹیل کی قینچی، موم کی گڑیا، جامع مسجد کا مینار، بیل گاڑی کے پہیئے، لمبی لمبی پدراہیں، سوکھی ہوئی ببول، گہرے غار، نرم مٹی، سفید اون کے لچھے، چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر دیر دیر تک رکتی پسنجر ٹرین............ میرا جی چاہتا ہے کہ ان تمام مختلف چیزوں کو ایک گول گھیرے میں بند کر کے اس پے اوپر ایک نام لکھ دوں-----------"اختر الایمان"۔

(ملاقاتیں از ندا فاضلی، ص نمبر 37)

اختر الایمان کی مشہور زمانہ نظم "ایک لڑکا" کا تذکرہ بھی اس ملاقات میں کیا گیا ہے۔ اس نظم کے متعلق ندؔا فاضلی تنقیدی انداز میں لکھتے ہیں :

"اخترؔ صاحب، یہ طفل آرزو کا ماتم جو اس نظم میں کیا گیا ہے۔ یہ وہی لڑکا تو نہیں ہے جو رات کے ایک بجے نیند سے جھنجھوڑ کر آپ کا نام پوچھا کرتا تھا۔ وہ لڑکا پوچھتا ہے اخترؔ الایمان تم ہی ہو۔"

اخترؔ الایمان نے سردار جعفری کے متعلق ندؔا فاضلی سے کہا تھا کہ اکیلے میں سردار صاحب ان کی نظموں کی تعریف کیا کرتے ہیں مگر جب لکھنے کا وقت آتا ہے تو دانستہ طور پر انہیں فراموش کر دیتے ہیں اس بات کا بھی ذکر ندؔا نے ملاقات میں کیا ہے۔ نیز اس وقت کے دیگر ابھرتے نقاد اور ان کی آراء پر بھی اختلاف رائے پیش کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس اردو ادب میں اپنا ایک منفرد اور اہم مقام رکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب بھی ندؔا فاضلی کی طرح ہی فلموں سے وابستہ رہے اور شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ ندا فاضلی اور عباس صاحب کی باہمی گفتگو اور بحث اس ملاقات کے کچھ حصوں میں انتہائی ادبی معیار کی گفتگو بن کر ابھرتی ہے ساتھ ہی ساتھ عالمی ادب پر بھی یہاں بحث کی گئی ہے۔ عباس صاحب ایک ادیب ناول نگار، فلم کی کہانیاں لکھنے

والے، ایک صحافی، اسکرپٹ رائٹر، ڈائریکٹر، فلمی میگزین کے رائٹر، انگریزی اور ہندی زبانوں میں بھی تحریری کام کرنے والے ایسے ادیب ہیں جنھوں نے اپنے ذمہ کئی کام اٹھا رکھے ہیں انھیں پوری دیانت داری سے مکمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ندا فاضلی نے ان کی مصروفیات کے متعلق اس انٹرویو میں پرخلوص انداز میں خواجہ صاحب کی تعریف کرتے ہیں وہیں دوسری جانب خواجہ صاحب کے تمام کاموں کو سطحی بتاتے ہیں بنا کسی جانب داری کے :

"عباس صاحب ادب سے سیاست اور فلم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن ہر جگہ وہ ٹکڑا ٹکڑا ہی نظر آتے ہیں۔ کہیں بھی پوری شخصیت کی جھلک نہیں نظر آتی۔ مختلف شعبوں میں اپنے آپ کو بانٹ کر، عباس صاحب نے اپنی مصروفیات تو ضرور بڑھا لیں، مگر کہیں بھی وہ متعلق شعبوں کے معیارات پر پورے نہیں اترتے۔ ہر جگہ وہ محض تماشائی کی طرح رپورٹنگ ہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظریں اشیاء کی اندرونی تہوں میں اترنے کے بجائے ان کے اوپر ہی خدوخال کو پڑھ کر لوٹ آتی ہے۔''

(ملاقاتیں از ندا فاضلی صفحہ نمبر 56-55)

نیز راجندر سنگھ بیدی کی " گرم کوٹ "، کرشن چندر کی " آدھے گھنٹے کا خدا"، ملک لندن کی کہانی --- جو لینن مرتے وقت پڑھ رہے تھے وغیرہ ادبی کہانیوں پر بھی یہاں بحث کی گئی ہے۔

" جاں نثار اختر "اس تصنیف میں شامل دس شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ان کی شخصیات سمٹی ہوئی، کھوئی ہوئی اور خاموش ہے۔ اکثر مشاعروں میں ہلکی سی نیند کے عالم میں آتے۔ ندا فاضلی نے انھیں پہلی دفع رتلام کے مشاعرے میں کلام پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ جاں نثار اختر کی شاعری ندا فاضلی نے ایک زاویہ نظر سے دیکھی اور پرکھی۔ ان کی شاعری کی چند خوبیاں بیان کرتے ہوئے ندا صاحب رقم طراز ہیں :

"جاں نثار کی شاعری اس دنیا کی سیاحت کے دلچسپ داستان ہے۔ جسے وہ بار بار نئے انداز سے دہراتے رہتے ہیں۔ اس داستان کے مرکزی کردار تو اپنی چال ڈھال کے اعتبار سے روایتی ہی ہیں۔ حسن کا وہی روپ جو فارسی سے ہوتا ہوا اردو میں آیا ہے۔ عشق کے بھی وہی روایتی تیور جو اختر شیرانی اور جوش سے ہوتا ہوا ان تک پہنچے ہیں۔"

قدموں میں ہے آج تختِ جمشید
ٹھوکروں میں ہے آج تختِ طاؤس

اے دوست ترے بغیر کیا ہے
یہ نام و نمود و ننگ و ناموس

(ملاقاتیں از ندا فاضلی، ص نمبر، 75)

ممبئی میں آئے ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود جاں نثار اختر کے ذہن میں گوالیار اور بھوپال کی یادیں تروتازہ ہیں۔ چنانچہ وہ ممبئی کی بھاگتی دوڑتی صنعتی زندگی سے پوری طرح وابستہ نہ ہو سکے تھے۔ اس بڑے شہر کی مصنوعی زندگی انھیں کئی مرتبہ بیزار کر دیتی ہے جس کا ذکر انھوں نے ندا فاضلی سے بھی کیا تھا جسے ندا صاحب نے اس انٹرویو میں جاں نثار اختر ہی کے الفاظ میں قلمبند کیا ہے :

"یہ درست ہے، میں پچھلے سترہ سال سے ممبئی میں مقیم ہوں۔ لیکن آج بھی ممبئی اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ باندرہ سے دادر تک چلے جایئے، ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا جو آپ کو جانتا ہو۔ اس کے برعکس گوالیار اور بھوپال اتنی مدت کے بعد بھی اب تک اپنے سے لگتے ہیں۔ جدھر بھی نکل جایئے جانے پہچانے راستے اور مانوس چہرے نظر آتے ہیں۔ سماج میں ہمارے آپسی رشتے فن پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ چھوٹی بستیوں میں جو خلوص ہوتا ہے...... "وہ پختہ مکانوں میں نہیں"۔ بڑے شہروں میں کہاں میسر۔ وہ مروتیں، وہ شرافتیں، وہ تہذیب یہاں نہیں ملتی۔"

(ملاقاتیں از ندا فاضلی، ص نمبر 82)

علی جواد زیدی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ جنگ آزادی کے مجاہدین میں بھی شامل رہے ہیں۔ ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کے دور کو بھی انہوں نے دیکھا ہے اس انٹرویو میں ترقی پسند تحریک، انقلاب، آزادی اور بدلتے شعری رجحانات پر گفتگو کی ہے۔ جس سے ہمیں اس دور کی ادبی فضا اور بدلتے ادبی تقاضوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ نیز اس ملاقات میں جوش ملیح آبادی جیسے شاعر انقلاب، جاں نثار اختر کی شاعری کے متعلق بھی بحث کی گئی ہے۔ جوان دونوں شعراء حضرات کی ادبی حیثیت نمایاں کرتی ہے۔ شعر و شاعری کی دنیا میں آنے والے تغیر اور تبدیلی کو بھی اس انٹرویو میں موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ درج اقتباس ملاحظہ کیجئے :

"ادھر کچھ تبدیلی ضرور ظاہر ہو رہی ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کس سے متاثر ہے۔ اور خود نئے شاعر کس کس حالات کے بدلنے کے ساتھ سوچ کے زاویے بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی میں آفاقی رجحانات، یورپی

ادب اور ہندستان کی دوسری زبانوں کی قربت اور ان کے مطالعہ کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔"

(ملاقاتیں، انٹرویو، علی جواد زیدی، ندؔا فاضلی، ص نمبر 98)

کیفی اعظمی کی شخصیت کا بڑا ہی دلچسپ خاکہ ندؔا فاضلی نے "ملاقاتیں" میں پیش کیا ہے۔جس سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوجاتے ہیں۔ندا فاضلی تحریر فرماتے ہیں:

کیفؔی اعظمی سے مل کر نہ جانے کیوں گوالیار کا وہ خاموش علاقہ یاد آجاتا ہے جہاں شام کو شہر کے شور وغل سے بچ کر میں اکثر گم سم بیٹھ جاتا تھا۔دور دور تک بولتی ہوئی خاموشی، دھندلکا اور آسمان... کیفؔی کی شخصیت جس میں ان کی آواز کا ارتعاش، بولوں کی بے ترتیبی کی ترتیب اور اسٹیج ایکٹنگ کا تجربہ بھی شامل ہے، ایک عجیب قسم کی غنائی کشش محسوس ہوتی ہے۔"

(ملاقاتیں، کیفی اعظمی از ندؔا فاضلی، ص نمبر،103-102)

نئی شاعری کے متعلق کیفؔی اعظمی اور ندؔا فاضلی کی گفتگو قابل توجہ ہے۔کیفؔی اعظمی اکثر شعراء کے متعلق اپنا ایک روایتی رویہ رکھتے ہیں۔ندؔا فاضلی کے سوال کے جواب میں کیفؔی اعظمی اپنے پسندیدہ شاعروں کے نام کچھ اس طرح بتاتے ہیں :

"میں اپنے معاصرین شعراء کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔لیکن جن کی نظمیں مجھے اکثر پسند آتی ہیں۔ان میں فیضؔ، سردارؔ، مجروؔح اور ساحؔر خاص ہیں۔ وہ شاعر بھی جو تحریک سے متعلق نہیں مثلاً جگؔر، آنند نارائن ملا بھی مجھے پسند ہیں۔یہی بات نئے شاعروں پر صادق آتی ہے۔جن کی نظمیں میں نے پڑھی ہیں ان میں ندؔا فاضلی، قاضی سلیم، شہر یاؔر (جہاں سمجھ میں آتے ہوں عمیقؔ حنفی) اور پاشؔی (دو تین نظمیں) کی شاعری مجھے پسند ہیں۔"

(ملاقاتیں از ندا فاضلی ،ص نمبر 114-113)

ندؔا فاضلی کے اس تحریر سے کیفؔی اعظمی کی شخصیت قاری کی نظروں میں روشن ہوجاتی ہے۔کیفؔی خاموش طبیعت کے مالک تھے انہوں نے اپنے اردگرد ایک حالہ بنالیا تھا جسے ندؔا فاضلی عبور کرنے کی بے جا کوشش کیا کرتے تھے جس کا ذکر انھوں نے اس انٹرویو میں بھی کیا ہے۔

ندؔا فاضلی نے اس تصنیف میں ساحؔر لدھیانوی کا بھی انٹریو شامل کیا ہے۔ندؔا اور ساحؔر کے رشتہ

شروعاتی دور سے ہی تلخ و ترش رہے ہیں۔کئی جگہوں پر ندؔا فاضلی کی موجودگی ساحؔر کو کھٹک جاتی تھی یہی سبب ہے کہ فلمیں ہوں یا مشاعرے ساحر نے ندؔا فاضلی کی راہوں میں کانٹے بکھیرے ہیں جس کی تفصیلی معلومات ندؔا فاضلی کی زندگی سے متعلق مطالعے سے حاصل ہوتی ہے۔اس انٹرویو میں ساحؔر کی ندؔا فاضلی نے مغرور شخصیت کو ابھارا ہے۔ندؔا فاضلی تحریر فرماتے ہیں:

"دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہہ کر اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر کے بلا مقصد چکر کٹوا کر انھیں اب سکون بھی ملتا ہے۔ساحؔر کے پاس جو بھی کسی کام کیلئے جاتا ہے، کبھی مایوس نہیں لوٹتا مگر جھوٹے وعدے کرنا اور مہینوں دوسروں کو ان میں الجھائے رکھنا ان کی مخصوص ہابی بھی ہے۔ان بے مقصد چکر کاٹنے والوں کی مجبوریوں سے وہ نئے نئے لطیفے تراش کر اپنی شام کی محفلوں کو رنگین بھی بناتے ہیں۔ساحؔر کو اپنے ہاتھ سے پیسہ دینے میں مزہ آتا ہے۔لیکن اگر کہیں کسی کا روزگار لگ رہا ہو تو اس میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لطف کو بھی وہ کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔"

(ملاقاتیں از ندا فاضلی ،ص نمبر 118-117)

ساحر لدھیانوی کی تلخیاں اور پرچھائیاں کا ذکر ندؔا صاحب نے یہاں کیا ہے۔حالانکہ ان کے نزدیک ساحؔر کی شاعری فیضؔ کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ ندؔا فاضلی اور ساحؔر لدھیانوی الگ الگ کناروں پر کھڑے دو ایسے شاعر ہیں جن کے درمیان دولت اور شہرت کی ایک خلیج ہے جس کے سبب دونوں ایک دوسرے کو نہ مخلصانہ طور پر سراہتے ہیں اور نہ ہی پسند کرتے ہیں۔حالانکہ دونوں ہی شخصیات اپنی اپنی خوبیوں اور خصوصیات کی بنا پر ادبی اور فلمی دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔اس انٹرویو میں ندا فاضلی کی قلم سے ساحر لدھیانوی کے لئے مشکل سے کوئی تعریفی جملہ نکلا ہو گا۔ان کے باہمی رشتے کی کرواہٹ اس انٹرویو میں صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

باقر مہدی سے ندؔا کو دلی رغبت ہے۔ندؔا فاضلی اور باقر مہدی نے زندگی کے سخت ترین دنوں میں ممبئی کے بھائی کلہ کے پل پر بیٹھے بیٹھے کئی راتیں ساتھ میں فاقہ کشی کے ساتھ گزاریں۔ندؔا فاضلی کو باقر مہدی سے ایک شکایت ضرور تھی کہ باقر ضرورت سے زیادہ ہنسا کرتے تھے۔جن کا ذکر انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے :

"ساحؔر اور جاںؔ نثار نے الیکشن کے دنوں میں کانگریس کی شان میں گیت لکھے ہیں اور باقر ہنس رہے ہیں۔ندؔا فاضلی نے صبح سے کھانا نہیں کھایا اور

باقر ہنس رہے ہیں ،عادل منصوری تبلیغی جماعت میں شامل ہو گئے اور
باقر ہنس رہے ہیں۔اسرائیل وعرب کی جنگ میں سیکڑوں عرب بے گھر ہو
گئے اور باقر ہنس رہے ہیں۔باقر خدا جانے کب تک اسی طرح ہنستے رہیں
گے۔کتنی نوکیلی اور کانٹے دار ہنسی ہے یہ...... میراجی چاہتا ہے میں کسی
طرح باقر کے اندر جھانک کر دیکھوں...... کہیں کچھ بچا بھی ہے یا سب
کچھ اسی طرح قہقہوں میں گھل گھل کر ختم ہو چکا ہے۔"

(ملاقاتیں،انٹرویو،باقر مہدی از ندافاضلی ص نمبر 133)

باقر مہدی کے شعری محاسن بیان کرتے ہوئے ندافاضلی ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"باقر مہدی زندگی اور آرٹ نقاب پہننے کے خلاف ہیں اور یہی ان کی پہچان
ہے۔کالے کاغذ کی نظمیں (باقر مہدی کا نیا شعری مجموعہ) کے صفحات ان کی
شخصیت کے اسی پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں۔یہ شاعری اجنبیوں کی بھیڑ
میں گھرے ہوئے ایک ایسے باہری آدمی (Out sider) کی کربناکیوں
کی دستاویز مرتب کرتی ہے جو ایک قرب سے دوسرے قرب تک لگاتار سفر
کرتا رہتا ہے۔"

(ملاقاتیں،باقر مہدی از ندافاضلی ،صفحہ نمبر 135)

باقر مہدی نے ایک عام انسان کی زندگی گزاری اور اسی زندگی کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔قاضی سلیم کا انٹرویو "ملاقاتیں" کا آخری انٹرویو ہے۔قاضی سلیم ایک شاعر کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی فعال ہیں۔مگر ان کے سر درد نے ان کی شخصیت کو Disturb کر دیا ہے۔جس کے سبب وہ بولتے کم اور سنتے زیادہ تھے۔قاضی صاحب کے متعلق ندا لکھتے ہیں کہ انھیں ہر روز سر درد کی گولی کھانی پڑتی تھی۔قاضی صاحب کی نظم نگاری کے سلسلے میں ندا فرماتے ہیں :

"قاضی سلیم کے سر میں جس دن درد زیادہ ہو، وہ اس دن کوئی نظم ضرور کہتے
ہیں۔ان کی بیشتر نظموں نے چلتی ہوئی ٹرین میں جنم پایا ہے۔قاضی سلیم کی
ایک نظم کے چند مصرعے ہیں۔

ایک پھر دوسری اور اب تو پیہم
گھڑ گھڑاہٹ کی مسلسل چوٹیں

میرے اعصاب پہ پڑنے لگیں
تب ریل کی رفتار بڑھی

(ملاقاتیں،قاضی سلیم از ندافاضلی ،ص نمبر 146)

جدیدیت، ماکسزم اور نئی شاعری اس دور کے ایسے رجحانات ہیں جن کا دامن تقریباً ہر شاعر نے کم وبیش تھاما ہے۔ان رجحانات کے متعلق قاضی سلیم فرماتے ہیں:

"ہر نئے رجحانات کے ساتھ شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ابھی نئی شاعری کو
صرف ۱۵/سال ہوئے ہیں۔اتنی جلدی کوئی روایت نہیں بنتی۔ہم یوں بھی
روایت کے خلاف ہیں۔جدیدیت سے مراد مارکسزم کی مخالفت ہرگز نہیں۔
اردو کے کئی جدید شاعر اپنے فکری پس منظر میں مارکسزم سے زیادہ قریب
ہیں۔جیسے باقر مہدی ،وحید اختر ،ندافاضلی اور حسن کمال۔میں سوشلسٹ
جمہوریت کا قائل ہوں۔بات یہاں فکریاتی نظریوں کی نہیں ، بلکہ باشعور
شخصیت کے اظہار کی ہے۔فنکار ہمیشہ اپنے سے ایماندار ہوتا ہے۔وہ صرف
اطراف کے ماحول سے اپنے انفرادی ردعمل کی سمتیں متعین کرتا ہے۔ "

(ملاقاتیں انٹرویو قاضی سلیم از ندافاضلی صفحہ نمبر۔149)

غرض یہ کہ "ملاقاتیں" میں موجود سبھی شخصیات کسی نہ کسی طور پر ندا سے وابستہ رہی ہیں۔انھوں نے بے ساختہ اور صاف شفاف طور پر ان شخصیات کے متعلق گفتگو کی ہے۔یہ ندافاضلی کا سحر طرز اسلوب ہے جس نے "ملاقاتیں" کو شہرت دوام بخشی ہے۔ندافاضلی کا قلم، دوست و رقیب کے درمیان فرق نہیں کرتا۔وہ بغیر کسی جانبداری کے اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ان کی فکری قوت اور زور قلم نے ہی انہیں فراق،علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی جاں نثار اختر وغیرہ جیسی اہم شخصیات پر قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ندافاضلی روشن خیال فنکار ہیں۔جن کے شاہکار کارناموں سے اردو ادب اور فلمی دنیا دونوں مستنیر و مستفید ہیں۔

Irfanullah Khan
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Govt. Madhav P.G. College
Vikram University
Ujjain (M.P.)

زمرودہ محمد میر

جموں وکشمیر میں اردو شاعری...ایک مطالعہ

اردو زبان سے متعلق ہم سب واقف ہیں کہ یہ جدید ہند آریائی زبان کی ایک شاخ ہے جو مختلف روپ اور ناموں سے اپنا لسانی سفر طے کرتی آئی ہے۔اردو کا یہ لسانی سفر دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح علاقائی اور جغرافیائی حد بندیوں کو عبور کر کے ایک آفاق گیر وسعت کا حامل ہے۔اردو کی ابتداء اور ارتقاء میں کسی فرد، قوم، خطہ یا کسی مخصوص گروہ کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ یہ برصغیر میں مشترکہ لسانی اور سماجی کوششوں سے وجود میں آئی ہے اور ارتقاء کی منزلیں طے کرتی رہی۔اس لئے اردو کو عوامی زبان یا گنگا جمنی زبان بھی کہا جاتا ہے۔اردو زبان کی گنگا جمنی کردار پر ڈاکٹر اتم اہلووالیہ لکھتے ہیں :

> ''اُردو زبان کا تعلق کسی ایک خطے یا قوم سے نہیں جوڑا جا سکتا یہ ایک ایسی زبان ہے جو لسانی خصوصیات ،محاوراتی انداز بیان ،تہذیبی کشش اور ادبی چاشنی کے سبب اپنی طرف متوجہ کرتی ہے بلا شبہ اُردو ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اُردو زبان ہندوستانی ادب عالیہ میں قومی وحدت اور تہذیب کی علامت کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔اُردو زبان کے شعری سرمایہ کے فروغ میں کسی ایک فرد واحد یا کسی صوبے کا ہاتھ نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر فرد اور ہر ریاست نے اس کو اپنی خون جگر سے سینچا ہے۔''

اب اگر جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کی باتیں کریں تو پہلے مختصر انداز سے یہاں کا تعارف پیش کرنا مفید رہے گا اور اس کے بعد مرکزی موضوع پر گفتگو ہوگی۔

جموں وکشمیر کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ یہ خطہ نہ صرف اپنے فطری مناظر کی وجہ جنت نظر کہلاتا ہے بلکہ علم وادب کا گہوارہ بھی رہا ہے ۔ مجموعی طور پر اگر یہاں کے ادبی سرمائے کی بات کریں تو یہاں پر سنسکرت، کشمیری، گوجری، پہاڑی، فارسی وغیرہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تخلیق شدہ ادب کا قابل قدر سرمایہ موجود ہے، چونکہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان سے پہلے سرکاری سطح پر فارسی زبان کا

ISSN : 2582 - 3612

دور دورہ تھا لیکن ڈوگرہ حکومت کے سرپرستی میں ریاست کے طول وعرض میں نہ صرف اردو زبان کا پھیلاؤ ہوا بلکہ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور اقتدار ۱۸۸۹ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا۔اس طرح سے ایک طرف یہ زبان ریاست کے تین خطوں جموں، کشمیر اور لداخ میں عوامی رابطے کی زبان بن گئی تو دوسری جانب اس میں مقامی تخلیق کاروں کی تخلیقات وتحریرات بھی سامنے آنے لگیں۔ابتدا میں اگرچہ انشاء پردازی اور شاعری کی طرف توجہ دی گئی لیکن آہستہ آہستہ افسانہ لکھنے کا باضابطہ آغاز ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فکشن خصوصاً افسانہ نگاری کا یہ رجحان رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔اس طرح سے عصر حال تک جموں وکشمیر اردو کا ایک دبستان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔جموں وکشمیر کی ثقافتی وسماجی تعلقات اردو زبان کی وجہ سے مضبوط ہے۔اب اگر جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کی تحقیق پر نظر دوڑائیں تو مجموعی طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ ریاست میں اُردو زبان نے ریاست کے تینوں خطوں میں اپنی موجودگی کو بہت جلد استحکام عطا کیا۔ پروفیسر حامدی کاشمیری ریاست میں اردو زبان کے استحکام کے تعلق سے لکھتے ہیں :

> ''اردو کا جہاں تک تعلق ہے وہ ریاست میں اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں متعارف ہوئی۔اس زمانے میں ریاست پر ڈوگرہ راجاؤں کی حکومت تھی اور کئی حالات ایسے پیدا ہوئے تھے جو ریاست میں اردو کو روز بروز مقبولیت حاصل کرنے اور یہاں کی سماجی، سرکاری اور تہذیبی زندگی میں قدم جمانے میں سازگار ثابت ہوئے۔''

جموں وکشمیر اور اردو کے اس مختصر تعارف کے بعد اب یہاں کی ادبی خدمات کی طرف آئیں گے۔جہاں تک جموں وکشمیر میں اردو شعر وادب کی ابتدا، ارتقاء اور خدمات کا تعلق ہے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ جموں وکشمیر کے بغیر اردو ادب کی کوئی بھی تاریخ نامکمل ہی قرار دی جا سکتی ہے۔کشمیر سے جن مشہور شعراء وادباء کا نسبی تعلق رہا ہے ان میں دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، آغا حشر کاشمیری، چرغ حسرت چراغ، محمد الدین فوق، علامہ اقبالؔ، چکبست، علامہ کیفی وغیرہ شامل ہیں۔یہ ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے اردو زبان وادب کی وسعت اور ارتقاء میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔جموں وکشمیر میں اردو شعراء کی ایک کثیر تعداد نظر آتی ہیں جو نہ صرف اردو زبان کا استعمال کرتے آئے ہیں بلکہ فنی طور پر اپنے فکر وخیال کی ترسیل کا وسیلہ بھی اردو زبان کو ہی بنایا۔میر غلام رسول نازکی، شہ زور کاشمیری، تنہا انصاری، طالب کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، دینا ناتھ مست، منوہر لال دل، شوریدہ کاشمیری، غلام طاوس، سمیل پوری، عبدالحق برق، سیفی سوپوری، عشرت کشتواڑی، اکبر جے پوری، غلام علی بلبل، عرش صہابی، قیصر قلندر، رسا جاودانی اور پنڈت کیلاش ناتھ کول میکش کاشمیری، حامدی کاشمیری، حکیم منظور، قاضی غلام محمد، مظفر ایرج، شبیب رضوی، سلطان الحق شہیدی،

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

عابد مناوری، شجاع سلطان، فاروق مضطر، رفیق راز، محمد یاسین بیگ، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بے تاب، رخسانہ جبین نے تخلیقیت کو فروغ دیا۔ان شعراء کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں کہ ''اِن شعرا کا فنی شعور زیادہ پختہ اور رچا ہوا ہے۔ اِن کے موضوعات میں زیادہ فکری گہرائی ہے، بیانیہ نظموں کے ساتھ ساتھ فکری اور داخلی موضوعات پر بھی متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اِن میں اکثر کے شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔''٦

اختصار کے ساتھ چند اہم شعراء کا ذکر نفس مضمون کے مطابق یوں ہے۔طالب کاشمیریؔ کا شمار کشمیر کے صاحب دیوان شعراء میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں قومی' سیاسی' وطنی'مذہبی اور رومانی موضوعات ملتے ہیں۔ان کی شاعری پر اپنے تاثرات میں علامہ کیفی دہلوی فرماتے ہیں کہ ان کے کلام میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر طرز میں اپنا رنگ جما سکتے ہیں۔احساسات قلبی کی تصویر کھینچے میں ان کو کمال کا درجہ حاصل ہے یہی حقائق نگاری ہے۔علامی کیفی کی ان باتوں کی عکاسی طالب کشمیری کے درجہ ذیل اشعار سے بخوبی ہوتی ہے۔

میں آغوش تنہائی میں سرمست تصور رہتا ہوں　　خود گوش ہوش سے سنتا ہوں جب غم کی باتیں کہتا ہوں
میری آنکھوں میں حسن یار کی تصویر پنہاں تھی　　تو میرے روکنے سے پاسباں کے ہاتھ کیا آتا

طالبؔ کشمیری چونکہ کشمیر کے باسی تھے تو ان کے کلام میں بھی کشمیر کے حسن اور رعنائیوں کا دلکش انداز نظر آتا ہے جیسے نظم ''بہار کشمیر'' نامی نظم کا یہ بند دیکھیں۔

چھائی ہوئی گھٹائیں گھنگھور آسماں پر　　برسا رہی تھیں موتی ابر بہار ہوکر
سروسہی کی شاخیں تھیں جھومتی ہوا سے　　یا کوئی لڑکھڑاتا تھا بادہ خوار ہوکر

طالب کشمیری کی جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں ''کلام طالب''،''مرقع افکار''،''سرمایہ کلام'' طالبؔ کشمیر کا کلام قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ان کے سوانحی حیات اور بیشتر کلام درجہ ذیل تذکروں اور رسائل و جرائد میں چھپ چکا ہے:

''بہار سخن''،''بہار گلشن کشمیر''،''ہندو شعراء''،''ادب لطیف''،''آجکل''،''
ادبی دنیا''،'' انقلاب''،'' رہنمائے تعلیم''،'' زمانہ''،''ساقی''،'' شاعر''،''
محقق''،''معیار سخن'' وغیرہ

کرشن سیمل پوری (پیدائش ۱۹۰۱ء) جموں کے رہنے والے تھے۔شاعر کے ساتھ ساتھ صحافی بھی تھے۔ان کی ادارت میں ایک ماہنامہ ''جنت'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا۔کشن کمار کے کلام میں روایت کا اثر ملتا ہے۔ان کی شاعری میں جموں و کشمیر کی تہذیب و ثقافت کا محبانہ اثر نظر آتا ہے۔نظم ''میرا وطن ڈگر''

میں جموں کی مشہور جھیل مان سر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ منظر جمیل ہے قدرت کا شاہکار　　شاہ و فقیر جس پہ دل وجان سے ہیں نثار
دیکھے تو کوئی جھیل سے کہسار کا پیار　　آغوش میں لیا ہے اسے ہو کے بے قرار

رسا جاودانی جموں و کشمیر کے ایک مشہور شاعر گزرے ہیں کیونکہ یہ اردو اور کشمیری' دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور ان کے کئی اشعار زبان زد عام ہیں۔آپ ۱۹۰۱ء بھدرواہ میں پیدا ہوئے۔ان کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی نے رسالہ ''شیرازہ'' کا ایک ضخیم شمارہ ان کی شخصیت اور ادبی کام پر شائع کیا ہے۔رسا جاودانی نے اگرچہ نظمیں بھی لکھی ہیں تاہم ان کی غزلوں میں جو تجربات و احساسات اور رومانوی فضا موجود ہے'اس کی وجہ سے وہ زیادہ پسند کی گئیں اور مقبول بھی ہوئیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی چند غزلیں گائکوں نے پر درد لہجے میں گائی ہیں اور وہ کچھ زیادہ ہی مشہور ہوئیں۔

وہ سچ مچ بھی سامنے آئے ہم سمجھتے ہیں خواب دیکھا ہے
ہم بن کے تماشہ تو گئے اس کی گلی میں　　وہ بہر تماشا بھی لب بام نہ آیا
اگر آج وہ نہ آئے تو کل آئیں گے ضرور　　دیتے فریب دل کو یہ ہم عمر بھر رہے

رسا جاودانی کے دو شعری مجموعے ''لالہ صحرا'' اور ''نظم ثریّا'' شائع ہو چکے ہیں۔

میر غلام رسول نازکیؔ :

میر غلام رسول نازکی کشمیر کے ایک معروف شاعر ہیں۔یہ کشمیر اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ان کے کلام میں حکمت و دانائی کے موتی چمکتے ہیں جس کی وجہ سے یہ کشمیر کے مقبول عام شاعر ہیں۔غلام رسول نازکی ۱۹۱۰ء میں بانڈی پورہ کشمیر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۸ء میں وفات پائی۔ان کے والد ایک جید عالم تھے اس لئے انہیں بچپن سے ہی علمی و ادبی ماحول میسر آیا جس کی وجہ سے ان کی فکر میں پختگی اور شاعری میں حکمت کی چاشنی آتی رہی۔نازکی صاحب کی شاعری میں داخلی کرب اور خارجی مشاہدے کا حکمت آمیز امتزاج نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں مشہور شاعر غلام محمد طاوس فرماتے ہیں کہ:

''شروع سے آخر تک آپ کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ آپ کی شاعری ایک دکھی دل کی پکار ہے۔ایک غم انگیز پکار۔''

غلام رسول نازکی کی شاعری میں نادر تشبیہات و استعارات' خوبصورت منظر نگاری' پیکر تراشی کے خوبصورت جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔

چاند کی کرنوں سے دنیا حسن کا گہوارہ ہے　　پرتو مہتاب ہے یا نور کا فوراہ ہے
جلوہ گاہ طور ہے پست و بلند کائنات　　رات کا سنسان منظر نظر آوارہ ہے

غلام رسول نازکی کے کلام میں شاعرِ مشرق علاّ مہ اقبالؔ کے افکار اور کلام کا بھی اثر موجود ہے۔

کون کہتا ہے شب غم کی سحر ہونے لگی   امن وآسائش کی صورت جلوہ گر ہونے لگی
جب سے پھینکی فکر انسان نے ستاروں پر کمند   زندگی دشوار تھی دشوار تر ہونے لگی

غلام رسول نازکی کا کلام ۱۹۴۹ء میں ’’دیدۂ تر‘‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نازکی صاحب کی غزلوں میں زبان وبیان اور موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں:

’’نازکی صاحب کی غزلوں میں زبان وبیان کا رچاؤ‘ فکر وخیال کی بلندی اور عصری آگہی کے پرتو ملتے ہیں۔‘‘

محبت میں ایسے بھی لمحات آئے   نہ میں نے صدا دی نہ تم نے پکارا
یہ مایوسیاں ہیں کہ مجبوریاں ہیں   نہ جینے کی خواہش‘ نہ مرنا گورا

ان کی شاعری میں فطرت نگاری خصوصاً ایک کشمیری ہونے کے ناطے کشمیر کے حسین مناظر کی دلکش شعری منظر نگاری سے قاری کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔

مرے کشمیر کی ہر شے حسیں ہے   یہاں کی ہر پہاڑی مہ جبیں ہے
فلک پر اس زمین کی سرزمیں ہے   فلک خود ڈل کے اندر تہہ نشیں ہے

کشمیر کے اردو شعراء میں شہ زور کشمیری کا نام بھی بڑا اہم ہے۔ شہ زور کشمیری کا اصلی نام غلام قادر تھا اور شہ زور تخلص تھا۔ شہ زور کشمیری ۱۹۱۵ء سرینگر میں پیدا ہوئے۔ انہیں اپنا تخلص اتنا پسند تھا کہ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

یہ نام اور بتوں کے کرم پہ تیری نظر   غلام قادر شہ زور واہ کیا کہنا

شہ زور کی شعری ذوق کو پروان چڑھانے میں والد کا شعری ذوق‘ اسکول کا ادبی ماحول اور اردو‘ فارسی‘ عربی اور ہندی زبانوں کا مطالعہ اور دستگاہ نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ شہ زور ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے کلام میں غزل‘ نظم‘ قطعہ اور رباعی شامل ہیں۔ کشمیر کے دوسرے اہم شعراء کی طرح ان پر اقبالؔ کے کلام کا کافی اثر نظر آتا ہے۔ اسی اثر کو دیکھ کر سید سلیمان ندوی نے انہیں ایک خط میں کشمیر کا اقبال بھی کہتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’آپ کے کلام میں اقبال کی روح بولتی ہے اس لئے آپ کو کشمیر کا اقبال کہا جا سکتا ہے۔‘‘:

ہے میری ہمت کے تابع شش جہات   مجھ سے قائم ہے نظام کائنات

شہ زور کی کئی نظمیں اہم ہیں جن میں آئینہ‘ تاثیر‘ تردید‘ آزادی کی دستک‘ ظلم کے آنسو وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ ان کی نظمیں تزئین کاری اور بندوں میں جدت کاری کا دلچسپ انداز ملتا ہے۔ شہ زور

کے کلام میں نادر تراکیب بھی موجود ہیں جیسے حجرہ نشیں صبح‘ جامہ زیست‘ لغزش عصیاں‘ کار آذری‘ شعلہ داغ جگر‘ صید رنگ وبو‘ تاب نظر‘ نوحہ شبگیر وغیرہ۔

شہ زور کشمیری کے کئی اشعار میں دلچسپ معنی ومطالب کے حامل ہیں۔ ان میں رومانی فضا کے ساتھ ساتھ شوخی بھی محسوس ہوتی ہے۔

تجھے حشر میں آخر نقاب الٹنا ہے   جو کام کرنا ہے اک دن وہ آج ہی کرے
نگاہوں میں ہے انجام بہاراں   ہم آغاز بہاراں کیا منائیں
نہ پوچھ اے دوستِ الفت کے تقاضے   میں اکثر تیرے در سے لوٹ آیا

غلام محمد طاوسؔ (غ۔م۔طاوسؔ) کا شمار کشمیر کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ کشمیر کے ایک مشہور علاقہ پانپور میں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ زعفران کا کاشت کے لئے مشہور ہے۔ طاوس اپنے ایک شعر میں اپنی جائے پیدائش اور اپنی شخصیت کا نقشہ دلچسپ انداز سے شعر میں یوں کھینچتے ہیں۔

عفراں زاروں میں میری پرورش ہوتی رہی
زردیٔ رخ سے ہویدا ہے مرا جوش جنوں

بنا کر اشک ٹپکا تا ہوں ہر خوں گشتہ ارماں کو
مبارک باد دیتا ہوں میں اپنی چشم گریاں کو
پھر بہار آئی دلوں میں ولولے پیدا ہوئے
دیکھے کن کن تمناؤں کا ہوجاتا ہے خوں

طاوس کی شاعری میں سیاسی اور سماجی مسائل پر ارتکاز نظر آتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے طاوس کی غزلوں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

’’ان کی ابتدائی غزلوں میں بھی ان کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کا پرتو ملتا ہے۔‘‘

طاوس کے کئی اشعار میں ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کے جلوے موجود ہیں:

پرتو خورشید سے پرنور عالم ہوتو ہو   مرے دل کی ظلمتوں میں ضوفشاں کوئی نہ ہو
رہا محروم بس میں تشنہ لب تیری عنایت سے   وگرنہ تیری محفل میں صلائے عام ہے ساقی

تنہا انصاری کے آباواجداد اگرچہ اتر پردیش سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے دادا تجارت کی خاطر کشمیر چلے آئے اور پھر یہاں پر ہی سکونت پزیر ہوئے۔ تنہا انصاری ۱۹۲۰ء میں دلنہ بارہمولہ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ تنہا انصاری اپنی شعرفہمی اور ذوق کی بناء پر کشمیر کے صف اول کے اردو شعراء میں بہت جلد اپنی جگہ

بنالی۔اس کے علاوہ وہ کشمیری زبان میں بھی شاعری کرتے رہے اور نثر نگاری میں تحقیقی وتنقیدی اور علمی و سماجی مضامین بھی لکھے۔ یہاں کے حالات کے زیرِعصران کی شاعری میں بھی سیاسی وسماجی مسائل اور عصری صورتحال کا ذائقہ شامل ہوا۔جس کی طرف وہ اپنی نظم ''مری ناہید مجھ کو بھول جا'' میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

محبت کی کہانی بھول جاؤ　　خلش ہائے جوانی بھول جاؤ
وہ رنگین زندگانی بھول جاؤ　　تمہاری مہربانی بھول جاؤ
مری ناہید مجھ کو بھول جاؤ

اور نظم ''کسی کی یاد'' میں واضح انداز اپنے فکری رویہ کی تبدیلی کا اظہار کرتے ہیں۔

نہ ان جاں بخش ہونٹوں پر وہ لیلائے تبسم ہے　　نہ میری زندگی کے ساز میں کوئی ترنم ہے
نہ وہ جذبات کی موجوں میں پہلا سا تلاطم ہے　　شب دیجور' ساحل' دور' احساس نظر گم ہے

شیخ غلام علی بلبل کاشمیری کا تعلق ضلع بانڈی پورہ کشمیر سے ہے۔آپ ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے اور وفات ۱۹۹۸ء برطانیہ میں ہوئی۔ان کے کلام میں نہ صرف وطن مالوف سے والہانہ محبت جھلکتی ہے بلکہ وطن کے سبزہ زاروں' کہساروں' آبشاروں اور عزیز واقارب سے بچھڑنے کے دردوغم کا اظہار بھی درد انگیز صورت میں ملتا ہے۔

بوئے گل نغمہ راحت پہ سوار آئی ہے　　رنگ سے اپنے زمانے کو نکھار آئی ہے
تم جو آجاؤ تو پھر مجھ کو یقین آجائے　　لوگ کہتے ہیں کہ لندن میں بہار آئی ہے

کشمیر کے حوالے سے خواب وخیال میں　　اگتے رہے ہیں سرو و صنوبر تمام رات
چھوٹ کر اپنے وطن سے آہ کس آفت میں ہے　　بلبل بے پر کی جان انگلستان میں ہے

جموں وکشمیر میں اردو شعراء میں شوریدہ کاشمیری کا مقام منفرد اور ممتاز ہے۔شوریدہ کاشمیری ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ان کے شعری مجموعوں میں ''جوش جنوں''''جذب دروں'' ادبی خطوط میں ''خطاب خامہ'' اور ترجمے میں ''احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ مع شرح'' شامل ہیں۔شوریدہ کاشمیری فطری شاعر تھے کیونکہ ان کی شاعری آمد کا نمونہ ہے۔ان کا اپنا ایک تصور شاعری تھا' جس کے مطابق شاعری آتی ہے نہ کہ کی جاتی ہے جس طرح پھولوں میں رنگ شامل ہوتا ہے۔نظم ''شاعری'' کے یہ تین شعر دیکھیں۔

دل نشیں ہر ہر ادا فطرت کی ہے　　شاخ گل کی تھرتھری ہے شاعری
کہہ رہی ہے عندلیب نغمہ بار　　خامشی پھولوں کی بھی ہے شاعری
لفظ ومعنی کو کرے تحلیل جو　　روح کی وہ نغمگی ہے شاعری

آغا شورش کاشمیری اپنی شاعری اور علمی لیاقت کی وجہ سے علمی وادبی اور ثقافتی حلقوں میں ایک منفرد پہچان رکھتے تھے۔انہوں نے دو درجن کتابیں تصنیف کی تھیں اور ان کا ضخیم کلیات ''کلیات شورش کاشمیری'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوکر آیا۔جو اٹھارہ سو انیس صفحات پر مشتمل ہے۔سیاسی وسماجی حالات و واقعات' ختم نبوت' شخصیات' ذاتی واردات' تعلقات' فکاہات' طنزیات اور اسلامیات سے متعلق ہزاروں اشعار میں انہوں ے اپنی جولانی طبع' ندرت بیان' قدرت کلام اور طاقتور ادراک واحساس اور تفکر ووجدان کا غیر فانی مظاہرہ کیا ہے۔

سر بکف ہو کر نکل آیا ہوں میں　　میں کسی غدار سے ڈرتا نہیں
ہیچ ہیں میرے لئے دار و رسن　　تیغ کی جھنکار سے ڈرتا نہیں

شورش کاشمیری ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی مسائل میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں فلسفے کے زیریں باغیانہ لہریں بھی موجود ہیں۔

خدا نے شعلہ نوائی مجھے عطا کی ہے　　عوام سوئے ہیں انہیں جگاؤں گا
غنیم نے کبھی ٹوکا تو پھر خدا کی قسم　　قلم کو توڑ کے تلوار لے کے آؤں گا

عرش صہبائی (ہنس راج ابرول) ۳ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکھنور جموں میں پیدا ہوئے۔ان کا آبائی وطن تو ادھم پور جموں تھا لیکن بعد میں جموں سٹی میں ہی مستقل سکونت اختیار کی۔ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۵ء سے ہوا اور تقریباً انیس شعری مجموعے اور دو تذکرے سامنے آئے ہیں۔ان کی شخصیت اور شاعری پر کئی تحقیقی وتنقیدی بھی لکھی گئی ہیں۔عرش صہبائی کے کلام میں وجودی کرب' بقا وقضا' دردوغم اور رومانی احساس کے موضوعات نظر آتے ہیں جنہیں حسین شعری پیرائیہ میں پیش کیا گیا ہے۔

کون سا وہ زخم دل تھا جو تروتازہ نہ تھا　　زندگی میں اتنے غم تھے جن کا اندازہ نہ تھا
ہم نکل سکتے بھی تو کیوں کر حصارِ ذات سے　　صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا
اس کی آنکھوں سے نمایاں تھی محبت کی چمک　　اس کے چہرے پر نئی تہذیب کا غازہ نہ تھا
عرش ان کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور　　ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

عرش صہبائی کی شاعری میں اگرچہ غم انگیز کیفیت پائی جاتی ہے تاہم وہ باحوصلہ انسان تھے اس لئے ان کے اشعار میں ہمدردی کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

راحتیں زندگی کی جن پہ نچھاور ہیں عرش　　ہم نے دیکھا ہے کہ کچھ ایسے بھی غم ملتے ہیں
بند کرلوں دل کے دروازے کو دستک جو دے غم　　پھر خیال آتا ہے کوئی در بہ در کب تک رہے

حکیم منظور کا اصلی نام محمد منظور تھا اور قلمی نام حکیم منظور سے مشہور ہوئے۔ پیدائش ۱۹۳۸ء اور

وفات ۲۰۰۷ء میں ہوئی۔ آپ کے آٹھ شعری مجموعے ''ناتمام'' ''لہولمس چنار'' ''خوشبو کا نیا نام'' ''برت رتوں کی آگ'' ''پھول، شفق، آنگن'' ''شعرآسماں'' ''صبح، شفق، تلاوت'' منظر عام پر آئے ہیں۔ حکیم منظور کی شاعری میں کشمیر کے قدرتی مناظر، پھل پھول، سیاسی سماجی حالات، کشمیریت اور کشمیری تہذیب وتمدن کا دلکش شعری بیان ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں کشمیر کی اندوہ ناک صورتحال کا دل دوز انداز نظر آتا ہے۔

چند ہنستے بولتے رنگیں منظر بھیجنا ہوسکے تو اک نیا موسم زمیں پر بھیجنا
مسکراتے کھیلتے معصوم بچوں کے لئے آنگنوں میں قاف کی پریوں کے لشکر بھیجنا

پروفیسر حامدی کاشمیری ادبی دنیا میں ایک نظریہ ساز نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ کیونکہ انہوں نے ''اکتشافی تنقید'' کا نظریہ اردو ادب کو دیا۔ ان کی شاعری میں قدیم وجدید رجحانات کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں علامتی اسلوب کی ایسی دلکشی موجود ہے کہ قاری پڑھتے پڑھتے سر دھنتا رہتا ہے۔ حامدی کاشمیری ادب میں تجربہ پسندی کے قائل تھے اور یہ تجربہ پسندی ان کی تنقید اور شاعری میں کامیابی سے نظر آتی ہے

لبوں کو چھولے ہوا کوئی بات ہو تو چلیں حصار گرد میں راہ نجات ہو تو چلیں
سروں پہ جلتے ہیں دشت آفتاب زیرقدم کچھ اپنے ہوش میں آجائیں رات ہو تو چلیں
دہن وا کردہ قبریں منتظر ہیں یہ جشن زندگانی شام تک ہے

جموں وکشمیر میں اردو کے تعلق سے اب موجودہ دور کے اردو شاعروں پر ایک نظر دوڑائیں تو آج بھی کئی شعراء اردو میں شاعری کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کے مجموعے بھی سامنے آئے ہیں اور جن کی شاعری اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ ان میں چند ایک اہم شاعروں کے نام کچھ یوں ہیں۔

پروفیسر مرغوب بانہالی، مشتاق فریدی، فدا کشتواڑی، فدا راجوری، حسام الدین بے تاب، ہنس راج شاداں، شہباز راجوری، سیفی سوپوری، رفیق راز، نذیر آزاد، شفق سوپوری، اشرف عادل، سلیم ساغر وغیرہ شامل ہیں۔

Zamrooda Mohammad Mir
Research Scholar
Deptt. of Urdu
Swami Ramanand Teerath
Marathwada University
Nanded-193 201
Maharashtra

نکہت پروین

اکیسویں صدی کے معتبر ناول نگار

اردو ناول نے جس طرح انیسویں صدی میں اپنی اہمیت کا لوہا منوایا اور زمانے اور انسانی زندگی کی حقیقی تصویر کشی کی اسی طرح اکیسویں صدی میں بھی اس صنف کی اہمیت وافادیت قائم ودائم ہے۔ آج کے ناول نگار زندگی کے سارے رموز ونکات کو بہتر پلاٹ اسلوب اور جیتے جاگتے کرداروں کو خلق کر کے ترجمانی کرنے میں اپنے قلم کو فعال رکھا ہے۔ جس کا مثبت اثر یہ بھی ہے کہ آج کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ناول کی عمارتیں کھڑی نہ کی گئی ہوں۔ خواہ سماجی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، تعلیمی، معاشی، مسائل ہوں یا پھر صارفیت کے مسائل ہوں یا صنعتی عہد کے مسائل ہوں سبھی کو موضوع بنا کر ناول نگاروں نے ناول تحریر کیا ہے۔ سائنسی عہد میں بھی قومی افراط وتفریط فرقہ وارانہ فسادات، قتل وغارت گری عالمی پیمانے پر ہجرت کے مسائل یا پھر اقتصادی صورت حال مختصر یہ کہ سماجی سطح پر بیشتر نامساعد حالات کو ناول نگاروں نے پیش نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے تحریر کردہ ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک عام ذہن کا فرد بھی زمانے کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہوجاتا ہے۔

یہ عہد Globlization کا عہد ہے۔ یہاں صرف ذاتی زندگی کو ناول نگاروں نے جگہ نہ دے کر اجتماعی مسائل پر غور وفکر کرنے کو خصوصی توجہ دی ہے لہٰذا جدیدیت کے برعکس اس عہد کے ناول زیادہ موزوں قرار دیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ ادب برائے زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ناول نگار اپنے ناول میں زندگی کے سارے حسن وقبح پر قلم اٹھاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی سے جڑی ساری ناہمواریاں آج کے ناولوں میں بدرجہ اتم موجود نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ناول کسی بھی اعتبار سے ناپسند نہیں کئے جاتے ہیں۔ زبانی اعتبار سے بھی یہاں وہ سادگی اور سلاست موجود ہوتی ہے جس کا ہر قاری تقاضا کرتا ہے۔

آج کا عہد معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر کافی تبدیل کر چکا ہے اس باعث آج کے تحریر کردہ ناولوں میں موضوعاتی اور جزئیاتی سطح کے ساتھ ساتھ اسلوب کے اعتبار سے کافی حد تک تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ صارفیت کے عہد میں معاشی اعتبار سے انسانی زندگی

کافی حد تک پامالی کا شکار ہوچکی ہے۔اجتماعیت کی جگہ انفرادیت کو فوقیت حاصل ہوچکی ہے۔ان سارے امور کو ناول نگاروں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ناول کا حصہ بنایا ہے۔

اکیسویں صدی کے ناولوں میں اپنے ڈکشن اور Treatment کے لحاظ سے عبدالصمد کے قلم سے تحریر کردہ ناول ''شکست کی آواز'' اور ''اجالوں کی سیاہی'' بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ان ناولوں سے قبل تخلیق کئے گئے ناولوں میں ''دوگز زمین''، ''دھک''، ''مہاتما'' اور ''مہاساگر'' وغیرہ میں عبدالصمد نے سیاسی اتار چڑھاؤ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہانی کا تانا بانا بُنا ہے،لیکن مذکورہ بالا دوناولوں ''شکست کی آواز'' اور ''اجالوں کی سیاہی'' میں جس طرح فن کے لحاظ سے آپ نے نئے تجربے کی پیشکش کی ہے وہ نہایت ہی قابل تعریف ہے۔ان دونوں ناولوں میں نئے موضوعات کا احاطہ بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ان دونوں ناولوں کا کسی بھی معاملے میں ان کے دیگر ناولوں سے مماثلت دیکھنے کو نہیں ملتا۔اس نقطہ نظر سے یہ بھی کہا جائے گا کہ عبدالصمد خود کو یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ متنوع موضوعات کی پیشکش میں بھی ان کا قلم انفرادیت رکھتا ہے۔شکست کی آواز چوں کہ نئے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔یہاں رومانی فضا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''سامنے پھیلا ہوا آنگن، اس سے متصل بائیں باغ، آم، امرود، بیر کے درختوں کے علاوہ کیاریوں میں ہری بھری سبزیاں .... اچانک نوری پانی میں بھیگتی ہوئی سامنے سے بھاگی۔ ندیم بے اختیار لپ کر منڈیر پر آ گیا۔نوری نے امرود کے ایک درخت سے ایک کچا امرود توڑا۔ دانتوں سے کاٹتی ہوئی آئی۔ پھر اندر کی طرف دوڑ گئی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا معمولی جمپر اس کے بدن سے چپک گیا تھا۔ اندر کسی اور کپڑے کی ضرورت شاید اس نے یا اس کے بڑوں نے محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اس کے بدن کی ساری رعنائیاں ایک ہی نگاہ میں ساری کمزور رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اچانک اس کے سامنے آ گئی تھیں۔ شلوار نے بھی اس کی توبہ شکن جوانی کو کوئی تحفظ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔''

(شکست کی آواز، عبدالصمد، ص-۹)

غضنفر نے اپنے ناول ''پانی'' کو بالکل علاحدہ اور منفرد رنگ دینے کی منصوبہ بندی کی۔اس کے لئے انہوں نے اساطیری، تمثیلی اور داستانی طرز کی بازیافت کی۔گرچہ یہ تکنیک پہلے سے موجود تھی اور جابجا کہانیوں میں استعمال بھی ہوچکی تھی،لیکن غضنفر نے اسے بڑے کینوس پر استعمال کیا اور اس طرح کیا کہ

پہاڑوں، جھیلوں، ندیوں، دیوی دیوتاؤں، دانوؤں، پریوں اور حضرت خضر کے رنگین وسنگین واقعات ناول کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔ساتھ ہی ناول نگار نے مشینی اور سائنسی تجربات وایجادات سے استفادہ کرتے ہوئے زمنائی بعد کو ختم کر دیا اور عہد قدیم کو عہد حاضر سے ہم آہنگ کر کے ناول کو نئی معنویت اور نئی جہات سے ہم کنار کیا۔ ماحول آفرینی، فضابندی، پیکر تراشی، جزئیات نگاری، انشاء پردازی، نیز مرصع و مقفی عبارتوں کے ذریعے ایک طرف پر اسرار اور طلسماتی فضا ہموار ہوئی تو دوسری جانب پانی کو علامت بنا کر عصری حسیت کو نئے تناظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔انسانی محرومی اور بے بسی کے لئے تشنگی کو استعارے کے طور پر پیش کیا گیا۔ناول نگار نے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ دبنگ اور منفی قوتوں کا غلبہ اس قدر شدید ہو چکا ہے کہ اس سے نبرد آزما ہونا اب عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت خضر کو بھی اخیر میں بے بسی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے خاموش ہوجانا پڑتا ہے کہ اب ان کو زیر کرنا ناممکن ہے۔اس لئے کہ انہوں نے آب حیات پی کر ابدی زندگی حاصل کر لی۔نتیجتاً تمام انسانی وسائل ان کی دسترس میں آ چکے ہیں۔اب آدمی کو آب حیات کیا، زندہ رہنے کے لئے دو بوند پانی کو بھی ترسنا پڑے گا۔غضنفر کی یہ خالص علامتی کہانی اپنی تکنیک، موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے سچ مچ اپنے دور کی نئی اوڈیسی بن گئی ہے۔ناول کا آخری باب اضافی ہے اور یہ ناول کی تہہ داری اور پر اسراریت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس سلسلے سے ناول ''گئودان کے بعد'' کو ہی لیجئے اس میں بھی نئے تجربے کی ایسی کشش ہے کہ قاری واہ کہے بغیر نہیں رہتا۔ یہ ایک منفرد ناول ہے۔متن پر متن کی یہ روایت بہت خوب ہے۔صنف ناول میں یہ تجربہ پہلا اور انوکھا ہے۔اس ناول کا اختصاص یہ ہے کہ مصنف نے ناول کے واقعات کردار وغیرہ کو اسی زبان اور ماحول میں آگے بڑھایا ہے۔یہ ناول اس معاملے میں بھی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نئے عہد مین اور نئے مصنف کے قلم کا تحریر کردہ ہے۔علی ضامن نے اس ناول کی اہمیت اس معاملے میں بھی بڑھاتی ہے کہ انہوں نے پورے ناول کو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے منظر نامے کو پیش نظر رکھتے ہوئے پریم چند کے انداز میں بیان کیا ہے۔اس سلسلے سے یہ اقتباس دیکھئے :

''گئودان کے بعد' کی شکل میں ایک انوکھا تجربہ سامنے آیا ہے۔ناول نگاری کی دنیا میں کم از کم یہ تجربہ کرنے والا بالکل نیا ناول ہے،لیکن جب میں نے اسے پڑھا تو اسی سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ بہت ہی کہنہ مشق، منجھا ہوا ناول نگار ہے، جس نے اردو میں پہلی بار ایک مکمل ناول کو بنیاد بنا کر اسی کے کرداروں کو آگے بڑھاتے ہوئے خود ایک ناول تصنیف کیا ہے۔کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ یہ آج کے دور کے کسی مصنف کی تحریر ہے بلکہ یہ محسوس ہوتا

> ہے کہ پریم چند کا ہی کوئی ناول پڑھ رہے ہیں۔ان کی فضا آفرینی اور ماحول کی تصویر کشی بہت ہی مستحکم اور فن کارانہ ہے۔''
>
> (گئودان کے بعد،علی ضامن،فلیپ کور)

نئی صدی کے ناول نگاروں میں مشرف عالم ذوقی کا نام بھی منفرد شناخت رکھتا ہے۔آپ نے یکے بعد دیگرے کئی اہم ناول تحریر کرکے اس بات کی نمائندگی کی ہے کہ آپ کا قلم ہر موضوع، نئے تجربے اور نئے رنگ وآہنگ سے آراستہ کرنا خوب جانتا ہے۔اس سلسلے سے یہ بھی کہا جائے گا کہ آپ کا ناول نت نئے اسلوب بیان اور ہیئتی تکنیک کی پیشکش کے حوالے سے جس حدتک اعلیٰ پایے کا قرار دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح آپ نے ناول کے دیگر عناصر کو بھی بروئے کار لایا ہے،لیکن میرے اس باب میں موضوع، پلاٹ، کردار وغیرہ کے سلسلے سے باتیں کرنے کی اجازت حاصل نہیں لہٰذا یہاں صرف اسلوب نگارش کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہوں گی تا کہ قارئین اس عہد کی ناول نگاری کے فنی محرکات کا بخوبی اندازہ لگا سکیں۔گویا یہ کہنا لازمی ہوگا کہ مشرف عالم ذوقی نے جس طرح زود نویسی کو ترجیح دی ٹھیک اسی طرح اسلوبیات کے اعتبار سے بھی اردو ناول کے دامن کو وسیع کیا ہے۔آپ کا نظریہ کافی حدتک جداگانہ تھا آپ نے سالمیت یا یوں کہیں کہ یکسانیت کو کبھی بھی تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے ناول اپنے نام سے یہ پہچان دینے میں معاون نظر آتے ہیں کہ یہ مشرف عالم ذوقی کے قلم کی تخلیق ہے۔یہ ایک فنکار کے لئے کافی اہمیت رکھتا ہے۔آپ کا ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' (۲۰۱۱ء) مین شائع ہوکر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔اس ناول کو ذوقی نے چار حصے میں بانٹ کر پیش کیا ہے اور ہر حصے میں کئی ابواب شامل ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو آج کا عہد اردو ناول کے تمام فنی لوازم کو نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ پیش کرنے میں کارآمد نظر آتا ہے۔اس سلسلے سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری فرماتے ہیں :

> ''نئی صدی کے ناول کا منظر نامہ بظاہر ضرور ۱۵-۱۴ برسوں پر محیط ہے،لیکن پس منظر اور منظر نامے وسیع علاقے اور زمانے کا احاطہ کرتے ہیں۔اگر صرف اکیسویں صدی کے اہم ناولوں کا ہی مطالعہ کیا جائے تو کئی ہزار صفحات بھی کم پڑیں گے۔پاکستان کا منظر نامہ الگ ہے۔وہاں انتظار حسین،انور سجاد،عبداللہ حسین،بشریٰ رحمان،شمیم منظر،رضیہ فصیح احمد وغیرہ کی نمائندگی میں ایک وسیع منظر نامہ ترتیب پا رہا ہے۔پھر اکیسویں صدی میں ہمارے کئی بزرگ ناول نگار جوگندر پال،ساجدہ زیدی،اقبال مجید،رتن سنگھ سے لے کر قمر نقوی بھوپالی،نفیس تیاگی وغیرہ کے ناولوں کے مطالعہ کے

ISSN : 2582 - 3612

> لئے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔نئی صدی کا نیا ناول امید افزا ہے۔مایوسی کی کوئی صورت نہیں،امکانات صحتمند ہیں۔نئی طرز، نئے موضوعات، نیا اسلوب اور نیا منظر نامہ کہیں کہیں فنکاری سے ایسا روپ لے رہا ہے جو اردو ناول کے لئے نیک فال ہے۔''
>
> (اردو جرنل، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ،ص-۳۸)

تمام باتوں کی روشنی میں کہا جائے گا کہ اکیسویں صدی میں اردو ناول کو فروغ عطا کرنے میں مرد ناول نگاروں کا اہم رول رہا ہے۔

Nikhat Parween
Research Scholar
Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur (Bihar)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

رابعہ خاتون

پروفیسر علیم اللہ حالی کی صحافتی خدمات: ایک جائزہ

پروفیسر علیم اللہ حالی کے جہاں زندگی کے بہت سارے ادبی کارنامے ہیں وہیں ان میں ان کی صحافتی کدوکاوش بھی شامل ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی کو صحافت کا شوق بھی شعری ذوق کی طرح شعوری زندگی کے آغاز سے ابھرا۔ اس لئے کہ ان کے حالات پر مبنی محسن رضا رضوی نے ''زندگی نامہ'' کا اختصار مرتب کیا ہے۔ ان میں صحافتی خدمات کے تحت مندرجہ ذیل کوائف درج ہیں:

صحافت: ''پیارا'' (بچوں کا رسالہ تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں 1955ء کے آس پاس جاری کیا)

''عذرا'' (دیواری اخبار تھا۔ یہ بھی 1955ء کے آس پاس جاری کیا۔ ہاتھ سے لکھ کر محلے کے کسی مرکزی مقام پر آویزاں کرتے تھے)

''صبح نو'' (ادارت سے وابستہ رہے۔ بعد میں بہت دنوں تک مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریاں نبھائیں)

''نمود'' (ہفتہ وار تھا۔ گیا سے جاری کیا تھا)

''حق شناس'' (ہفتہ وار تھا۔ پٹنہ سے نکلتا تھا)

''سہیل'' (گیا سے نکلتا تھا۔ ادارے سے وابستہ تھے)

''انتخاب'' (ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پٹنہ سے پابندی سے شائع کر رہے ہیں)

اب دیکھتے ہیں کہ علیم اللہ حالی صاحب نے اپنی صحافت کے بارے میں کیا کہا ہے اسے بھی ایک نظر ان کی متعدد تحریروں اور انٹرویوز میں دئے گئے ''بیانات'' کے ذریعہ سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔

جناب وفا ملک پوری نے اولاً پورنیہ سے ''صبح نو'' کے نام سے ادبی جریدہ شائع کیا تھا۔ بعد میں یہ رسالہ عرصہ تک پٹنہ سے شائع ہوتا رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے اس رسالے سے وابستگی رہی اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب مجھے حضرت وفا ملک پوری کے ساتھ اس کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔

پورنیہ میں اسکول اور کالج کی طالب علمی کے دوران بھی ادبی و شعری نیز صحافتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ بچپن میں ہاتھ سے لکھ کر بچوں کا رسالہ ''پیارا'' نکالتا تھا۔ پھر ''عذرا'' کے نام سے ایک قلمی دیواری اخبار نکالتا رہا۔

(میں۔ علیم اللہ حالی)

(علیم اللہ حالی: ادبی زندگی کی نصف صدی، صفحہ ۷۲۔۷۱)

صحافت سے دلچسپی ہوتی تو بچپن میں قلمی رسالہ شروع کیا۔ قلمی دیواری اخبار کی ایجاد کی۔ ''صبح نو'' کی ادارت کی ہفت روزہ ''نمود'' (گیا) شائع کیا۔ پٹنہ سے ہفتہ وار ''حق شناس'' جاری کیا۔ ماہنامہ سہیل (گیا) کی ادارت میں تعاون، غرض۔ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری'

(میں۔ علیم اللہ حالی

علیم اللہ حالی: ادبی زندگی کی نصف صدی صفحہ ۷۴)

''میرے فطری ادبی ذوق کی تربیت جناب سید عباس علی رضوی وفا ملک پوری نے کی ہے۔ وہ میرے مشفق استاد تھے۔ میں ان کے رسالے ماہنامہ ''صبح نو'' میں ان کی معاونت کرتا تھا۔ بعد میں اس کی مکمل ذمہ داری میرے سر آ گئی۔

(میں۔ علیم اللہ حالی)

(علیم اللہ حالی: ادبی زندگی کی نصف صدی صفحہ ۷۸)

''طالب علمی سے آج تک صحافت (ادبی صحافت) سے دلچسپی رہی ہے۔ ''پیارا''، ''عذرا''، ''صبح نو''، حق شناس'' اور دیگر کئی جرائد کی ادارت کرتا رہا۔ اور اب انتخاب'' کے نام سے سہ ماہی مجلّہ شائع کر رہا ہوں''۔

(میں۔ علیم اللہ حالی)

(علیم اللہ حالی: ادبی زندگی کی نصف صدی صفحہ ۷۸)

(۱۴جولائی ۲۰۰۰ء)

مندرجہ ذیل اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروفیسر علیم اللہ حالی کی ادبی شخصیت کو نکھارنے اور سنوارنے میں ان کے استاد محترم حضرت وفا ملک پوری کا خاص کرم رہا ہے اور حضرت وفا ملک پوری کی شخصیت میں دیگر شعبہ فکر و فن کے ساتھ ایک صحافی کی ادبی لطافت بھی انگڑائی لے رہی تھی ''صبح نو'' اپنے وقت میں ادبی شناخت بہار کے حوالے سے قائم کر چکا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ حالی صاحب نے بھی استاد کی روایت کو اپنی زندگی میں گہری وابستگی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ وہیں اس سلسلے

میں ان کی مزید کوششوں کا ذکر بھی ملتا ہے یعنی ''بچوں کا رسالہ'' پیارا'' جاری کرنا گویا اردو ادب کی آبیاری میں بنیادی قوتوں کا بھی انہیں احساس تھا اور بچوں کی تربیت کی طرف ایک سنجیدہ کوشش بھی تھی یہ الگ بات کہ'' پیارا'' کو وہ مقبولیت نہیں مل سکی یا انہوں نے اسے استحکام نہیں بخشا حالانکہ ایک اچھا قدم تھا۔ ایک تو حالی صاحب کی زندگی بھی اس وقت اتنی مستحکم نہیں تھی جس کا ذکر انہوں نے اپنے شعری مجموعہ'' لفظ، آواز، صورت گری'' میں'' ماقبل'' کے عنوان سے لکھے گئے پیش لفظ میں معاشی تنگ دستی کی صورت میں کی ہے۔

'' والد اور چچا جان کے وقت میں صورت حال بدل چکی تھی۔ اقتصادی تناؤ پیدا ہو چلا تھا اور رزق و روزگار کے مسائل نے جہاں مرکزیت کو مجروح کر دیا وہاں شعری، ادبی ذوق سے دوری بھی پیدا کردی۔ والدین اور ہم لوگ الجھے ہوئے مسائل سلجھانے میں مزید الجھتے رہے۔ معیشت تو پہلے ہی ٹوٹ چلی تھی۔ اس کی خستگی زیادہ نمایاں ہوتی چلی گئی۔

اس آزمائش کے دور کو وہ اپنی شخصیت کے نہاں خانے میں خوف، بزدلی، بے ہمتی، بے یقینی، بے اعتباری، گریز، فقدان عمل، اضمحلال اور تذبذب جیسے منفی اثرات سے تعبیر کرتے ہیں جوان کے شعری مزاج کا حصہ ہیں شاید عملی اقدام میں وہ لڑکھڑاہٹ ہے جسے ابتدائی دور کے ان صحافتی اقدام کو وہ جلا نہیں بخش پائے اور کوئی ایسی مضبوط ڈور نہیں پکڑ سکے کہ'' پیارا'' جو بچوں کا رسالہ تھا وہ ادبی دنیا میں ایک مستحکم شناخت قائم کرتا اور اسی زمانے میں ان کا دوسرا اقدم'' عذرا'' جو ایک دیواری اخبار کی صورت میں تھا وہ بھی اپنی شناخت کے پرچم کو بلند کرنے میں ناکام رہا۔ مگر مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی کے یہ صحافتی اقدام تذکرہ اور تاریخ کا حصہ ضرور ہیں مگر خوب ہیں۔

حالی صاحب کی زبان میں ان دنوں کے احوال بھی سنئے، دیکھئے):

'' غرض میرا وجود ہر چہار طرف سے علم وادب اور تعلیم، تخلیق سے گھرا ہوا تھا۔ پھر وفا ملک پوری جیسے نہایت شفیق، باذوق اور اہم شاعر کی شاگردی مل گئی۔ ان عوامل نے میرے ذوق ادب کی آبیاری کی اور میں بچپن میں ہی بوڑھا ہو گیا۔ نویں دسویں کلاس میں تھا کہ ایک قلمی رسالہ'' پیارا'' مرتب کرنے لگا۔ اسی کی کئی کاپیاں بنا کر رشتہ دار قارئین کے پاس بھیجتا تھا۔ لوگ پڑھ کر دوسری جگہ بھیج دیتے تھے۔ یوں رسالہ گردش کرتا ہوا رقارئین تک پہنچتا تھا۔''

''عذرا'' کے متعلق بتاتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک بار فل اسکیپ کے کئی صفحات جوڑ کر تیار ہوتا تھا اور شہر کی اردو آبادی میں جہاں جہاں مرکزی حصہ تھے وہاں وہاں پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ اس کے اندر مقامی

ISSN : 2582 - 3612

مسائل، بدعنوانیوں کے خلاف آوازیں بلند کی جاتی تھیں۔ الفاظ، محاورات کے معانی بھی بحث کا موضوع ہوا کرتے اور کبھی کبھی اشعار کی شرح وغیرہ بھی۔ استاد گرامی (وفا ملک پوری) نے جب ۱۹۵۲ء میں ماہنامہ ''صبح نو'' کا اجراء کیا تو ان کے ساتھ جڑ گئے، فیض الحسن صاحب سے انہوں نے یہ تمام باتیں ایک ادبی مکالمے میں کی ہے اور اپنی شخصیت کے بارے میں یہ بھی کہا کہ'' شاعری، تنقید اور صحافت۔ یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر'' یعنی انہوں نے اول نمبر پر اپنی شاعری کو رکھا ہے، دوئم نمبر پر تنقید کو اور تیسرے نمبر پر اپنی صحافت کو۔

زبان، بیان کی نشو نما میں اخبار، رسائل کی کتنی اہمیت ہے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ راقم کو اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں'' زبان، بیان کی نشو نما میں اخبار و رسائل کے مدیران چاہیں تو ایک معیار کی تشکیل کر سکتے ہیں'' مگر عہد جدید کے رسائل، اخبار جو عوام الناس تک صرف خبر رسانی کے لئے شائع ہوتے ہیں ان سے زبان و بیان کی نشو نما کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ راقم کو بھی انہوں نے بتایا کہ'' میں نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا، پھر ادبی صحافت اور تنقید کے میلانات بھی ابھرتے گئے۔ اس بیان سے گویا وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انکے مزاج میں شاعری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے جس کا اظہار انہوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے آگے اسی بیان میں فرماتے ہیں :

'' ان تمام مشغولیات میں شاعری آج بھی میری طبیعت کے لئے سب سے محبوب وسیلہ اظہار ہے۔ صحافت کا جو اخباری انداز ہوتا ہے وہ میں نے کبھی نہیں اپنایا۔ بلکہ نوجوانی میں بھی صحافت کی اسی مشق سے تعلق رکھا جس پر ادب کے اثرات غالب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں قلمی دیواری اخبار مرتب کرتا تھا جس میں شعر وادب کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔''

'' تنقید کو حالی صاحب ایک شدید ذمہ دارانہ عمل سمجھتے ہیں اور تخلیق جہات میں غزل سے زیادہ خود کو نظموں کے لئے بہتر سمجھتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ نظموں میں اپنی تخلیقی صلاحیت کو بھرپور انداز میں پیش کر سکتے ہیں وہیں صحافت میں دلچسپی کی وجہ شعر وادب کو قرار دیتے ہیں۔ عمران راقم کے ایک سوال'' انتخاب'' کے مقصد کو پیش کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے صحافتی اقدام کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

'' انتخاب'' کے وسیلے سے میں جدید تر ادبی آگہی کی پیشکش پر زور دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہر دور میں اعلیٰ ادب کے معیار بھی بدلتے رہے ہیں انہیں بدلنا بھی چاہئے۔ نت نئے اسلوبیاتی اور موضوعاتی تجربات کے ساتھ ادب کے تادیر رہنے والے مزاج و انداز سے باذوق حضرات کی متعارف کرانا

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ایک سنجیدہ مقصد ہے۔ میں اس کی تکمیل کی کوشش کرتا ہوں اور ''انتخاب'' کی مخصوص طبقے میں جو پذیرائی ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آج ایک حلقہ نئے سنجیدہ رجحان سے قریب ہونا چاہتا ہے۔''

سید احمد قادری کا شمار ایک اچھے افسانہ نگار کے ساتھ ایک اچھے صحافی کے طور پر ہوتا ہے بلکہ ان کی صحافت زیادہ مقبول ہے ان کا ایک انٹرویو حالی صاحب سے صحافت کے متعلق بہت اہمیت رکھتا ہے۔'' علیم اللہ حالی سے ایک ادبی مکالمہ'' میں سید احمد قادری کا پہلا سوال ہی بہت اہم ہے انہوں نے سوال پوچھا ہے کہ ''شاعری، تنقید اور صحافت کے تعلق سے آپ کی لمبی ادبی اور صحافتی خدمات رہی ہیں لیکن اب تک آپ کو ساہتیہ کا اکادمی ایوارڈ نہیں ملا کیوں؟ حالی صاحب نے اس کا جواب قدرے تفصیل سے دیا ہے انعام نہ ملنے کی بات تو زیادہ اہم نہیں ہے مگر انہوں نے اپنی صحافت کے متعلق جو کہا ہے وہ پیش ہے:

''شاعری، تنقید اور صحافت سے میرا تعلق عنفوان شباب سے رہا ہے اور اس طرح ان اصناف سے میرا یارانہ کم وبیش چالیس برسوں سے قائم ہے۔
آج صحافت کی نوعیت بدل گئی ہے۔ پہلے کے مقابلے میں آسانیاں بھی زیادہ ہوگئی ہیں۔ میں نے اس وقت اپنا سفر شروع کیا اور ایک ایسے ماحول میں صحافت کا چراغ جلایا جو قطعی طور پر اس کے لئے موافق نہیں تھا۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ میں نے اول اول قلمی دیواری اخبار کا سلسلہ شروع کیا۔ پر ہفتے فل اسکیپ کاغذ جوڑ کر اخبار تیار کرتا۔ اس میں مقامی خبریں بھی ہوتیں، سیاسی اتھل پتھل پر اپنے خیالات بھی رقم کرتا۔ شعر وادب سے متعلق خبریں اور تجزیات نیز دوسری بہت سی باتیں جو عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتی تھیں انہیں اس دیواری اخبار کے ذریعے ہر ہفتہ لوگوں تک پہنچائی جاتی تھیں۔ پھر باقاعدہ ادبی صحافت کی طرح رجوع ہوا ماہنامہ ''صبح نو'' سے وابستگی رہی۔ ''حق شناس''، ''سہیل'' اور دیگر کئی رسائل وجرائد کے ذریعے اپنے اس ذوق کی تسکین کرتا رہا اور ہنوز سہ ماہی ''انتخاب'' کی شکل میں یہ سلسلہ جاری ہے۔''

اور اس گفتگو میں انہوں نے موجودہ اردو صحافت پر بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ علیم اللہ حالی کی صحافت کو سمجھنے کے لئے انکی اس رائے کو بھی پیش نگاہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

1961ء میں حالی صاحب بھی شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا اس وقت وفا ملک پوری پٹنہ منتقل ہو چکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دربھنگہ ہاؤس میں ایم۔اے کے کلاسز کے بعد پیشتر وقت '' صبح نو'' کے دفتر میں گزارتے تھے۔ اور اس وقت ''صبح نو'' سے ان کی دلچسپی کے ساتھ ایک ذمہ داری بھی وابستہ ہو چکی تھی۔ قاضی پور کوارٹر میں علیم اللہ حالی اپنی بڑی بہن اور بہنوئی سید عطاالحق کے یہاں رہتے تھے ''صبح نو'' کا دفتر دریا پور فقیر باڑھ میں بشیر منزل (قطب الدین لین) میں تھا۔ وہیں زیادہ وقت یہ گزارا کرتے تھے۔ ''صبح نو'' کے لئے دفتری امور، مراسلت، رسالے کے ڈسپیچ، شذرہ نگاری کبھی کبھی اداریہ نگاری۔ وغیرہ انجام دیا کرتے۔ غرض ''صبح نو'' کے ساتھ جڑ کر وفا ملک پوری صاحب کے تعاون کے لئے ہر طرح سے کمر کس چکے تھے اور ہر مقام پر ان سے منسلک تھے ہاں ایک کام کے لئے انجام دہی سے دور تھے جس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ہاں ایک کام ایسا تھا جس کی انجام دہی سے میں قاصر تھا یعنی یہ کہ مجھ میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی اور وہ کام تھا ''صبح نو'' کے لئے خریداروں سے پیسے وصول کرنا۔ نئے خریدار بنانا اور پرانے خریداروں سے باقی رقوم وصولنے کا جبر طلب کام پر آدمی کے بس کا نہیں ہوتا۔''

وفا صاحب کی بےلوث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وفا صاحب نے زندگی کا بہترین حصہ ''صبح نو'' کے حوالے کر دیا۔ تمام تر جانفشانی کے بعد رسالہ ان کے لئے یافت کا ذریعہ نہیں بن سکا یہ خود کفیل ہو جاتا تو ایک بات تھی۔ ادھر پورنیہ میں ان کی نئی ذمہ داریاں انہیں مسلسل بلا رہی تھیں ''صبح نو'' اور پورنیہ کی نئی ذمہ داریاں۔ اس کشاکش کا انجام وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ ''صبح نو'' کی پتوار ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور اس ڈوبتی کشتی کو بچانا ناممکن تھا۔ اس وقت حالی صاحب بھی بے روزگار تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے بچپن کے استاد کی بےلوث خدمت کی جن کی وجہ کر انہوں نے شاعری اور صحافت کے گُر سیکھے۔

شاید صحافت سے لگاؤ کی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعری کی طرح بہت قریب سے صحافتی زندگی کو دیکھا اور برتا ہے اس لئے ایک طرح کا عشق بھی صحافت سے روا رکھا ہے۔ ''انتخاب'' کے ذریعہ اس کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ علیم اللہ حالی نے ''انتخاب'' میں کچھ ہو یا نہ ہو ادب کے معیار کو قائم ضرور رکھا ہے اور اپنے ساتھ اپنے معاونین میں محسن رضا رضوی، سہیل فاروقی، قمر جہاں، فردالحسن کی انجمن بھی قائم کئے ہوئے ہیں، انتخاب (۳۴) سال اشاعت ۲۰۱۷ کے اداریے میں ''صحت مند ادب'' کے عنوان سے اس کی جدید غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحت مند ادب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس کے مکالمے سے معاشرہ سماجی اور اخلاقی حیثیت سے انسانی اقدار کا حامل ہو جائے۔ اس مسئلہ کا براہ

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

راست تعلق ادب کے منصب اور مقصد سے ہے۔ اگر ہم یہ طے کر لیتے ہیں
کہ ادب معاشرے کی تعمیر اور اصلاح کا ذریعہ انجام دیتا ہے تو پھر صحت مند
ادب واقعتاً انفرادی اور اجتماعی، بہتری کا وسیلہ بن جاتا ہے لیکن صحت مند
ادب کی اصلاح اس تصور پر پورے طور پر متفق نہیں ہوتی۔''

ان کا ماننا ہے کہ سرور نغمہ، سنگ تراشی، رقص اور مصوری جیسے فنون لطیفہ کی مقصدیت پر خاصی بحثیں ہو چکی ہیں ان تمام مباحث کے بعد ہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ فنون لطیفہ سے ہمیں ایک روحانی اہتزار حاصل ہوتا ہے۔ کوئی مادی ٹھوس اور خارجی افادیت کے بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے فنون لطیفہ کے اثرات ''تغیر پذیر ہوا کرتے ہیں۔ صحت مند ادب کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے ہمیں ادب کی اسی افادیت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک جماعت اس بات پر مصر ہے کہ شعر و ادب سیاسی، سماجی اور ٹھوس مقصدی موضوعات، تصورات کا تابع نہیں ہوتا۔ ادب کی اجتماعی نصب العین یا ادارہ نظریہ کا منشور نہیں بن سکتا۔ مگر معاشرے کے اقدار میں زمانی تغیرات اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ حالی صاحب کو احساس ہے کہ :

''ادب کے لئے افادیت کا کوئی جامد اور ٹھوس تصور، ادبی جمالیات کی حفاظت نہیں کر سکتا۔

پروفیسر علیم اللہ نے صحافت کے میدان میں ادبی تصورات موضوع بحث بنانے کی خاطر قدم رکھا ہے اس لئے وہ سیاسی، سماجی شعور سے الگ ایک راہ چنی ہے جہاں صرف ادب اپنی جمالیات کے ساتھ انگڑائیاں لیتا رہتا ہے اور اس میں دیگر شعبۂ حیات کی مداخلت آٹے میں نمک جیسی ہوا کرتی ہے۔ ان کی ادبی صحافت بھی وفا ملک پوری کی تربیت یافتہ ہے جہاں یافت سے زیادہ معاملہ محبت اور لگاؤ کا جس میں نقصان نہیں دیکھے جاتے ہیں۔

Rabia Khatoon
Research Scholar
Ranchi University,Ranchi

گل شمع آرا

غزل کا باوقار شاعر: طارق جمیلی

غزل ایسی صنف سخن ہے جس کے اسیر تمام شعراء نظر آتے ہیں۔ اس کے گیسوئے پُرکشش کو سنوارنے میں جو سکون و قرار حاصل ہوتا ہے وہ دیگر اصناف سے قدرے مختلف ہے۔ امیر خسرؔ سے لیکر مومنؔ اور اقبالؔ اور پھر ترقی پسندوں میں فراقؔ سے لے کر دور جدید کے شاعروں کی ایک طویل فہرست اس قبیل میں نظر آتی ہے۔ غزل مختلف دور میں مختلف مراحل سے گزرتی رہی ہے اور اس مناسبت سے اس صنف میں نمایاں تبدیلیاں بھی واضح ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے رفتہ رفتہ غزل نے اپنے اندر پوری دنیا کو سمیٹ لیا۔ آج غزل کسی مخصوص دائرہ میں قید نہیں ہے بلکہ اس صنف میں اس قدر تنوع اور رنگا رنگی کے نقوش اُبھرتے جا رہے ہیں کہ اس کی اہمیت و افادیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

طارق جمیلی کی شخصیت غزل کے حوالے سے بھی باوقار نظر آتی ہے۔ ان کی غزلیں کلاسیکی رنگ کے ساتھ جدید افکار و نظریات کی حامل نظر آتی ہیں۔ ان کی غزلیں کسی نظریاتی حدود کو نہیں مانتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں تقلید کا رنگ بھی انفرادیت کا رنگ رکھتا ہے۔ وہ مختلف ادبی نظریات سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اسی رنگ میں ڈوبنا انہیں منظور نہیں ہے۔ وہ اپنے لئے الگ راہ نکالتے ہیں جو ان کا انفراد و امتیاز قائم کرتا ہے۔ ان کی غزل گوئی میں عصری حسیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے غزل گوئی کے کئی ادوار کو بنفسِ نفیس جھیلا ہے اور ان کے فوائد اور نقصانات کو بھی اپنی نظروں سے دیکھا ہے۔ اس لئے ان کی غزلوں میں ہنگامی موضوعات بھی اقدار و معیار کے حدود میں سانسیں لیتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف ناقد پروفیسر نجم الہدیٰ کے خیالات ملاحظہ فرمائیں :

''جناب طارق جمیلی کی غزلیں اپنے موضوع اور فن کے اعتبار سے تقلید سے
ماورا ہیں، انہوں نے اپنی شاعرانہ زندگی میں ادبی نظریات اور تحریکوں کے
کئی دور دیکھے ہیں۔ ترقی پسند کا آخری دور، جدیدیت اور مابعد جدیدیت،
لیکن انہوں نے کسی روش پر کورانہ گامزن ہونا گوارا نہیں کیا۔ معاصر افکار
سے اثر پذیر ہونا اگر فنکار کے لئے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ہو تو

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

اسے تقلیدی نوعیت کا کہہ سکتے۔شاعر جو کہتا ہے اسی کو شعر کا پیکر عطا کرتا ہے
اور وہ احساس کی بھٹّی میں تپا کر پیش کرتا ہے۔تو وہ فن پارہ کبھی کبھی اعجاز بیانی
کا مظہر ہو جاتا ہے۔''

(جذب دروں:ص،۳۴،مضمون نگار، پروفیسر نجم الہدیٰ)

طارق جمیلی کی شاعری بظاہر نظم نگاری زیادہ معتبر ہونے کے باوجود بھی غزل گوئی کہیں کہیں زیادہ آگے نکل جاتی ہے۔ جہاں نظموں کی رسائی نہ ہوسکی ہے۔ان کی غزلوں کا ایک ایک شعر گہری معنویت اور عصری حسیت کا مظہر نظر آتا ہے۔اس اعتبار سے ان کی غزل گوئی فکری اور فنی دونوں اعتبار سے گراں مایہ نظر آتی ہے۔موصوف کہنہ مشق شاعر ہیں۔ان کی غزلوں میں فن کی باریکیاں حسین پیرائے میں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے صنائع اور بدائع کی تمام صنعتوں کو بڑے سلیقے سے استعمال میں لیا ہے۔ اس سے ان کی قادرالکلامی بھی بروئے کار آتی ہے۔زبان و بیان پر انہیں عبور حاصل ہے۔الفاظ کی نشست و برخاست میں ماہرانہ کمال ہنری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس طرح ان کی غزل گوئی فنی محاسن کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ موصوف کی غزل گوئی میں فنی محاسن کا اعتراف ایوب پیامی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں :

''اگر طارق صاحب کی غزلوں کا احاطہ کریں تو اور بھی سارے فنی محاسن
نظر آتے ہیں۔ طارق صاحب نے رکن، تقطیع، اور بحروں کا اس قدر خیال
رکھا ہے کہ ہر شعر اپنی جگہ مستحکم حیثیت رکھتا ہے۔عام فہم بحرین ہیں لیکن ان
بحروں میں بھی اچھے اشعار کہہ جانا یہ طارق صاحب کی شاعرانہ صلاحیت کی
آئینہ دار ہے۔ جب بات بحر اور رکن کی آئی ہے تو یہ بھی کہتا چلوں کہ
استعارے اور کنایے ان کی غزلوں میں اس طرح نمایاں ہیں کہ آنے والی
نسل کو ایک سیکھ ملتی ہے۔ اردو کے بڑے بڑے معتبر شعراء کی زمین میں
انہوں نے اچھے سے اچھے اشعار دئے ہیں۔''

(طارق جمیلی دیدۂ جوہر شناس میں:مضمون نگار، ایوب پیامی، ص ۸۶)

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ طارق جمیلی نے متقدمین اور معاصرین شعراء کی تقلید کی ہے لیکن ان کے رنگ میں انہیں ڈوبنا پسند نہیں ہے اس لئے تقلید میں بھی وہ اپنا انفراد و امتیاز قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی غزلوں میں تغزل کے مترشح اشعار بطور نمونہ پیش کر دئے جائیں جن سے موصوف کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ساتھ جدیدیت کا رنگ بھی نمایاں ہو جائے۔اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

نفرت کے شجر لوگ اُگانے لگے ہیں   ایک بیج محبت کا میں دھرتی میں تو بولوں
بولے گی غزل خود ہی کہ لکھّو مجھے طارقؔ   بس نوک قلم خونِ جگر میں تو ڈبو لوں

مرے ہم نفس تجھے کیا ہوا، تیرا چہرہ کیوں ہے بجھا ہوا   مرے پاس آ کہ چراغِ دل ترے نام پر ہے جلا ہوا
ہے نصیب شیشے کا ٹوٹنا اسے اِک نظر ذرا دیکھنا   میرے آئینے میں پتہ تو کر کہ تھا عکس کس کا سجا ہوا

تری یاد آج ابھری میرے دل میں یوں مچل کے   کوئی گیت جیسے چھیڑے نئے سُر میں ہلکے ہلکے
شب غم ہے اور ہم ہیں ترا خیال جگنو   کبھی جل اٹھا ہے بجھ کے کبھی بجھ گیا ہے جل کے

شاعری میری شبنمی ہوگی   کتنی راتوں کی یہ جگی ہوگی
شب کا انجام ہے سحر طارقؔ   تیرگی سے ہی روشنی ہوگی

مندرجہ بالا اشعار میں موصوف کی غزل گوئی کے کلاسیکی رنگ بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ان اشعار میں جدید افکار و نظریات کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ جدیدیت پسند شاعروں کئے یہاں رومانی خیالات کا فقدان ہوتا ہے، لیکن جناب طارق جمیلی کی غزلوں میں رومانی افکار و نظریات جا بجا نظر آتے ہیں۔موصوف کی ایک غزل تو مکمل رومانی رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو نظم نہیں ہے غزل ضرور کہی جاسکتی ہے۔اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

شعر غزل کا نظم حسین سی وہ آنکھیں اور وہ چہرہ   سائے گھنیرے دھوپ روپہلی وہ آنکھیں اور وہ چہرہ
نیند کی کھڑکی، دل کا آنگن، من کا پنگھٹ دل کا درپن   سپنوں کے گھر چاند کی بستی وہ آنکھیں اور وہ چہرہ
بھیگی سی شب نکرا سا دن شام سلونی عید کا چاند   دھند کی بیلا بھور کی وادی وہ آنکھیں اور وہ چہرہ
تیری غزل ہے کتنی نرالی تو نے یہ کیسی طرز نکالی   طارقؔ تیری جان سے پیاری وہ آنکھیں اور وہ چہرہ

مندرجہ بالا غزل میں رومانی افکار و خیالات کی ترجمانی نہایت سلیقے سے ہوئی ہے۔اس غزل مسلسل میں لسانی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ موصوف کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ان کی غزلوں سے سینکڑوں اشعار اس قبیل کے نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن مضمون کی طوالت پیش نظر ہے۔موصوف کی غزلوں میں جدیدیت پسند افکار و نظریات منفرد انداز میں عصری رنگ و آہنگ لئے پیش ہوتے ہیں۔اس قبیل کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

حرف اقرار ہے انکار ہے کیا ہے یہ حیات   ہر نفس مجھ سے الجھا ہے سوالوں کی طرح
زندگی مجھ کو لئے درد کے زینوں پہ چلی   خواہشیں مجھ کو نچاتی ہیں پیالوں کی طرح
کہیں سے روشنی لاؤ کہ رات بھاری ہے   چراغ دل کا جلاؤ کہ رات بھاری ہے
ترقی کے نقشے، تباہی کے طوفاں   وہ تم کو دیکھتے ہیں یہ ہم دیکھتے ہیں

حادثوں کے شہر سے گزرا ہوں میں   یہ غنیمت جانئے زندہ ہوں میں
چل رہا ہوں ایسے کہ اندھا ہوں میں   سن رہا ہوں جیسے کہ بہرا ہوں میں
شاعری دل کی ہے کہانی بھی   ہے زمانے کی ترجمانی بھی
دل وہ ٹوٹی ہوئی عمارت ہے   جس کی دیوار غم سلامت ہے
بلبل کی زباں بھول گئی نغمہ سرائی   کیا موسم گل میں وہ خزاں بھانپ رہی ہے

طارق جمیلی کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان کی غزلیں تمام نظریات سے بالاتر ہیں۔ان کی اپنی فکر ہے۔ جو انہیں راہِ فرار نہیں سکھاتی بلکہ رجائی نقطۂ نظر کی پیروی سکھاتی ہے۔مشکل حالات میں سینہ سپر رہنے اور آگے بڑھنے کی تلقین دیتی ہے۔ان کی غزلوں میں فکری پہلو نہایت روشن ہیں۔ جو نوعِ انسان کے لئے کارآمد بھی ہے اور مفید بھی ہے۔ان کی غزلیں وحدۃ الوجود کی برتری اور عظمت کی ترجمانی پیش کرتی ہیں۔ان کی غزلوں میں عصری رجحانات ومیلانات بھی واضح ہیں۔ لیکن ان سے اپنی تہذیب ومعاشرت کے اقدار ومعیار کی عظمت اور بڑائی کے بازیافت کی کوشش نظر آتی ہے۔لوگوں کو بے راہ روی اور گمراہیوں سے بچنے کی تقلین کی گئی ہے۔جس عمل سے معاشرہ اور ماحول خراب ہو ایسے کاموں سے پرہیز کرنے کی صدائے بازگشت بلند ہوتی نظر آتی ہے۔جدیدیت پسند افکار ونظریات میں ذات کا غم سب سے اہم نظر آتا ہے۔لیکن طارق جمیلی کے یہاں ایسا رجحان نہیں ملتا ہے۔موصوف کو انسان کے رشتوں کی پامالی پر نہایت افسوس ہے۔تمام رشتے اس دور میں اپنی اہمیت کھوتے جارہے ہیں۔ اس بات کا بھی انہیں غم ستاتا ہے۔مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طارق جمیلی کی غزل گوئی فکری اور فنی دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔اور اعلیٰ غزل گوئی کی تمام خوبیاں رکھتی ہیں۔اس لئے اردو غزل گوئی میں انہیں ایک محترم مقام حاصل ہے جو وقار کے درجے کو پہنچتا ہے۔

Gulshama Ara
Research Scholar
University Deptt. of Urdu
B. R. A. Bihar University
Muzaffarpur

ISSN : 2582 - 3612

امام الدین امامؔ

ولیؔ دکنی کی شاعرانہ عظمت

ولیؔ دکنی کو اردو شاعری میں ایک عظیم المرتبت وبلند قامت شاعر مانا جاچکا ہے۔اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک نیا ذہن ومزاج اردو شاعری کو دیا۔جس کی بدولت شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی، ولیؔ کی پیدائش اور وطن کے بارے میں نقّادوں کی مختلف رائے ہیں، بلکہ ان کے درمیان خاصا اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی انہیں ''اورنگ آبادی'' کہتے ہیں، تو دوسری جانب سیّد ظہیرالدین مدنی ان پر گجراتی ہونے کا دعویٰ ٹھونکتے ہیں۔اس حوالے سے سیّد ظہیرالدین مدنی کا یہ اقتباس دیکھئے :

> ''ولیؔ کا مسئلہ وطنیت عرصۂ دراز تک معرض وجود میں رہا۔اُس کو دکنی اورنگ آبادی سمجھا جاتا تھا۔ایک شاعر شمس ولیؔ اللہ اورنگ آبادی سے ولیؔ گجراتی کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔لفظ دکنی بھی غلط فہمی کا ایک سبب رہا ہے۔عہد قدیم میں پورے جنوب کو، بہ شمول گجرات، دکن کہا جاتا تھا۔تذکرہ نویسوں کے بیانات سے بھی اِس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے۔بہرحال اندرونی وبیرونی شہادتوں سے ولیؔ کا گجراتی ہونا پایا جاتا ہے۔''

(''اِنتخاب ولیؔ''، تصحیح وترتیب: ڈاکٹر سیّد ظہیرالدین مدنی، ص ۵، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ، نئی دہلی)

اگرچہ ولیؔ کے وطن کے بارے میں نقادوں کی مختلف رائے ہے جس کی وجہ سے یہ مسئلہ اور الجھ گیا ہے۔مگر کسی فنکار کا کسی خاص علاقے سے تعلق ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔کیونکہ اس کا مشاہدہ وسیع ہوتا ہے اور وہ پوری زمین پر بسنے والے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

ولیؔ دکنی، جس کو اُردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پہلے اُردو زبان وادب میں شعری نقوش نہیں پائے جاتے بلکہ ان سے بھی پہلے کئی شعراء گزر چکے ہیں اور جدید تحقیق نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ہاں یہ بات درست ہے کہ موصوف دکن کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔اور شمالی ہند میں اُردو شعروادب کا فروغ ولیؔ کی ہی مرہون منّت ہے۔جس سے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

انکارممکن نہیں۔مولانا محمد حسین آزاداپنی شہرۂ آفاق کتاب ''آبِ حیات'' میں ولؔی کے تعلق سے یہ جملے لکھتے ہیں۔مگراس مغالطے کی مناسبت سے سیّداحتشام حسین کی بات قابلِ توجہ ہے :

''ولؔی کوایک زمانے تک اُردوشاعری کا باوا آدم کہا گیا ہے۔ یہ بات تاریخی نقطۂ نظر سے تو درست نہیں کہ ولؔی کو اردو کا پہلا شاعر مانا جائے۔مگر انہیں کے چراغِ فن سے شمالی ہند میں بھی اُردوشاعری کے چراغ جلے۔''

(اردوادب کی تنقیدی تاریخ، از۔سیّداحتشام حسین، ص ۴۲)

ولؔی کے نام اور وطن کے بارے میں چاہے جتنا بھی اختلاف ہومگراس بات پرتمام نقادّوں کا اتفاق ہے کہ باضابطہ اردوغزل گوشاعر ہونے میں اوّلیت کا تاج انہیں کے سر پر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں زیادہ تر مثنویاں لکھی جارہی تھیں۔اور دکنی زبان موجودہ اردو سے مختلف تھی۔اس دور میں ولؔی نے ایک ایسا راستہ اپنایا، جس کا تصور بھی اُس عہد میں ممکن معلوم نہیں ہوتا۔جس کا اعتراف کئی نقادوں نے کیا ہے کہ ولؔی اُردو کے پہلے باقاعدہ غزل گوشاعر اور اس فن کے امام ہیں۔اس حوالے سے کتاب ''تنقیدی زاویے'' سے یہ اقتباس :

''اس بات پرتمام نقادوں کا اتفاق ہے کہ اردوشاعری میں اوّلیت کا تاج انہیں کے سر ہے۔ولؔی سے پہلے بھی شاعر ہوئے تھے لیکن ان کی زبان غیر واضح اوردائرہ فکر بہت محدود تھا۔''

(تنقیدی زاویے، از۔عبادت بریلوی، ص ۸)

درج بالا اقتباس کی مناسبت سے شاہ حاتم نے ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں اور میرحسؔن نے اپنے تذکرہ میں بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔مگر وہ عبارت فارسی میں ہے۔اس لئے اس کونقل کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔مگراسی تعلق سے ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی جو کہ دکنیات کے ماہر ہیں۔ان کا ایک اقتباس دیکھئے :

اگرچہ یہ امرصحیح نہیں کہ ولؔی اردو کا پہلا شاعر تھا۔مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شمالی ہند میں ولؔی کے بعد ہی اُردوشاعری کا عام طور سے آغاز ہوا اور اب تک جوشاعری دکنی میں مروج تھی ۔اس کی بھی اصلاح ہوئی۔اس لحاظ سے ولؔی کے سرمجدوی کا سہرا ضرور باندھا جاسکتا ہے۔''

(اردواورمشترکہ ہندوستانی تہذیب،مضمون نگار،ڈاکٹر مسزافتخاربیگم صدیقی،ص ۸۶)

ولؔی نے جواحسان اُردوشاعری پر کیا ہے۔اس سے کسی صورت میں احتراز ممکن نہیں ہے۔اس

نے شاعری کوایک نئی دنیا سے روشناس کرایا،جمودکوتوڑ کرایسی روح پھونک دی کہ اس سوئی ہوئی شئے کے کان میں میٹھی اور مدھرانداز میں ایسی آواز دی کہ اس میں جان پڑ گئی۔اسی کی بدولت ہرگھر میں شاعری کے چرچے شروع ہوگئے۔خواص وعوام کے زبان پرشاعری کے نغمے سنائی دینے لگے۔اس تعلق سے ''آبِ حیات'' میں مولانامحمد حسین آزاد کہتے ہیں :

''ولؔی نے آکرایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اوراثر اس کا دفعتہً حرارت برقی کی طرح دِل دل میں دوڑ گیا۔گھر گھر میں شاعری کا چرچہ ہے۔''

(آبِ حیات،مولانامحمد حسین آزاد،ص ۸۱)

ولؔی نے شمالی ہند میں اردوشاعری کا ایک نیاباب قائم کیا۔جس کے نتیجے میں جواُردو دہلی میں پیدا ہوئی تھی۔پھراس کی آؤ بھگت دلی میں ہونے لگی اور شعراء اپنی توجہ کواسی پرمرکوزکردئے۔اورشعرگوئی میں اپناجوہردکھانے لگے۔

ولؔی کی شاعری میں کئی رنگ قوس وقزح کی مانندنظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں عشق کی پاکیزہ واردات کا بیان ہوا ہے۔ولؔی نے پہلے پہل اردوشاعری کو فارسی کے نئے اسلوب وتراکیب تشبیہات و استعارات سے متعارف کرایا۔اس نے شمالی،دکنی اور فارسی کی آمیزش سے شاعری کا ایک نیاخمیر تیار کیا۔پہلے غزل صرف ناز وادا،حسن و جمال،رنگ رلیاں،جنس وجسم اور خارجی پہلو تک ہی محدود تھی۔ ولؔی نے غزل کے کئے ایک نیاراستہ ہموارکیااوراس میں تنوع،داخلیت،تجربات ومشاہدات کوداخل کرکے اس کے دائرے کووسیع کرنے کی کامیاب سعی کی،جس میں پوری کائنات سمٹ آتی ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''ولؔی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمالی ہند کی زبان کودکنی ادب کی طویل روایت سے ملاکرایک کردیااورساتھ ساتھ فارسی رچاوٹ سے اس میں اتنی رنگارنگ آوازیں شامل کردیں اورامکانات کے اتنے سرے بھی اُبھاردئے کہ آئندہ دوسوسال تک اردوشاعری انہیں امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی اسی لئے ولؔی آئندہ دوسوسال کی شاعری کی نظام شمسی کا وہ سورج ہے جس کے دائرہ کشش میں اردوشاعری کے مختلف سیارے گردش کرتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو،جلداوّل،ازڈاکٹر جمیل جالبی،ص ۵۲۹)

ولی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اردو شاعری کو جو فارم عطا کیا اور اس سانچے میں ڈھال دیا جو آج تک موجود ہے۔غزل کے ساز پر جو نغمے موصوف نے چھیڑے تھے۔غزل کی دنیا میں وہ اسی لئے آج بھی نیک نام ہیں۔

ولی کی کلیات میں یوں تو مثنوی،قصیدہ،غزل،قطعات،خمسے وغیرہ موجود ہیں۔مگر ان کا سب سے عظیم کارنامہ جس نے ان کو شہرت دوام عطا کیا وہ موصوف کی غزل گوئی ہے۔ولی کے یہاں غزل اپنے پورے آب و تاب، سج دھج، رکھ رکھاؤ اور فنی رچاؤ کے ساتھ نظر آتی ہے۔موصوف کی غزلوں میں جو تازگی، زیبائی، رعنائی، دلفریبی، جاذبیت، دلکشی وغیرہ پائی جاتی ہیں۔وہ بہت ہی کم شاعروں کے حصّے میں آتی ہے۔ولی نے فکر و آہنگ کو ایک ایسے اچھوتے نمونے کے طور پر پیش کیا ہے کہ اردو غزل کا نیا آہنگ قرار دیا گیا۔مزے کی بات تو یہ ہے کہ اسی زمانے میں اس آہنگ کو مقبولیت کا تمغہ بھی حاصل ہوگیا۔ولی کے عشق میں حقیقی اور مجازی دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔چنانچہ وہ دونوں کے شیدائی ہیں۔اس لئے ولی کہتا ہے۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کیا
مجھے بولیاں کہ تو واقف نہیں عشق حقیقی سوں　　تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا

ولی کی غزلوں میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ولی کا محبوب جو بھی ہو، وہ اپنے نکھرے ہوئے جمالیاتی شعور کی مدد سے حسن محبوب کی بڑی دلکش تصویریں اپنی غزلوں میں پیش کی ہیں۔انہوں نے حسن کو مختلف زاویوں سے اور مختلف رویوں میں دیکھا ہے، ولی نے اپنی غزلوں میں محبوب کی ناز، و ادا، شوخی و شرارت، کا بڑے ہی خوشنما انداز میں عکاسی کی ہے۔جس میں محبوب کے قد قامت، لب و رخسار، زلف کی درازی اور سیاہی، تل، محبوب کی کجروی چال، حیا و پردے کا خوب بیان ہوا ہے۔اشعار دیکھئے۔

وہ ناز میں ادا میں اعجاز میں سراپا　　خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا
ہوا ہے جب سوں ترا تلِ سوارِ آتشِ حسن　　سپند وار ہے دل بے قرارِ آتشِ حسن
چلنے منیں اے چنچل ہاتی کوں لجاوے توں　　بے تاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
جو کوئی سمجھا نہیں اُس مکھ کے آنچل کے معانی کوں　　وو کیوں بوجھے کہو اس شوخ چنچل کے معانی کوں

ولی وصال کا شاعر ہے۔وہ اپنے محبوب کی تعریف میں خوب نغمہ سرا رہتا ہے۔بعض مقامات پر ولی دکنی نے محبوب کے حسن کی تعریف و توصیف میں ایسے اشارے اور استعارے کا استعمال کیا ہے جو خالص تخیل کی بلند پروازی کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہے۔مگر الفاظ کا استعمال اس ہنرمندی سے ہوا ہے کہ حسن کے تصور پہ کوئی حرف نہیں آتا۔بلکہ احساس کو متاثر کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔جیسے اس نے اپنے محبوب کے

ISSN : 2582 - 3612

چہرے کو فارسی شاعر انوری کے قصیدے سے تعبیر کیا ہے اور اس کے گھر سے شرماتے ہوئے نکلنے کو کہا ہے کہ جیسے سورج پورب سے طلوع ہو رہا ہو۔شعر دیکھئے۔

توں سر سے قدم تلک جھلک میں　　گویا ہے قصیدہ انوری کا
ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں　　کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

اس کے اشعار میں قنوطیت یاس و ناامیدی نہیں کے برابر پائی جاتی ہے۔جس کے نمونے تو ملتے ہیں۔مگر اصل میں وہ وصل کا ہی شاعر ہے اور اپنے محبوب کا سامنا چاہتا ہے۔مگر اس کے سینے میں بھی دھڑکتا ہوا دل ہے اور محبوب کی جفاکاری کا کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
طاقت نہیں کسی کو کہ اِک حرف سن سکے　　احوال گر کہوں سوں پلک آشناں نہیں

ولی کی شاعری کا موضوع عشق حقیقی اور مجازی دونوں ہے فلسفہ و تصوف کی بھی تصویر جھلکتی ہے۔مگر بنیادی طور پر وہ عشق و حسن کا شاعر ہے۔وہ اپنے محبوب کے اداؤ و بانکپن کی عکاسی اپنی شاعری کے ذریعے کرتا ہے۔اس خاص میدان میں اس کا کارنامہ یہی ہے کہ وہ ہماری روح میں چپکے سے اتر جاتا ہے۔اس کی شاعری میں قوس وقزح کے سارے رنگ موجود ہیں۔مگر وہ رنگوں میں لال (سرخ) رنگ اس کو زیادہ عزیز ہے۔جس سے وہ اپنے محبوب کی رنگارنگی اور لب و رخسار کی لالی کا تذکرہ کرتا ہے اور اسی سرخ رنگ کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔اس حوالے سے شعر پیش خدمت ہے۔

رشک سوں تجھ لباں کی سرخی پر　　جگر لالہ داغ داغ ہوا
پڑیا ہے لعل پر تو صنم تجھ لب کی لالی کا　　بیاں ہے ہر سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا

مذکورہ باتوں کی تصدیق کے لئے میں چند جملے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس سے میری باتوں کو تقویت ملے گی۔ملاحظہ ہو :

''ولی کی شاعری کا موضوع فلسفہ و تصوف کے حقائق یا پیچیدہ و دقیق مسائل حیات نہیں۔وہ بنیادی طور پر حسن و عشق کا شاعر ہے............ولی کی شاعری میں ویسے تو قوس وقزح کے سارے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔مگر ان کو خاص دلچسپی سرخ اور سنہرے رنگ سے ہے جو کہ خوشی اور زندگی و روشنی کے رنگ ہیں۔''

(اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مضمون نگار، ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی، ص۔ ۸۸)

جیسا کہ اوپر میں بیان ہوا کہ ولی کی شاعری میں رنگوں کی قوس وقزح موجود ہے۔اس کے یہاں جب محبوب کے لب، چہرہ اور رخسار کی تعریف کرنی ہوتی ہے تو سرخ رنگ کا تذکرہ ملتا ہے۔اس کے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

علاوہ قبا کی تعریف صندلی رنگ سے ،لباس کا بیان سبز رنگ سے اسی طرح جب محبوب کے رخ انور کا بیان ہوتا ہے تو دوسرا رنگ جھلکتا ہے۔زلفوں میں رات کی سیاہی ۔جس سے ان کی شاعری قوس وقزح کی مانند کئی رنگوں کا مجموعہ نظر آتی ہے ۔اس حوالے سے چند اشعار قابلِ غور ہیں ۔

ہوا قدِ سرو کے مانند صنم کا   لباس سبز سوں سر تا قدم سبز
اے ولیؔ درد سر کی دارو ہے   مجھ کوں اُس صندلی قبا کی ادا
نام اس دو رنگے کا کیوں نہ ہو گل رعنا   چہرہ ارغوانی ہے جامہ زعفرانی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر   ناگنی جوں کنویں پر پیاسی ہے

ولیؔ کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ اشعار جدید دور کی تخلیق ہے۔جس کو سمجھنے میں زیادہ دماغی ورزش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جہاں دکنیت کی گہری چھاپ دیکھنے کوملتی ہے۔مگر یہاں جس غزل کی طرف اشارہ ہے ۔اس میں عام انسانوں کو درپیش مسائل کا بیان ہوا ہے۔ان کا انداز بیان بالکل سادہ، سلیس اور رواں ہے۔اس طرح کے اشعار پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ یہ آج کے دور کے اشعار ہیں ۔شعر قابل توجہ ہے ۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے   مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ولیؔ کی شاعری میں اتنے رنگ موجود ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا یہاں مقصود نہیں کیونکہ خوف طوالت کا بھی سامنا ہے۔مگر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ولیؔ ایک بڑا فنکار ہے۔جس کی تخلیقات فنی اور فکری دونوں لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور تقریباً تین سو سال سے زیادہ عرصہ بیت جانے کے بعد بھی اس میں وہی رنگینی و رعنائی، دلکشی و دلفریبی پورے طور پر منجمد ہے، جو ان کو دیگر شعراء سے ممتاز وانفرادیت عطا کرتی ہے۔موصوف کا پیرایہ بیان بھی منفرد نظر آتا ہے جو موصوف کو ایک بڑا شاعر کہلوانے کے لئے کافی ہے۔ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں :

> ''ولیؔ کے آرٹ کا انفرادی رنگ مجموعاً ان کے پیرایۂ بیان سے متعلق ہے اور اگر معانی اور پیرایۂ بیان کو الگ الگ دیکھنے کی اجازت مل سکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ ولیؔ کے پاس کوئی معانی تو موجود نہیں البتہ ان کے پیرایۂ ہائے بیان میں انفرادیت اور ندرت ضرور ہے۔ وہ درحقیقت پیرایہ ہائے بیان ہی کی بنا پر بڑے شاعر قرار دئے جاسکتے ہیں۔''
>
> (ولی سے اقبال تک، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ص ۳۱)

اسی لئے تو ان کی شعر گوئی کا معترف ہونا ہی پڑتا ہے اور بڑے بڑے فنکاروں نے اس انداز

ISSN : 2582 - 3612

سے شہادت دی کہ

ولیؔ تجھ طبع کے گلشن میں جو کُئی سیر کرتے ہیں   وہ تحفہ کر لے جاتے ہیں تری گفتار ہر جانب

اور اسی تحفہ کو شمال وجنوب میں ہر چہار جانب پیش کیا گیا اور اساتذۂ فن نے اس کو فخر کی نگاہوں سے دیکھا۔چانچہ حاتم کہتے ہیں

حاتمؔ یہ فنِ شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں   لیکن ولیؔ ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبرو نے کچھ اس انداز سے مدح سرائی کی ہے

آبروؔ شعر ہے ترا اعجاز   پر ولیؔ کا سخن کرامت ہے

خدائے سخن ،شاعرِ بے دماغ میر تقی میرؔ بھی کہاں چپ بیٹھنے والوں میں تھے۔انہوں نے بھی کہہ ڈالا

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے   معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولیؔ دکنی کو محمد حسین آزاد نے مشہور فارسی شاعر رودکیؔ اور انگریزی شاعر چاسرؔ کا ہم پلّہ گردانا ہے۔کیونکہ ولیؔ نے اردو شاعری کو ایک نئے فارم اور نئے اسلوب سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔جس کے احسان سے اردو شاعری کبھی سرنہیں اٹھا سکتی۔اخیر میں آزاد کے اس خیال پر اپنی بات کو ختم کروں گا :

> ''انہیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسرؔ شاعر کو اور فارسی میں رودکیؔ کو۔''
>
> (آبِ حیات، مولانا محمد حسین آزاد، ص۔۸۳)

ولیؔ کے کلام میں ایرانی اور ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی آمیزش نے ایک نئی ڈگر بنائی۔اس کی شاعری میں ہندو مذہب کے رہنماؤں، پیشواؤں اور آستھاؤں کو بڑے ہی فنکارانہ ڈھنگ سے سمونے کی کوشش کی ہے ۔ان کے یہاں ، رام ،لچھمن ،سرسوتی ،سیتا،لکشمی ،کرشن ،گنگا اور جمنا وغیرہ کا خوب استعمال ہوا ہے۔جس سے ان کی شاعری میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی بھی دلکش مثال ملتی ہے۔سیّد احتشام حسین رطب اللسان ہیں :

> ''ہندوستانی زندگی کی تصویریں بھی ولیؔ کے یہاں کم نہیں ہیں۔گنگا جمنا، کرشن، رام، سرسوتی، سیتا،لکشمی سبھی کے نام ان کے کلام میں بار بار آتے ہیں اور تہذیبی وحدت کی جانب بڑھتے ہوئے تصورات کا اشاریہ ہیں۔''
>
> (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سیّد احتشام حسین، ص ۴۳)

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی عمدہ مثالیں ولیؔ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔جس کی نشاندہی کئی معتبر نقادوں نے کی ہے۔بشمول ''سیّد مجاور حسین'' نے بھی اپنی کتاب میں بڑے ہی فراخدلانہ انداز میں کیا ہے۔مثال کے طور پر صرف دو اشعار پیش خدمت ہے ۔

کفر کوں توڑوں سوں دن میں رکھ کر نیت خالص   ہوا ہے رام بن حسرت سوں جا پچھمن سوں رام اس کا

جوں شمع گل پڑیں گے شرمندگی سوں گل رو   جس انجمن میں حاضر گوبند لال ہوگا

مذکورہ اشعار ہندوستانی تہذیب وتمدن کی عمدہ مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔ولیؔ نے تقریباً تمام اصناف سخن میں زور آزمائی کی ہے۔قصیدہ میں انہوں نے کسی امیر،نواب یا بادشاہ کی مدح نہیں کی مگر کچھ اشعار ملتے بھی ہیں۔مثال ملاحظہ کیجئے ۔

کیوں نہ ہووے عشق سوں آباد سب ہندوستاں   حسن کی دہلی کا صوبہ ہے محمد یار خاں

ولیؔ کی تمام شاعری کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں اور مقصود بھی نہیں ہے۔مشت نمونہ از خروارے۔چند مثالیں اور دلیلیں پیش کی گئیں ہیں انہیں پر اپنی باتوں کو ختم کرتا ہوں۔اخیر میں ولیؔ کی نذر غالبؔ کا یہ شعر کہ ۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا !

Imamuddin Imam
(JNU,New Delhi)
S/O.- Md. Salahuddin
Vill- Damodari
P.O.- Bishundattpur
Via- Patanhi
Muzaffarpur
Bihar- 843113
Mob.- +91 620691 43783

''ساغرِ ادبْ'' کا آٹھواں شمارہ (آپ کی نظر میں)

☆ عزیزی پروفیسر سیّد آلِ ظفر!   سلامت رہئے اور خوش رہئے۔

سِہ ماہی ''ساغرِ ادبْ'' کے آٹھویں شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء کی اشاعت کے دوران یونیورسیٹی پروفیسر کے عہدے پر آپ کے اِرتقاع اور استحکام، دونوں کے حظ سے بہرہ ور ہونے کی دلی مبارکباد دینا مقدم سمجھتا ہوں۔یہ شمارہ بھی حسب سابق خوب سے خوب تر کی طرف پیش رفت کا آئینہ ہے۔اتنا ضخیم سِہ ماہی جریدہ اور اتنا وقیع! کون کہے گا کہ یہ انمول نہیں ہے۔پڑھئے اور لطف اٹھاتے جائیے۔دل بہلتا رہے، وقت گزرتا رہے اور پڑھنے والا کبھی بدحظ نہ ہو۔مجھے جب یہ شمارہ موصول ہوا تو میں ابھی تک جستہ جستہ پڑھے جا رہا ہوں، لیکن ابھی تک چند مضامین کو چھوڑ کر سارا کچھ پڑھ نہیں پایا۔یہ نہیں ہے کہ میں پڑھنے میں خدانخواستہ سست رفتار ہوں، بلکہ سبب یہ ہے کہ میرے پاس وقت کی کمی ہے۔

اس بار بھی مسئلہ وہی ہے کہ کس کے بارے میں اظہار خیال کروں اور کس کے بارے میں نہ کروں۔اس شمارے کو جتنا پڑھا وہ کم ہے، اور جتنا لکھنا چاہتا ہوں، وہ بھی تأثرات کے اعتبار سے کم ہے۔حمد اور نعت کے بارے میں اظہار خیال بھی محتاط بنا دیتا ہے کہ کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے۔سیّد محمد نور الحسن نور کی حمد پاک بھی خوب ہے اور فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحبؒ کی نعت پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو کہنا ہی کیا۔ہر شعر اور اس کا ہر مصرع دل میں بسانے اور آنکھوں کا سرمہ بنانے کو جی چاہتا ہے۔پروفیسر فاروق احمد صدیقی کا مضمون ''پروفیسر سیّد محفوظ الحسن کی تنقید نگاری'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ڈاکٹر ارمان نجمی کا تذکرہ اس مضمون میں پڑھنے کے بعد آنکھ پُرنم ہوگئی۔مجھ سے بھی مرحوم کے گہرے مراسم تھے۔مضمون مختصر ہے اور محفوظ الحسن صاحب کی تنقید نگاری کے حوالے سے مشمولات کم ہیں۔رفعت حسام مینا کے مجموعۂ غزلیات ''مینائے غزل'' سے جو پانچ اشعار نقل کئے گئے ہیں ان میں پہلا شعر اور آخری شعر محلِ نظر ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ پروف ریڈنگ میں کمی رہ گئی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اس شمارے میں مشرف عالم ذوقی کا مضمون شامل ہے اور تازہ شمارے میں جو آپ کے ہاتھوں میں ہے ان پر اظہار ماتم بجاطور پر کیا گیا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے جن رفتگاں کی یاد میں قلم اٹھایا اور بجاطور پر زندۂ جاوید قرار دیا، آج وہ خود انہیں کی صف میں جا ملے ہیں۔ذوقی نے مرحوم عرفان صدیقی سے ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری کو بجاطور پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔میری بھی عرفان صاحب سے مشرف صاحب کی بہ نسبت کہیں زیادہ ملاقاتیں رہی ہیں اور ان سے میری قریبی قرابت داری بھی ہے۔ڈاکٹر درخشاں زرّیں اور ڈاکٹر صادق حسین کے مضامین بھی بہت اچھے اور توجہ طلب ہیں۔اس بار ریسرچ اسکالرس کے گوشے میں بھی بہت سے مضمون نگار جالب توجہ ہوئے۔سب کا ذکر مکتوب کو مضمون نہ بنا دے اس ڈر سے میں صرف دو ناموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔روشن پروین کا مضمون ''منظر اعجاز کی غزلوں کا آہنگ'' اور غزالہ حفیظ کا مضمون ''امام بخش صہبائی کی فارسی شاعری'' بہت پسند آئے۔

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

رخصت ہونے سے پہلے ایک بار پھر اردو رسم الخط کو زندہ رکھنے کی کوششیں کرنے کی گزارش کرتا ہوں تا کہ سوسال بعد ''ساغرِ ادبؔ'' کو روانی کے ساتھ پڑھنے والا اردو کے وطن ہندوستان میں مل جائے۔

دعا گو

(پروفیسر) نجم الہدیٰ، مظفر پور

☆ عزیزی پروفیسر سیّد آلِ ظفر!

سہ ماہی ''ساغرِ ادبؔ'' کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء پیشِ نظر ہے۔ صوری و معنوی دونوں لحاظ سے بہت ہی گراں قدر ہے۔ اداریہ میں آپ نے اردو کے اہم ستون شمس الرحمٰن فاروقی کی المناک موت پر بڑے موثر پیرائے میں خراج تحسین پیش کیا ہے اوران کی موت کو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ آپ نے اس مقولے پر عمل کر کے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ جناب نورالحسن نور نوابی عزیزی کی حمد اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی نعت پاک بہت ہی عمدہ اور ایمان افروز ہیں۔ حصہ مضامین ومقالات میں نذیر فتح پوری، مشرف عالم ذوقی اور ڈاکٹر محمد صادق حسین کی کاوشیں کامیاب ہیں، دیگر مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ گوشہ ریسرچ اسکالرس کو بھی آپ نے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ اورنئی نسل سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ بڑی کشادہ قلبی کی بات ہے۔ خدا کرے ''ساغرِ ادبؔ'' اسی طرح ارتقائی منازل طے کرتا رہے۔

پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مظفر پور

☆ مدیر محترم   سلام ورحمت

سہ ماہی ''ساغرِ ادب'' کا آٹھواں شمارہ بابت جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء ملا۔ پابندیٔ وقت کا سلیقہ کوئی آپ سے سیکھے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری سرپرستی کے محض اپنے ادبی جنون اور چند لوگوں کی معاونت سے لگاتار اتنا اچھا رسالہ کیسے نکال رہے ہیں۔

بہرحال اس شمارہ کا آغاز بھی اردو کی لازوال روایت سے ہوا ہے۔ آج کل رسالوں کے قارئین عموماً حمد اور نعت کی خصوصیتیں اور کنہیات پر اظہارِ خیال نہیں کرتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ان متبرک صنفوں میں محض مذہبی اور عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار نہیں ہوتا ہے، فنکاری بھی ہوتی ہے۔ سیّد محمد نورالحسن نور نوابی عزیزی کی حمد میں کئی شعریت بداماں اشعار ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے جس مقدس بیخودی کے عالم میں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں روحانی حاضری دی ہے، اس کا عکس اس مرصع نعت شریف کے ہر مصرع میں ایسا عیاں ہے کہ پڑھ کر صاحب دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جہاں تک نثری مشمولات کا تعلق ہے، پچھلے شماروں کی طرح ان میں کئی بہت اچھے اور اچھوتے مضامین ہیں۔ مثلاً اُردو کے خاموش قلم کار پروفیسر سیّد محفوظ الحسن کی کتاب ''نظر و بصر'' کا تفصیلی جائزہ لے کر پروفیسر فاروق احمد صدیقی نے بڑے سلیقے سے ان کے تحریری امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ گلزار کی شخصیت اور شاعری پر نذیر فتح

پوری کا مضمون کافی پرانا ہے مگر اس میں انہوں نے گلزار کی نظموں اور غزلوں کا جس خوبصورتی اور باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے، اس کی اہمیت اور معنویت اب بھی ہے۔ تیسرا مضمون جو میرے ذہن پر دیر تک چھایا رہا، مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ انہوں نے شہریار، عرفان صدیقی اور نعمان شوق کا شاعری کے حوالے سے کولاز بنایا ہے جس میں ذوقی کی تخلیقی زبان اور دلکش طرز تحریر جا بجا ایک سحر طاری کرتی ہے۔ مواد کی ترتیب اور پیرایہ اظہار کی وجہ سے مضمون میں جان پڑ گئی ہے۔ کئی اور مضامین قابلِ مطالعہ ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔

نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر محمد رستم انصاری کے مضمون کا عنوان ''بہار میں آزادی کے بعد مطبوعہ تحقیقی مقالے: ایک طائرانہ نظر (۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۹ء تک)'' بہت اچھا ہے مگر انہوں نے موضوع سے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کا مواد نامکمل، ناقص اور گمراہ کن ہے۔ کہیں سند یافتہ تحقیقی مقالوں کے نام یا مصنف کے نام غلط ہیں تو کہیں مصنف کے نام ہی غائب ہیں۔ انہوں نے چھان بین سے کام نہیں لیا ہے۔ ادھر اُدھر جو نظر آ گیا، اسے آدھے ادھورے طور پر پیش کر دیا ہے۔ ایسے مضامین شائع کرنے سے گریز کیجئے، رسالے کے معیار پر ضرب آتی ہے۔

خیر خدا کرے آپ کا ادبی جنون برقرار رہے اور اردو دنیا میں اس رسالے کی ساکھ مستحکم ہو۔

پروفیسر رئیس انور، دربھنگہ

☆ برادرم پروفیسر سیّد آلِ ظفر   السّلام علیکم

کورونا وائرس کے اس دور میں ہر شخص پریشان ہے۔ ایک طرف زندہ رہنے کی تمنا اپنی طرف کھینچے ہے تو دوسری طرف موت کے سائے اور احباب کے دنیا سے چلے جانے کی خبریں مایوس کر رہی ہیں۔ ایسے تشویشناک حالات میں بھی آپ ''ساغرادب'' جیسا خالص علمی و ادبی اور موقر و معیاری رسالہ شائع کر رہے ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آپ علم و ادب کی خدمت ایک سچّے اور بے لوث سپاہی کی طرح کر رہے ہیں۔ ''ساغرادب'' کا تازہ شمارہ جنوری تا مارچ 2021ء موصول ہوا۔ آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا صوری و معنوی حسن سے مزیّن یہ رسالہ یقیناً رسائل کی بھیڑ میں بہت معیاری اس لحاظ سے ہے کہ اس میں جتنے بھی تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ معلوماتی اور ادبی و اسلوبیاتی اعتبار سے ایک قاری کے لئے بیش بہا قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بھی ادبی رسالے کے معیار کو جانچنے پرکھنے کا واحد ذریعہ اُس کی حسن ترتیب اور مضامین کی انفرادیت ہے۔ آج کل کے دور میں کوئی علمی و ادبی رسالہ شائع کرنا اور پھر پابندی سے شائع کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہی جانتا ہے جو اس خاردار راستے سے گزرتا ہے۔ اتنا ضخیم رسالہ نکالنا اور پورے مواد پر نظر دوڑانا کہ کوئی لفظ یا جملہ کسی تنازعے کا باعث نہ بنے بہت بڑی ذہنی کوفت اور ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کام کے لئے صبر و تحمل اور زبان و ادب کی گہری واقفیت بنیادی شرط ہے۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ جیسے ذہین و متین، خوش اخلاق و خوش مزاج اور علمی و ادبی ذوق و شوق کے حامل شخص نے مجھ جیسے کم علم کو ''ساغرادب'' کی سیر کرادی۔ میری نظر میں یہ ادب

کا مہا ساغر ہے۔ایسا علمی وادبی رسالہ تا قیامت اسی طرح شائع ہوتا رہے یہ میری تمنا ہے!۔میں سب سے پہلے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور پھر اُن قلم کاروں کو سلام کرتا ہوں کہ جنھوں نے نہایت محنت ولگن اور علمی وادبی ذوق وشوق کی بنیاد پر بصیرت افروز مضامین لکھے ہیں۔اللہ نے چاہا تو انشااللہ ناچیز کا قلمی تعاون آپ کو برابر حاصل رہے گا۔میں انشااللہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں وکشمیر) کے شعبۂ اردو میں اس معیاری رسالے کو اساتذہ اور طلبہ میں متعارف کراؤں گا۔میری یہ کوشش رہے گی کہ اردو کا ہر ریسرچ اسکالر اس کا مطالعہ کرے اور اس کے اندر چھپے مواد سے مستفید ہو۔میری نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

آپ کی نیک دعاؤں کا طالب

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی (جموں وکشمیر)

☆ پروفیسر سید آلِ ظفر صاحب السلام علیکم

محترم آپ کا محبتوں اور خلوص سے بھرا، خوشبو سے مہکتا، مختلف خیالات واحساسات سے لبریز، بہترین نظریات اور مشاہدات سے معمور کتابوں کا خوبصورت ارسال کردہ بے نظیر تحفہ مجھے اپنے یومِ پیدائش ۲۱ مئی کو موصول ہوا۔جس میں ''ساغرادب'' کے پانچ شمارے، ''ادبی جرنل'' کا ایک شمارہ اور ایک کتاب ''قواعد شناسی'' شامل تھی۔

کبھی آنکھیں کتاب میں گم ہیں   کبھی گم ہے کتاب آنکھوں میں

یہ کتابیں ہی نہیں میری زندگی کا بیش قیمتی اثاثہ ہیں۔بے شک کتابیں علم وآگہی کا بہترین زینہ، زندگی کی ناہموار راہوں میں دلنواز ہم سفر اور اضطراب وبے چینی کی معالج بھی ہیں۔اندھیروں میں روشنی کا مینار ثابت ہوتی ہیں۔تنہائی میں بہترین ساتھی، ہماری تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ علم وادب واخلاق کا آئینہ بھی ہیں۔کتابوں سے ہمیں روحانی تسکین اور علمی ادبی تشنہ دہانی کی سیرابی نصیب ہوتی ہے۔

آپ کے جو رسائل مجھے ملے ہیں ان میں اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء، اپریل تا جون ۲۰۲۰ء، جولائی تا ستمبر ۲۰۲۰ء، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۰ء اور جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء تک کے سلسلہ وار اٹھارہ ماہ کے ادبی منظر نامے سے روشناس کرایا ہے۔انشاء اللہ یہ کتابی سلسلہ جاری رہے گا اور میرا ماننا ہے کہ کتاب رکھنا زیادہ اہم نہیں بلکہ کتاب کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔کسی مفکر کا قول بھی ہے کہ اگر دو دن تک کسی کتاب کا مطالعہ نہ کیا جائے تو تیسرے دن اندازِ تکلم تبدیل ہو جاتا ہے۔شکریہ آپ کا کہ آپ نے مطالعہ جاری اور شیرینی برقرار رکھنے کے لیے یہ سرمایہ عطا کیا۔

ہم پہلے کبھی ملے نہ تھے مگر ان کتابوں کے ذریعے نہ صرف آپ سے واقفیت حاصل ہوئی بلکہ آپ نے بیشمار ادبی شخصیات سے ملاقات کروا دیں۔خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اچھی کتابیں اور ایسے دوست رکھتے ہیں جو کتاب دوست ہوں، یقیناً میں خوش نصیب ہوں کہ میرے دوستوں، کرم فرماؤں اور

رہنماؤں میں آپ جیسے دوست کا اضافہ ہوا۔آپ کا ممنون ہوں کہ ان نامساعد حالات میں بھی مجھے اس عظیم سوغات سے نوازا۔آلِ ظفر صاحب آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا ''ساغرِ ادب'' یقیناً ایک معیاری ادبی رسالہ ہے۔آپ کا تعلق پوسٹ گریجویٹ شعبہء اردو، بی۔آر۔اے۔ بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے ہے۔یہ جان کر مسرت ہوئی۔آپ کی شخصیت بہت مخلصانہ اور اندازِ گفتگو نہایت شگفتہ اور شیریں ہے۔

بہر حال مظفر پور سے شائع ہو رہے سہ ماہی ''ساغر ادب'' (پیئر ریویوڈ اردو جرنل) ISSN-2582-3612 میں دنیا بھر کے تمام مسائل اور موضوعات کا ایک جہان ہے جنہیں یک بارگی پڑھنے کا موقع ملا۔ان رسائل میں حمدیہ شاعری، نعتیہ شاعری، نظمیہ شاعری کے ساتھ ساتھ نامور شخصیات مختلف ادباء، شعراء، محققین، ناقدین، تحقیق وتنقید، اردو زبان ولسانیات، کلاسیکل اور جدید غزل، ناول، افسانے، ڈرامہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، تصوف، سفر نامہ، صحافت، انشائیہ، قصیدہ نگاری، خطوط کی معنویت، ادب اطفال، ادب لطیف، مختلف شعری اسالیب، اسلوبیاتی مطالعہ، تاریخ نگاری، سوانح نگاری، نثر ونظم کی روایت، فنونِ لطیفہ، اسلامی اور قرآنی فلسفے، اردو کے غیر مسلم خواتین وحضرات کی تخلیقات، سلاطین، امراء، ہندوستانی ادب، عوامی ادب، تبصرے، اداریے، تنقیدی نظریات، نثر پاروں کے اجمالی جائزے، نظموں کے فکری وفنی پہلو، عصر حاضر کے مسائل وموضوعات، علمی ادبی اور سماجی تحریکیں، سورداسؔ، کبیر داسؔ، گرو ہر گوبند سنگھ جی جیسی روحانی شخصیات، ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ترقی پسندی، دبستان دہلی و لکھنؤ، سنیما، تحریکِ آزادی، آزادی سے قبل، آزادی کے بعد، حب الوطنی، قومی یکجہتی، تعلیم نسواں اور تانیثیت وغیرہ جیسے موضوعات سے بھر پور ان رسائل میں مختلف ریاستوں اور شہروں کے ادب سے بھی واقفیت ہوئی۔ان رسائل کے مشمولات کو دیکھ کر یقیناً اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اس کے معیار کو ابتدائی دور سے ہی برقرار رکھنے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے۔جہاں ایک طرف نامور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے مضامین ان رسائل میں شامل ہیں وہیں دوسری جانب آپ نے گوشہء ریسرچ اسکالرس کے تحت نئے قلمکاروں کو بھی قلم فرسائی اور طبع آزمائی کے لئے آمادہ کیا ہے۔جو ایک خوش آئند بات ہے۔

دورِ حاضر کے تمام اردو رسائل میں آپ کا رسالہ حالاتِ حاضرہ کے بے شمار وسائل اور مسائل سے ہمیں دوچار کرتا ہے۔کس شمارے کی بات کروں اور کس مضمون کا ذکر چھیڑوں، کس شعر یا نظم کا حوالہ دوں، بس یہی کہتا ہوں کہ آپ جس جانفشانی سے یہ کام انجام دے رہے ہیں اللہ آپ کی توفیقات میں اضافہ کرے اور آپ کو مزید وقت اور سہولت عطا فرمائے کہ آپ یہ علمی وادبی کام سر انجام دیتے رہیں۔ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ کسی ادبی رسالے کا نکالنا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہنا لازمی ہے۔ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور ہم سب ایک دوسرے کے لیے معاون ومددگار ثابت ہوتے رہیں۔آمین۔

آپ کی پوری ٹیم کے ساتھ ہماری دوستی کا ذریعہ بنے اپنے عزیز، دوست، بھائی کفایت حسین کیفی کا بھی شکرگزار ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان ایک پُل کا کام کیا۔

ڈاکٹر عرفان عارف، جمّوں

☆ مدیرِ محترم السلام علیکم

اس نامساعد حالات میں جس تندہی سے آپ ''ساغرِ ادبؑ'' کو بروقت طبع کرا کر قارئین کو دستیاب کرا دیتے ہیں، وہ لائقِ ستائش ہے۔ بلاشبہ ادب کے قارئین اور باذوق حضرات آپ کے حوصلہ اور جسارت کی پذیرائی کرینگے۔ جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء کے شمارے میں کہنہ مشق، معتبر، مستند اور معروف قلم کاروں کے ساتھ ''گوشۂ ریسرچ اسکالرس'' میں بیس مضامین شامل کر کے نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس طرح ۳۷؍ مضامین کی شمولیت کے ساتھ یہ شمارہ متنوع موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو باذوق حضرات کی سیرابی میں معاون ہے۔

پروفیسر عبدالبرکات، مظفرپور

☆ محترم پروفیسر سیّد آل ظفر صاحب، مدیر سہ ماہی ''ساغرادب'' مظفرپور (بہار) السّلام علیکم

امید ہے آپ بہ فضل اللہ تعالیٰ خوش و خرم ہوں گے۔ آپ کی ادارت اور علمی بصیرتوں سے مزین خالص ادبی سہ ماہی ''ساغرادب'' کا شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء نظر نواز ہوا۔ دیکھنے کے ساتھ ہی پڑھنے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ یقین کیجیے آپ نے واقعی اپنی ذہانت و لیاقت اور علمی و ادبی ذوق و شوق کی بنیاد پر ایک ایسا رسالہ جاری کیا ہے جو رسائل کی دُنیا میں اس لحاظ سے اپنی ایک منفرد شناخت کا حامل ہے کہ آپ نے اسے روایتی موضوعات سے دور رکھا ہے مزید یہ کہ نئے قلمکاروں کی نوک پلک سنوارنے اور اردو کی اہمیت و افادیت کو مختلف طریقوں سے ذہن نشین کروانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات بھی میرے لئے حیرت کا باعث بنی کہ ۲۰۸؍ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں موضوعاتی تنوع، زبان و بیان کی نفاست اور جذباتی و احساساتی آہنگ کو شروع سے لے کر آخر تک برقرار رکھا گیا ہے۔ آپ کی علمی و ادبی کاوشوں پہ آپ کو جتنی زیادہ داد دی جائے وہ کم ہوگی۔ خدا کرے آپ کے مضبوط ہاتھوں اور ذہن رسا کے ساتھ مذکورہ رسالہ طویل عمر پائے اور آپ کے بعد اسے آپ ہی جیسا ذہین، ادب نواز و ادب شناس مدیر میسر آئے! میری یہ تمنا بھی ہے اور دُعا بھی۔ آپ کا دوست

ڈاکٹر ذاکر ملک بھلیسی، صدر عالمی تحریک اردو، (جموں و کشمیر)

☆ سِہ ماہی ''ساغرِ ادبؑ'' مظفرپور ڈاکٹر احمد معراج کے توسط سے پہلی دفعہ نظر نواز ہوا۔ جس کے لئے میں عزیز من کی کرم فرمائی کا دل سے متشکر ہوں۔ جب میں نے اس کا بالاستعاب مطالعہ کیا تب اس کی کئی خوبیوں کا بخوبی اندازہ ہو سکا جو اسے دیگر سِہ ماہی رسالوں سے منفرد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی رسائل میں یہ نمائندہ رسالہ کی حیثیت سے متعارف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صوبہ بہار سے نکلنے والے رسائل میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے۔

یہ اس طور پر بھی دیگر رسالوں سے منفرد ہے کیونکہ یہ پیئر ریویوڈ اردو جرنل ہے۔ مدیر اعزازی پروفیسر سید آلِ ظفر صاحب کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک دیتا ہوں۔ اس بات کے لئے کہ ایسے ناگفتہ بہ پرشوا شوب اور پرفتن دور میں بھی اردو کی شمع جلائے ہوئے ہیں اور سلام کرتا ہوں ان کے جذبے کو کہ حوصلہ شکن دور میں بھی اردو کا ایک اہم اور معتبر رسالہ جیب خاص سے شائع کر رہے ہیں۔ گویا وہ زبان کی بقا اس کی ترویج و اشاعت اور اس کے وجود کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہر ہر گام پر سرخروئی عطا فرمائے آمین یا رب العالمین۔ اس شمارے کے مشمولات لائق مطالعہ اور معلوماتی ہیں، یہ ادبی مضامین کا خوبصورت اور رنگ رنگ مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف النوع علمی اور تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اس مجلّہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں نئے لکھنے والوں کو خصوصیت کے ساتھ جگہ دی جاتی ہے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی اور ان کی تربیت بھی ہو سکے، جب کہ ایسی مثال دیکھنے کو بہت کم ملتی ہے۔ دراصل یہ مدیر اعزازی کے جذبہ خلوص نئی نسل سے بے پناہ الفت و محبت کا حاصل ہے۔ جس کی سچی شہادت مدیر محترم نے گوشہ ریسرچ اسکالر قائم کر کے دی ہے۔ اس شمارے میں کل ۳۷؍ خا، ہم شامل ہیں اور سبھی لائق مطالعہ ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ پروفیسر فاروق احمد صدیقی، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر درخشاں ذریں، ڈاکٹر احمد معراج، ڈاکٹر صفیہ فاطمی، حمیدہ خاتون محمد ناظم ہاشمی اور محمد مجاہد خاں کے مضامین خاص ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس ناامیدی کے دور میں بھی یہ رسالہ امید کی کرن بن کر ادب کے افق پر چمکتا رہے گا، اور اپنی انفرادیت اسی طرح قائم و دائم رکھے گا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس راہ میں آنے والی مشکلات کو حل فرمائے اور غیب سے مدد فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

مخلص

ڈاکٹر خان محمد رضوان، دہلی اُردو اکادمی

☆ کچھ روز قبل جنوری تا مارچ ۲۰۲۱ء کا سِہ ماہی رسالہ ''ساغرِ ادبؑ'' نظر نواز ہوا۔ اس کا اداریہ میں نے پڑھا مجھے پسند آیا۔ اس کے مشمولات دیکھے جتنے بھی مضامین ہیں وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ خاص طور سے مشرف عالم ذوقی کا ''تین شاعر کولاز (شہریار، عرفان صدیقی نعمان شوق)، ڈاکٹر فرحت جہاں کا ''سعادت حسن منٹو کے ڈراموں کا کینوس'' اور ڈاکٹر محمد رستم انصاری کا ''بہار میں آزادی کے بعد مطبوعہ تحقیقی مقالے'' بہت ہی معلوماتی اور۔۔۔۔ اس رسالے کی جو سب سے اچھی بات مجھے یہ لگی کہ اس میں مختلف جامعات میں تحقیق کر رہے اسکالرس کے لئے ایک الگ سے گوشہ بنایا گیا ہے جو کہ ان اسکالرس کے لئے حوصلہ افزا اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کا اچھا موقع فراہم کرے گا۔

جس طرح آپ اپنے اس رسالے کے ذریعہ سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں بہت کم لوگوں میں یہ جذبہ نظر آتا ہے۔ آپ جیسے اردو کی بے لوث خدمت کرنے والوں سے ہی آج کے اس پرفتن دور میں اردو زندہ ہے اور جو اس کی تابناک مستقبل کی طرف اشارہ بھی کر رہا ہے۔

ڈاکٹر زاہد ندیم احسن، موتیہاری